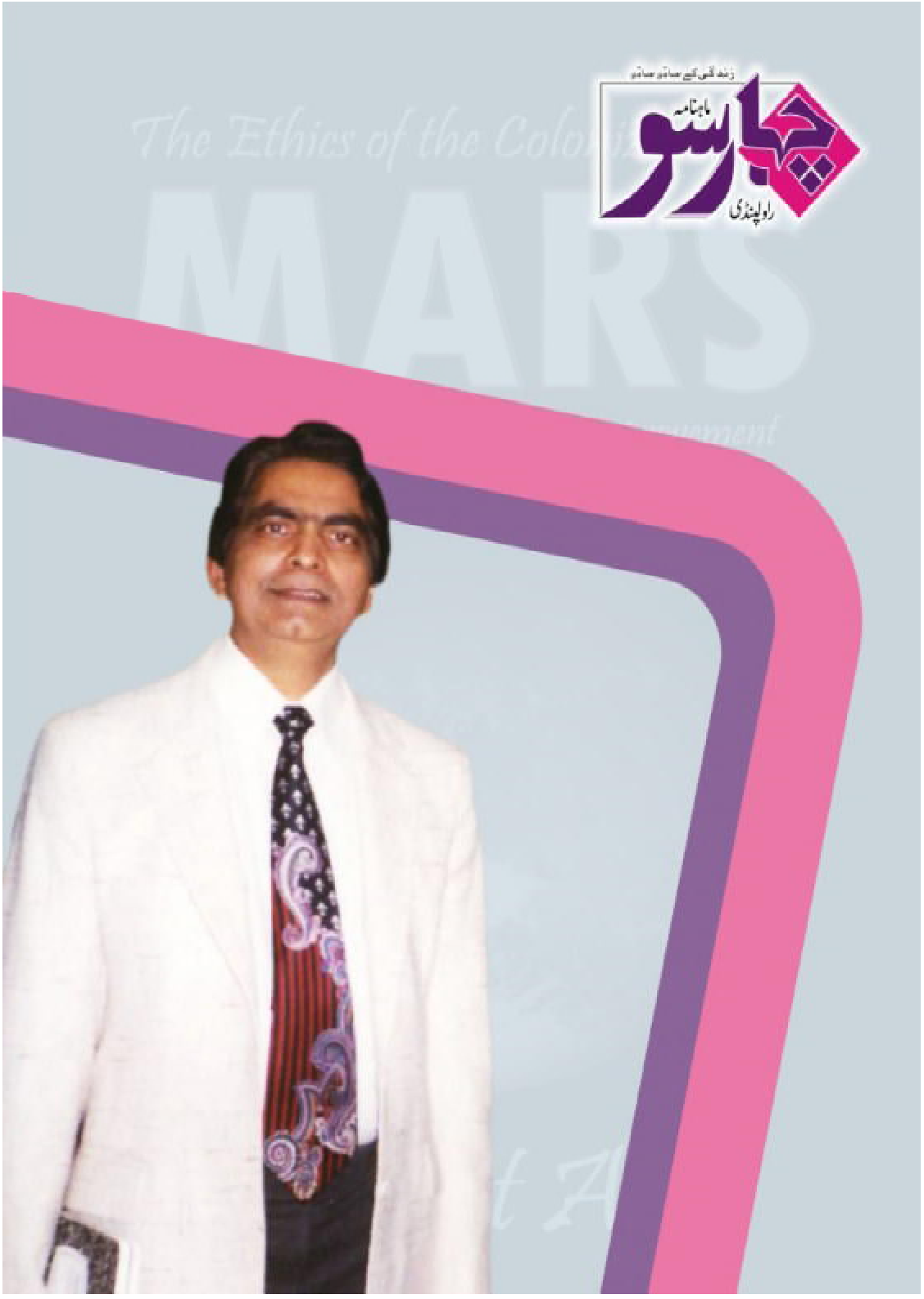

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

..... جمالِ مصطفیٰ ﷺ .....

ہمارے حسن عسکری کاظمی صاحب نے نعت گوئی میں ایک طرح یہ کمال دکھایا ہے کہ عقیدت میں مبالغہ کی بجائے سادگی سے کام لیا ہے اور آپ جانتے ہیں سادگی سے کام لیا جائے اور پھر وہ بھی نعت گوئی میں تو یہ سادگی سرتاپا محبت اور خلوص کا روپ دھار لیتی ہے۔ اور اس محبت اور خلوص کے باعث اظہارِ عقیدت میں جو ایک میدانِ عمل ہمارے سامنے آتا ہے اُس میں ہم اپنے آپ کو سرتاپا عمل محسوس کرتے ہیں۔

دن رات جو تڑپتا ہے یادِ رسولؐ میں
اس خوش نصیب شخص کو میرا اسلام ہے

یادِ رسول ﷺ میں تڑپنا ایک ایسا عمل ہے جس کو کسی دوسرے شخص میں دیکھنے سے اور اُسے اپنا سلام پہنچانے سے گویا رسول اللہ ﷺ کے لیے اس تڑپ کو اپنے آپ پر وارد کرنا ایک بہت آسان سا ردّوبدل کا منظر ہے جس سے انسان کی تقدیر چشم زدن میں جاگتی نظر آتی ہے۔

..... مشکور حسین یاد

ایک سو اسّی صفحات کی مجلد یہ کتاب مبلغ دو صد روپے کے عوض الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، سیکنڈ فلور، لیک روڈ، لاہور سے بآسانی دستیاب ہے۔

..... رشتۂ اعتبار .....

ایم جاوید اقبالؔ ماہر بینکار ہیں اور جواں فکر شاعر بھی۔ اُن کا اوّلین مجموعۂ کلام بہ عنوان ''رشتۂ اعتبار'' گو تاخیر سے شائع ہوا، تاہم اُن کے اشعار میں بروقت تازگی و شگفتگی محسوس ہوتی ہے۔ اُنھوں نے کلاسیکی شعری روایت کے تناظر میں رومانی طرزِ احساس اپنایا ہے، جو نوخیز خواہشات، سنہرے خوابوں، تلخ ماضی کی دلکش یادوں اور خوش گوار بھرپور زندگی کے پُر مایہ حاصل سے معمور ہے۔ مجموعی طور پر یہ شاعری جذباتی لطافتوں، ماحولیاتی کثافتوں، سماجی رواجوں، سیاسی بیداررویّوں اور رُوحانی اُمنگوں کی آئینہ دار ہے، شاعر کو تخلیقی تقاضوں کے شانہ بہ شانہ ملکی صورتِ حالات کی گمبھیرتا کا نہ صرف اِدراک ہے، بلکہ وہ عالمگیر معاشرت میں انسانی حقوق اور رشتۂ اعتبار کی بازیابی اور پاسداری کا خوگر ہے۔ توقّع ہے کہ ایم جاوید اقبالؔ کی آئندہ شاعری مزید فنّی پختگی اور ارتقا کے مراحل طے کرے گی۔

..... شہزاد احمدؔ

نفیس کاغذ کی مجلد یہ کتاب ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے جس کی قیمت تین سو روپے مقرر کی گئی ہے، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور سے طلب کی جا سکتی ہے۔

..... لنکا ڈھائے .....

آج کے دور میں جس طرح سفر کرنے والوں کا ہجوم ہے اسی طرح سفر نامہ نگاروں کی بھی ایک بھیڑ لگی ہے۔ لیکن قمر علی عباسی بحیثیت سفر نامہ نگار آج بھی سب سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ان کا ہمیشہ سے اپنا اسلوب ہے، ان کی طرزِ تحریر جس میں شگفتگی، بے تکلفی کی حد تک ہوتی ہے۔ وہ براہِ راست پڑھنے والوں کے دل میں اتر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے احوالِ سفر پڑھتے ہوئے مجھے اپنے دماغ پر ملکی حالات کے باوجود کوئی جبر محسوس نہیں ہوا۔ عام طور پر میں ان کا سفر نامہ ایک ہی نشست میں ختم کرتا ہوں۔ ہر سفر میں انہیں کچھ نہ کچھ حسینائیں مل جاتی ہیں۔ جن سے نہ صرف وہ اپنا دل بہلاتے ہیں بلکہ ہم جیسے پڑھنے والوں کا بھی، جو اپنے وطنِ عزیز میں ایسے حسین اتفاقات کو ترستے رہتے ہیں۔ قمر علی عباسی جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔ ہر سفر میں ایک دو حسینوں سے ہماری طرف سے بھی بے تکلف ہو جائیں۔

..... محمود شام

ایک سو چھہتر صفحات کا یہ سفر نامہ تین سو روپے کے عوض ویلکم بک پورٹ، کراچی پر دستیاب ہے۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۱،شمارہ:مارچ،اپریل ۲۰۱۲ء

’’حسنِ بصیرت‘‘

حفیظ انجم کریم نگری

(کریم نگر،بھارت)

ہر ایک شعر کی عظمت سلام کرتی ہے
خوشی سے حسنِ بصیرت سلام کرتی ہے
مطیع آپکا ہوں آپکی صحافت کا!!
مری نظر کی صداقت سلام کرتی ہے
تمہارے حسنِ نظر کا جہان ہے قائل
مری غزل کی اشاعت سلام کرتی ہے
’’چہارسوٗ‘‘ یہ رِسالا جو آپ نے بھیجا!!!
تمہیں خلوص کی جنّت سلام کرتی ہے
ہوں دوستی کا لئے نور آپکے در پر!!
مری یہ برسوں کی رغبت سلام کرتی ہے
ہوا کے ہاتھ میں دیکر پیام بھیجا ہوں
مرے قلم کی یہ نُدرت سلام کرتی ہے
گلوں کی تازگی اس میں رچی بسی انجم!!!
سکوں ہے چین ہے راحت سلام کرتی ہے

○

(چہارسو کا تازہ شمارہ دیکھ کر)

○

مجلسِ مشاورت

○○○

قارئین چہارسُو

○○○

زرِسالانہ

○○○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

○

بانی مدیرِاعلیٰ

سید ضمیر جعفری

○○○

مدیرمسؤل

گلزار جاوید

○○

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

رابطہ: 537/D-1 ،ویسٹریج-III ،راولپنڈی، پاکستان۔

فون: 5462495,5490181-51-(92+)

فیکس: 5512172-(92+)

موبائل: 5358114-333-(92+)

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی

تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید

کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز

صدق وصفا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سرور انبالوی ۵

عہدِ شباب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق ۶

امریکہ اور قرآن۔۔۔۔۔۔۔۔صفوت علی صفوت ۹

براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۱

چشمۂ علم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۱۸

ہم بھی تو کھڑے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔سید ضمیر جعفری ۲۲

دربارِ محمد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سید یحییٰ نشیط ۲۳

انگریزی اُسلوب۔۔۔۔۔۔۔۔۔مامون ایمن ۲۸

سفر یہ مختلف ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔غلام مرتضیٰ راہی ۳۰

ہے دوام بھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ف۔س۔اعجاز ۳۳

ثناخوانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عشرت ظفر ۳۵

لو سانس بھی آہستہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسمٰعیل آزاد ۳۷

میرے اردگرد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سید یحییٰ نشیط ۳۹

وجودِ انتقال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۴۱

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔۔۔۔۔۔۔۔صفوت علی صفوت ۴۷

اعلانِ حق۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عروب شاہد ۵۰

افسانے

نجات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نعیم کوثر ۵۴

دامِ آگہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سعید نقوی ۵۷

روح کا کرب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک بُدکی ۶۳

احساس کا میل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رومانہ رومی ۶۵

اعجاز زمانہ

مشکور حسین یاد، مظفر حنفی، منظر ایوبی، حسن عسکری، شباب للت، عبدالرحمٰن عبد، آصف ثاقب، تشنہ بریلوی، غالب عرفان، انوار فیروز، صدیق شاہد، یوگیندر بہل تشنہ، مسرور احمد زئی، شوکت فہمی۔ ۶۶

افسانے

حقیقت منتظر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔زہرہ جبیں ۷۳

قصّہ البم کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نثار احمد صدیقی ۷۵

آندھی میں رکھا دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رینو بہل ۷۶

ثناخوانِ تقدیس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۷۹

اہلِ سیاست

خورشید انور رضوی، عارف شفیق، کوثر صدیقی، زہیر کنجاہی، پرویز مظفر، صابر عظیم آبادی، رؤف خیر، تصور اقبال، نوید سروش، شہاب صفدر، شگفتہ نازلی، ندیم ہاشمی، مشتاق اعظمی، مظہر بخاری، وشال کھلّر۔ ۸۳

ہوا کے دوش پر

ایک عام آدمی کی داستانِ حیات۔۔۔۔فیروز عالم ۸۸

خاکہ

جگت اُستاد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انوار احمد زئی ۹۴

چشمِ حسرت

امین راحت چغتائی، عزیز پر یہار، حسن عسکری، سلیم آغا قزلباش، آصف رضا، یوگیندر بہل تشنہ، ماہر اجمیری، کاوش پرتاپ گڑھی، عاشق ہرگانوی، نیلم احمد بشیر، فیصل عظیم، عرفان صادق۔ ۹۷

آئینۂ فن

غزلِ نو کا پیکر تراش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قیصر نجفی ۱۰۴

نشانِ راہ

حالی کا خاندان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایم۔ پی چاند ۱۰۸

ورثہ

ہندکو رنگ، سُکھ دی نیند۔۔۔ یونس صابر، حنیف باوا ۱۱۱

ایک صدی کا قصہ

شوکت حسین رضوی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۲

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔۔وقار جاوید ۱۱۵

مدیر چہارسُو گلزار جاوید کا تازہ سیل نمبر نوٹ فرما لیجیے۔

0092-336-0558618

''صدق وصفا''

(یہ نظم صنعتِ توشیح میں ہے جس کے ہر شعر کے مصرعِ اول پر پہلا حرف لینے سے امریکہ میں مقیم معروف شاعر، ادیب، مفکر، صحافی، فلاسفر، سائکٹسٹ اور مبلغ صفوت علی صفوت کا نام بن جاتا ہے جو سچے محبِ وطن پاکستانی ہیں)

○

صدق و صفا و مہر و وفا اس کی ذات ہے
گنجینۂ معانی ہر اِک اس کی بات ہے
فہم و ذکا سے مُتصف حق نے کیا اِسے
اور اُس کے ساتھ بخشا ہے ذہن رسا اِسے
وقف اِس نے خود کو علم وادب کے لئے کیا
شعر و سخن کو خون سے اس کے ملی جِلا
تہذیبِ حرف وصوت بھی اس کے سخن میں ہے
انسانیت کا رُوپ بھی اِس کے چلن میں ہے
عرفانِ ذات، مہر ووفا، صلح وآشتی
اوصاف اس کی ذات کو حق نے دئے سبھی
لِکھی جو مثنوئ رسولؐ آفتاب ہے
اور مثنوئ وقت خود اپنا جواب ہے
یہ فلسفی بھی، شاعرِ رنگیں نوا ہے یہ
تبلیغ دین کے لیے کوشاں سدا ہے یہ
صبر و رضا ہے شیوہ تو کینہ سے ہے نفور
لکھی ہے خونِ دل سے کیا اس نے سوادِ حُور
فوز وفلاح قوم کی اس کا شعار ہے
اللہ کے نیک بندوں میں اس کا شمار ہے
وقف اس نے خود کر کر دیا ہے قوم کے لئے
اس نے جلائے آندھیوں میں علم کے دیئے
تیرے لئے ہی کہہ گیا حالیؔ خوش بیاں
تُجھ سے جہاں میں لاکھ سہی تو مگر کہاں

سرورانبالوی (راولپنڈی)

○
○○
○○○
○○○○
○○○○○

قرطاسِ اعزاز

○○○

صفوت علی صفوتؔ

○○○

کے نام

○○○○○
○○○○
○○○
○○
○

''عہدِ شباب''

جناب صفوت علی صفوت کے کلامِ عقیدت سے مختصر انتخاب

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

حمد

مِرے خدایا مِرے خدا نظر تو آ نظر تو آ
یہی وظیفہ یہی دعا نظر تو آ نظر تو آ
یہ میری آنکھیں ترس گئیں یہ منتظر ہیں تڑپ گئیں
حجاب ہم سے ذرا اُٹھا نظر تو آ نظر تو آ
نہ صرف ہے ہم کو ہوک سی، مرے جسد کی یہ بھوک بھی
ہے رُوح کی بھی یہی غذا نظر تو آ نظر تو آ
نہ ہم کو جنت کی آرزو نہ حور و غلماں کی جستجو
اَزل سے اپنی یہی صدا نظر تو آ نظر تو آ
زمین، سورج کو بھی فنا، نہ ایک صورت میں آسماں
دوام جس کو وہی خدا نظر تو آ نظر تو آ
نہ تجھ کو دیکھے یہ حال یہ کہ تیری اُلفت میں جان دوں
ہوا میں قربان با رہا نظر تو آ نظر تو آ
اذان میری نماز میری رکوع میرے سجود میرے
بتا ہے ترکیب اور کیا نظر تو آ نظر تو آ
جمال اپنا وہ نورِ عالی جھلک دکھا دے وہ طور والی
ہوں معجزے پھر سے کبریا نظر تو آ نظر تو آ
بہت لکھا ہے بہت پڑھا، بہت سنا ہے بہت سنا
نہ صبر ہم کو ہے اب ذرا نظر تو آ نظر تو آ
ملائکہ، جنّ و انس حاضر، ہے تو بھی موجود تو بھی ناظر
یہ بزم صفوتؔ سجا چکا نظر تو آ نظر تو آ

نعت

زمیں تجھ پہ عہدِ شباب آ رہا ہے
یہ وقتِ ولادت جناب آ رہا ہے

مہ و مہر و انجم جگہ دے رہے ہیں
''زمیں پر وہ گردوں جناب آ رہا ہے''

خود عرشِ بریں قبلہ رُو گامزن ہے
خداوند خود ہم رکاب آ رہا ہے

فقط نور ہیں وہ ، ہمہ نور ہیں وہ
جسد تو یہ بن کر نقاب آ رہا ہے

بشارت ہوئی ہے یہ اُمِّ نبیؐ کو
کہ ناموں میں اِک انتخاب آ رہا ہے

یہاں شعریت بس ہے نام محمدؐ
یہ تعریف میں بے حساب آ رہا ہے

درود اُن پہ پڑھ کر کے سو جاؤ، صفوتؔ!
اُنھیں دیکھنے ایک خواب آ رہا ہے

○

منقبت علیؓ

اُٹھا لاؤ سبھی جام و سبو فنجان و ساغر کو
علیؓ کی منقبت بھرنے لگی ہے حوضِ کوثر کو

چلی آتی ہیں نہریں شہد کی، پھولوں کی بارش میں
یہیں سنگم ہے، جوئے شیر بھی، نہلا کے منظر کو

یہی وہ شربتِ طاہر، یہی وہ مے ہے لاثانی
اِسی کی مدح میں اُڑتی ہے خوشبو چھو کے عنبر کو

چلو پی کے یہ کوثر، مڑ چلو عہدِ رسالت میں
چلو جبریل ہم کو لے چلو پھیلا کے شہپر کو

ثناء خوانی ہمیں بھی آ گئی ہے اے، مہِ کعبہ!
کہ سر ہر شخص کا پھیرا گیا آخر اِسی گھر کو

یدِ موسیٰ نہ ہو لیکن ہو ایسا تو یدِ صفوتؔ
جو محنت اور مشقت کر کے ہی اونچا کرے سر کو

○

منقبت بنتِ رسول اکرم ﷺ

بنتِ رسولِ اکرمؐ تحریر ہو گیا
تھا کُن زبانِ یزداں تقدیر ہو گیا

''ممکن نزولِ آیۂ تطہیر ہو گیا''
تھا خواب اِک نبی کا تعبیر ہو گیا

تحفہ میری طرف سے یہ مقبول ہو گیا
جنّت کا باغ اس کی جاگیر ہو گیا

رشتہ علیؓ سے لوحِ محفوظ ہو گیا
فردوس میں محل بھی تعمیر ہو گیا

ممکن ہیں اِس ملن سے یہ کردار مرکزی
شبّر بڑا ہے چھوٹا شبّیر ہو گیا

ابنِ علی ہے صفوتؔ اِک عاشقِ رسول
مولا علی کی جو بھی تصویر ہو گیا

○

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش

داؤدؑ کا گھرانہ بڑی آن بان ہے
مریمؑ ہے اُس میں لڑکی ابھی نوجوان ہے

پابندِ شرع، ایک وہ ایسی مثال ہے
اللہ کے قریب نبی کی سی شان ہے

جبریلؑ آئے ایسے میں، آ کر دِیا پیام
مریمؑ ترے شریر میں بیٹے کی جان ہے

مریمؑ نے یہ کہا کہ کنواری ابھی ہوں میں
خالق گواہ میرا، زمیں، آسمان ہے

بولے یہ جبریلؑ کہ حکمِ خدا ہے یہ
فرمان! حرفِ کُن ہے! وہ فرماروان ہے

ہے کاروانِ عاقل و پیرانِ کاملاں
تارے کی تیز روشنی واضح نشان ہے

پیدا ہوئے ہیں عیسیٰؑ بہ فرمانِ حرفِ کُن
ظاہر میں اصطبل، کوئی نیچا مکان ہے

صفوتؔ ہمیں یقین ہے، قرآن یہ کہے
عیسیٰؑ فقط رسول، خدا کا بیان ہے

○

شہدائے امریکا کی یاد میں[1]

مئے توحید پینے کے لیے اِک جام لاتے ہیں
محمدؐ ابن عبد اللہ پھر پیغام لاتے ہیں

مساجد بنتی جاتی ہیں، مساجد بھرتی جاتی ہیں
فرشتے مژدۂ قُم روز صبح وشام لاتے ہیں

محبت، شوق، دیکھیں استواری ان کے ایماں کی
بدل دیتے ہیں اپنے نام جب اسلام لاتے ہیں

شہادت مل گئی ان کو جو تھے تبلیغ میں آگے
انہی کے خون سے تحریر یہ اِرقام لاتے ہیں

فلک حیراں ہوئے جاتے ہیں شوقِ دیدِ یزداں پر
کہ یہ عرش بریں پر بھی نشستِ بام لاتے ہیں

مشن جاری ہے صفوتؔ تا ابد یہ اپنے مرسل کا
سو تازہ دَم مسلماں نکہتِ گل فام لاتے ہیں

○

[1] اسماعیل الفاروقیؒ کی شہادت پر۔ جو فلاڈلفیا (امریکا) میں تبلیغ کرتے ہوئے شہید کردیے گئے۔

امریکہ اور قرآن

صفوت علی صفوت

میں نے گلزار جاوید صاحب، ایڈیٹر ''چہارسو'' سے کئی بار کہا کہ بھائی مجھ پر چہارسو نمبر نکال کر آپ کو کتنی نفلوں کا ثواب ملے گا بلکہ اگر آجکل کے نام نہاد علماء نے میری دس کتابوں میں سے صرف ایک کتاب بھی پڑھ لی تو مجھ پر فتویٰ در فتویٰ نازل ہونا شروع ہو جائے گا۔ مگر گلزار جاوید صاحب نے یہی کہا کہ اُنکے علم کے مطابق میں نے کبھی کوئی بات شرع کے خلاف نہ لکھی۔

آج میں آپکو اپنی کتاب ''Islam is the Futer'' کے تیسرے باب کی طرف لے چلتا ہوں۔ میں نے بچپن میں اپنے بزرگوں سے سُنا تھا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے اور اُسمیں ہمارے زندگی کے تمام مسائل کا تذکرہ موجود ہے۔ تاہم مجھے اس بات پر پورا بھروسہ نہ ہوتا تھا۔ اور میں خود سے سوالات کرتا رہتا تھا۔ مگر جرأت نہ ہوتی تھی کہ کوئی ایسا سوال نہ کر بیٹھوں کہ بزرگ اُسکو غلط انداز میں سمجھ لیں۔ اس بات کا ڈر نہ تھا کہ میری پٹائی ہوگی۔ مگر تربیت ایسی تھی کہ ہر چیز کو تجربے کی بنیاد پر سمجھنے اور یقین کرنے کا رواج ہو چلا تھا۔ لہذا جب امریکی صدر کینڈی نے چاند پر جانے کا اعلان کیا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ میرے پاکستان میں رہتے ہوئے بھی ایک ہیرو کا درجہ رکھنے لگے ہیں۔ قرآن میں نازل کردہ سورۃ القمر پڑھی۔ مگر ایسا لگا کہ علماء اُس کو سمجھ نہ پائے ہیں۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ نوجوانی ہی میں (تقریباً 41 برس پہلے) امریکہ آنے کا موقع ملا۔ فزکس میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ مگر مذہب اسلام سے تعلق اور بھی گہرا ہوتا چلا گیا۔ اور اس بات کا احساس ہوا کہ علماء کی بھاری اکثریت ماضی کی گردشوں میں پھنسی ہے۔ اُن کے لیے مستقبل کے متعلق سوچنا یوں مشکل ہے کہ اُنکی تعلیم اور تربیت میں فکرِ فردا کا فقدان ہے۔

اُس زمانے میں امریکہ میں اسلام کی تبلیغ اپنے عروج پر تھی۔ اور غیر مسلم جوق در جوق اسلام قبول کر رہے تھے۔ (یاد رہے کہ اس کا تبلیغی جماعت سے کوئی تعلق نہ تھا) میں فزکس کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلام کی بنیاد کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی کبھار جناب اسماعیل الفاروقی شہید کی صحبت میں وہ روحانیت نظر آئی کہ اُسکا غیر مسلم اسلام کی دولت سے مالا مال ہو چکے تھے۔ بعد میں اُنہیں تبلیغ کرتے ہوئے شہید کر دیا گیا۔ اُنکی شاگردی میں دو چار نے میرے گنہگار ہاتھوں پر کلمہ پڑھا۔

مِشن جاری ہے صفوت تا ابد یہ اپنے مرسلؐ کا

سو تازہ دم مسلماں نکہتِ گلفام لاتے ہیں

تعلیم مکمل ہونے کے بعد مجھے ایک بہت ہی معروف امریکی کمپنی میں ملازمت کا موقع ملا اور یوں مجھے Space Shuttle کے پروجیکٹ میں ایک معمولی کام کرنے کو دیا گیا۔ اور میں یہ سوچتا رہا کہ ایک ایسی طاقت کہ جہاں اسلام کا بول بالا ہونے والا ہے۔ کیا اس کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے؟ اسی دوران کچھ تعلق عظیم سائنس دانوں سے ہوا۔ کبھی صحبت کی وجہ سے میرا یہ تاثر بڑھتا چلا گیا کہ قرآن نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس خطے کا تذکرہ ضرور کیا ہوگا۔ لیکن کسی نے کوئی ایسی آیت نہ بتائی کہ جس کو لیکر میں آگے بڑھتا۔

کئی سال گذر گئے اور میں NASA سے دور ہوتا چلا گیا۔ اسی دوران میرا کام Computerization of Finger Print سے متعلق ہوا۔ ایک دن سورۃ قیامت پڑھتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہوا کہ قرآن میں اسکا تذکرہ موجود ہے۔ یعنی کفارِ مکّہ کے اس سوال و جواب کا تذکرہ کہ جہاں وہ رسولؐ کے لیے یہ کہتے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مرنے کے بعد ہماری ہڈیوں کو یکجا کر سکے گا۔ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ یاد رہے کہ کفار یہاں ایک بہت ہی گہرا سوال کر رہے ہیں۔ بلکہ ایک ہی سوال میں دو باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہزاروں سال گزرنے کے بعد ہمارا ایٹم ایٹم مٹی میں مل چکا ہوگا تو کیا ہماری ہڈیوں کو جوڑ دیا جائے گا جبکہ بعض ایٹم تو ہو سکتا ہے خدا جانے کہاں ہوں۔ مگر اہم سوال تھا کہ اگر ایسا ہو بھی جائے تو کیسے معلوم ہوگا کہ زید کی ہڈی زید ہی کی ہڈی ہوگی اور یہ کہ میرا حساب کتاب کسی اور سے نہ ہوگا۔ تو جواب بہت ہی گہرا تھا۔ ''بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ'' یعنی ہم تمہاری انگلیوں کو بھی بالکل اُسی طرح (یعنی Fingerprints کے ساتھ) بنا دیں گے۔

یہ مسئلہ حل ہوا تو ہماری ریسرچ کچھ اور آگے بڑھی۔ ایک بار میں سورۃ رحمٰن پڑھ رہا تھا تو احساس ہوا کہ جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی۔ ایک آیت میں قرآن میں لکھا ہے ''سنفرغ لکم ایُّه َالثقلٰن'' یعنی جنّ وانس سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ عنقریب تمہیں ایک بوجھ سے خارج کر دے گا۔ یاد رہے کہ لفظ ثقلٰن کا استعمال بہت بامعنی ہے۔ ثقل کے معنی Gravity یا Gravitatunil Pull کے ہیں اور یہی اس کا روٹ ہے۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم ایسے اسباب پیدا کر دیں گے کہ تمہارے لئے کشش ثقل بوجھ نہ بن سکے گی۔ چنانچہ ہوائی جہاز کی پرواز اس جانب ایک قدم تھا۔ اب آیت 33 میں فرمایا ''یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ'' یعنی اے معاشرۂ جنّ وانس اگر تم طاقت رکھتے ہو تو زمین اور آسمان کے اقطار میں پھیل جاؤ۔ اور تم ایسا نہ کر پاؤ گے سوائے طاقت کے (ہماری مرضی سے) یہ الگ بات ہے کہ انسانوں نے بر اعظم امریکہ دریافت کیا۔ مگر جونہی یہ نعمت میسر ہوئی قتل و غارت کا آغاز ہوا۔ اور مجھے یقین ہے کہ سب سے پہلے اسی ملک کے لوگ مریخ پر آباد ہونگے۔

یہاں سے اور آگے جائیں گے اک روز ہم اُڑ کر

مہہ و مریخ کی سنگلاخ سُونی وادیوں میں بھی

لہٰذا میری نظر میں قرآن نے اس بات کی نشاندہی کی ہے اور میرے نزدیک اس بات کی پیشن گوئی نزولِ قرآن کے وقت ہی کی گئی۔ جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہے۔

امریکہ کے بانیوں میں صدر جیفرسن (President Jefferson) کا نام میرے نزدیک بہت اہم ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ قرآن کی ایک کاپی اُن کے پاس موجود تھی۔ وہ اکثر قرآن کا مطالعہ کرتے تھے۔ بلکہ میرے نزدیک وہ امریکہ کے پہلے ''مسلمان'' صدر تھے۔ اور میں نے اپنی ایک اور کتاب میں یہ بات کھل کر تفصیل سے لکھ دی ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحومؒ کی کتاب ''The Prophet establishing a State...'' میں رسولؐ کے زمانے کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک صحابی (میں یہاں یہ بات مختصراً بیان کرتا ہوں) جب ''ٹیکس'' لیکر واپس آئے تو کہنے لگے کہ اے رسول اللہ یہاں کچھ تحائف مجھے ذاتی طور سے دیئے گئے ہیں۔ جبکہ ٹیکس کا حصّہ ریاست کی نذر ہے۔ رسولؐ نے فوراً مجھ پر تقریر فرمائی کہ ذاتی تحائف بھی دراصل ریاست کے لئے ہیں۔ کیونکہ اگر تم ریاست کی جانب سے نہ گئے ہوتے تو تمہیں یہ تحائف نہ ملتے۔

امریکہ سے اس کا تعلق اگرچہ معمولی ہے مگر جب امریکی صدر یا صدر کی بیوی باہر جاتے ہیں یا مُلک کے اندر اُنہیں کوئی تحفہ ملتا ہے تو وہ امریکی ریاست کو ملتا ہے نہ کوئی ذاتی تحفہ تصور کیا جاتا ہے۔

یہ تحائف Presidentil Records Act کے تحت حکومت کا حصہ بن جاتے ہیں اور Standard Form 278 کو بھر کر یہ تحائف رجسٹر کئے جاتے ہیں اور امریکی عوام کی ملکیت بن جاتے ہیں۔ اصل روحِ قرآن کا نفاذ اس ملک (یعنی امریکہ میں) ہے۔ یہاں خامیاں بھی ہیں مگر یہ خامیاں امریکہ کی بنیاد ڈالتے ہوئے نہ تھیں۔

اسلامی ممالک کو امریکہ کے متعلق یہ سوچنا ہے کہ وہ کیا بات ہے کہ اس ملک کو خدا نے کم از کم ہمارے زمانے میں انسانی لیڈرشپ عطا کی ہے۔ میں اپنا یہ مضمون خاص طور پر ''چہارسو'' کے ایڈیٹر گلزار جاوید کی فرمائش پر لکھ رہا ہوں۔ قارئین سے التجا ہے کہ وہ خود اپنے اندر ریسرچ کی عادت ڈالیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ علم کی بنیاد جو ہمیں ملی ہے۔ ہزاروں سال کی ریسرچ اور قربانیوں کے بعد۔ اس بنیادِ علم کو وسیع سے وسیع بناتے چلے جائیں۔

ہم اُترنے کو ہیں ارضِ مریخ پر اور اس پر بسانے کو گھر بار ہیں
پھر خلافت کو صحرا ہیں پھیلے ہوئے پھر سجودِ ملائک پُر اسرار ہیں

لا مکاں، لاریب، لاکلام، لاشعور اور لاسخن

کا انتخاب مع ترمیم واضافہ

کُلّیاتِ راہیؔ

صفحات: 480 قیمت: -/400 روپے

نوٹ: کُلّیات میں شامل ''لاسخن'' غلام مرتضٰی راہی کا تازہ مجموعۂ غزل ہے

''......ایک تربیت یافتہ شعور، مشاہدات وتجربات کی سنگینی وسنجیدگی کو محسوس کرسکتا ہے لیکن اگر ترسیل وابلاغ کے فن سے ناآشنا ہے تو تجربہ اور احساس کی شدّت اس کی ذات میں گھٹ کر اور سمٹ کر رہ جاتی ہے، لیکن جب یہ احساس ایک باکمال شاعر کی فنکارانہ ہُنر مندی سے الفاظ میں ڈھلتا ہے تو غلام مرتضٰی راہی کی شاعری بن جاتا ہے۔''

۔ سید امین اشرف

رابطہ

راہی منزل، پنی، فتح پور (یو۔پی) 212601

ٹیلی فون: 05180-222323 --- موبائل: 9236590822

براہِ راست

زیرِ نظر اشاعت ہر بار کی طرح اس بار بھی ایک صاحبِ قلم کی شخصیت وفن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ بظاہر یہ ایک شخصی اور فنی عکس نظر آتا ہے بادی النظر میں دیکھا جائے تو اس اشاعت کا منشاو مقصود بنی نوع انسان بالخصوص مسلمان قوم کو صراطِ مستقیم کی جانب راغب ورجوع کرنا ہے۔ صراطِ مستقیم کا مطلب ومقصد بے جا اور اندھی تقلید ہرگز نہیں بلکہ احکاماتِ الٰہی کی روشنی میں تدبر وتفکر اور اجتہاد کو بروئے کار لاتے ہوئے جدید علوم کی روشنی میں نئے جہانوں اور نئے مکانوں کو دریافت اور اُن کے مناسب ومدارج کا تعین ہے۔ جناب صفوت علی صفوت کی اعلیٰ تعلیم، روشن فکر اور عمیق مطالعہ صاحبانِ علم ونظر کو جس دعوتِ فکر کی جانب مائل کررہے ہیں اُس کی کامیابی وناکامی کا فیصلہ آنے والا وقت ہی درست طور پر کر پائے گا۔ البتہ! ہماری کاوش اور جستجو کی بابت آپ کا اختیار ہمیشہ کی مانند اس بار بھی مسلّم ہے جسے خوش آمدید کہنے کے لیے ادارہ اور اُس کے اراکین دیدہ ودل فرشِ راہ کیے ہوئے ہیں۔

گلزار جاوید

☆ آپ کے مزاج میں موجود خاص طرح کا لکھنوی رنگ آپ کو لاہوری کہنے یا ماننے سے اکثر باز رکھتا ہے۔ گفتگو کی ابتداء کیوں نہ ماضی بعید سے کی جائے؟

☆☆ میری شاعری، میرا فلسفہ، میری نثر اِن سب کا تعلق مستقبل سے ہے۔ تاہم اگر مجھ میں لکھنوی رنگ امریکہ میں چالیس سالہ مشقت کے بعد بھی باقی ہے تو مجھے اُس پر فخر ہے۔ اگرچہ میرے آباء کا تعلق خاص لکھنؤ سے نہ تھا، میری دادی مرحومہ (مدفن لاہور) کے مطابق میرا شجرہ اب بھی خیرآباد ضلع سیتاپور میں چھوٹے مخدوم صاحب کے روضہ سے متصل مدرسہ میں موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

صفوت علی ولد عظمت علی ولد عترت علی ولد جعفر علی ولد مبارک علی، غرضیکہ کہاں تک کی پشتوں کی باتیں کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سب کے اعمال ان کے ساتھ ہی چلے گئے اور میرے اعمال کا بھی یہی حال ہونے والا ہے۔

پھیر دینا مرا منہ کعبے کو امریکہ سے
بولے صفوت جو کہا آخری خواہش کیا ہے

میری پرورش میری پھوپھی نے لاہور میں کی۔ مجھے اپنے والدین خاص طور پر والد مرحوم بالکل یاد نہیں اور والدہ کی بھی دُھندلی سی شبیہہ یاد رہ گئی ہے۔ اگر خالق سے کوئی سوال ہے تو یہی کہ

والد کو پہلے چھین لیا شیر خوار سے
بس والدہ کا ساتھ تھا ہر اعتبار سے
صفوت تھے سات سال کے، پھر وہ بھی چل بسیں
کیوں؟ پوچھتے ہیں روز یہ پروردگار سے

شائد اسی لئے نہ تو مجھے ماضی بعید سے کوئی دلچسپی ہے نہ ہی ماضی استمراری سے۔ آج کا دن میری بقایا زندگی کا پہلا دن ہے۔

☆ اب ذرا لاہور کے گلی کوچوں میں گزرے روز وشب اور تعلیمی اداروں میں بیتے دنوں کو جیتے جاگتے کرداروں کے ہمراہ روبرو ہونا چاہیے؟

☆☆ لاہور اب ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کے گھر کے سامنے سے روز نکل کر، ریلوے ہیڈ کوارٹر سے گذرتے ہوئے پیدل گھر سے مسلم ہائی سکول جانا اور آنا اور پڑھائی پر توجہ دینا۔ گڑھی شاہو ریلوے کالونی یہ تو بچپن کی یادیں ہیں۔ وہ بزرگ جن کو روز بازار میں دیکھتا، جن کو مسجد میں دیکھتا، جن کے دستِ شفقت کی کوئی اُنگلی اس یتیم ویشیر پر کبھی نہ اُٹھی وہ بھی سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

ہائی سکول فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تو اُمید ہو چلی کہ کسی اچھے کالج میں میرٹ پر داخلہ مل جائے گا۔ لہٰذا بھاگ دوڑ کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں ۱۹۶۳ء میں ایف ایس سی میں داخلہ ملا۔ اُس وقت کالج کے پرنسپل محترم ڈاکٹر نذیر احمد تھے۔ اور امیر محمد خان مغربی پاکستان کے گورنر تھے۔ بڑے رعب ودبدے کے ساتھ حکومت کرتے تھے۔ بی۔ایس۔سی آنرز فزکس میں ۱۹۶۸ء میں گریجویٹ کیا گویا اس پانچ سال میں ایک عظیم کالج سے پکے راوین (Ravian) بن جانے کا خواب مکمل ہوا۔ اس کالج کی روایات کے مطابق مجھے بھی ان ایامِ نوجوانی میں کئی بار بہک جانے کے مواقع فراہم ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بدصورت لڑکی بھی مانندِ حور نظر آتی تھی اور کبھی یہ بھی خیال آتا تھا کہ حوریں اور ہم:

جب نگاہوں میں مری اُن کا شباب آتا ہے
ہر گنہ مجھ کو نظر کارِ ثواب آتا ہے۔

''خوش قسمتی'' دیکھئے کہ ''لغو وتاثیم'' سے دور رہا۔ جہاں تک فزکس کا تعلق ہے ہمارے ڈاکٹر طاہر صاحب کا رعب ودبدبہ یاد ہے۔ (وان ڈے گراف) لیبارٹری میں جانا ہوتا تو اُس کی برقی روانی، چکا چوند اور وسعت ہمیں روحانی سکون عطا کرتی۔ ہمارا عشق کرنے کو دل چاہتا مگر مشکلاتِ مضمون کہتے کہ:

تجسیم حُسن وعشق مناجات ہی نہیں
یہ بھی نہیں کہ اور کوئی بات ہی نہیں

ویسے بھی اس ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا رکھتے جس سے ہمارے عشق کے جذبات پر سرد پانی پڑتا رہتا۔ یہاں تک کہ فارغ التحصیل ہوا اور اسلام آباد یونیورسٹی میں اچھے وظیفے کے ساتھ ایم۔ایس۔سی میں داخلہ مِلا اور یوں ہم نے بادلِ نخواستہ لاہور چھوڑا۔

☆ مرحلہ آتا ہے اب اٹلی روانگی، قیام، ہجرت کی بابت معلومات اور تاثرات کا؟

☆☆ اسلام آباد یونیورسٹی نئی نئی راولپنڈی سیٹلائٹ ٹاؤن میں قائم ہوئی اور فزکس ڈیپارٹمنٹ دُنیا بھر میں مشہور تھا۔ دو سال سے کچھ اوپر کا قیام اگرچہ مختصر مگر میرے لیے بہت اہم تھا۔ پہلی بار احساس ہوا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہوں۔ علم طبیعات سے بھی شُد بُد ہونے لگی تھی۔ تاہم دل کے کسی گوشے میں ایک خلا موجود تھا اور بار بار خیال آتا تھا کہ زندگی میں مذہب، شاعری اور سائنس کو جدا نہیں کیا جا سکتا:

گو طریقِ کار ہے مختلف پہ یہاں بھی سیلِ ورود ہے
مرے تجربوں میں ثبوت ہے ترے معجزوں میں نمود ہے

اسلام آباد یونیورسٹی سے ایم فل کرنے کے بعد یہ خواہش ہوئی کہ Ph.D. کسی غیر ملک سے کی جائے۔ لہٰذا پروفیسران اور دوسروں کی امداد و مشورہ سے اٹلی جانا ہوا۔ یہاں پروفیسر عبدالسلام نوبل لاریٹ سے کئی بار ملنے کا شرف حاصل ہوا اور انٹرنیشنل سینٹر میں ریسرچ کرنے کا موقع ملا، نزدیک ہی ایک مکان میں رہائش تھی اور مالکہ ایک نیک اور اچھی بُڑھیا تھی جو کبھی کبھار ہمیں لاطینی زبان کے الفاظ و معانی اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی یا پھر اشاروں میں سمجھایا کرتی۔ اور یوں مجھے مغرب کی زبانوں کی ماں کو سمجھنے کا شوق پیدا ہوا۔ بعد میں جرمن زبان بھی سیکھنے کا موقع ملا۔ میری فزکس کی تعلیم ابھی غیر مکمل تھی۔ لہٰذا ابھی تک باقاعدگی سے اُردو یا انگریزی زبانوں میں لکھنا پڑھنا تقریباً ناممکن تھا بلکہ یہ لگتا تھا کہ یہ سب وقت کو ضائع کرنے والی بات ہے۔ بعض اوقات فزکس میں بھی دل نہ لگتا۔

☆ امریکہ آمد، جدوجہد اور مستقل قیام کی تفصیل سے آگاہی کے بعد گفتگو روانی سے آگے بڑھ سکتی ہے؟

☆☆ اٹلی سے آگے سفر امریکہ کا تھا۔ روم سے فلاڈلفیا کا سفر خوشگوار تھا۔ لوگ اپنی امریکہ پہنچنے اور جدوجہد کی باتیں کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے پڑھائی کے علاوہ اور کوئی جدوجہد نہ تھی۔ تاہم لائقِ ذکر بات یہ ہے کہ میرا قیام فلاڈلفیا (امریکہ) کے ایسے علاقے میں تھا جہاں زیادہ تر نیگرو نسل کے لوگ رہتے تھے۔ گھر کے نزدیک ایک چوک پر ''دو نوجوان'' صبح کے وقت ایک اخبار بیچا کرتے تھے آوازیں لگا کر۔ اس اخبار کا نام تھا '' Mohammad Speaks''، یہ قصہ ۱۹۷۱ء اگست کا ہے۔ مجھے تجسس رہتا کہ یہ کون لوگ ہیں کہ جو محمدؐ کے نام سے اخبار نکالتے ہیں۔ ایک دن ہمت کر کے اُنکے پاس گیا اور اُن سے پوچھا کہ کیا تم لوگ مسلمان ہو۔ تو اُنہوں نے غور سے میرا حلیہ دیکھا اور جواب دیا کہ ہاں ہم مسلمان ہیں۔ اُنکی انگریزی کا لہجہ سمجھنا ذرا مشکل تھا۔ ویسے بھی امریکہ کا تلفظ عجیب سا لگتا تھا۔ پھر ہمت کر کے پوچھا کہ قرآن پڑھ لیتے ہو تو ایک نے کہا کہ **الم. ذالک الکتاب لا ریب فیه.** میری حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ پوچھا کہ آگے تو بولے کہ آگے ابھی نہیں سکھایا۔

اس قیام کا تفصیلی مضمون میری کتاب ''فکرِ فردا'' میں موجود ہے۔ یہاں یہ ضرور کہوں گا کہ اس سے پہلے امریکہ میں تبلیغ اسلام کا خیال نہ آیا تھا اور میرے لئے یہ دونوں اخبار فروش لڑکے جواب خدا جانے کہاں ہیں، فرشتوں کے نزول کا درجہ رکھتے ہیں۔

☆ ایک روایتی مسلم گھرانے کا چشم و چراغ روایتی تعلیم کے بعد جدید علوم بالخصوص انگریزی ادب، طبیعات، فلکیات، حساب، الجبراء، کیمیا اور کمپیوٹر کا شیدائی کیونکر بن جاتا ہے؟

☆☆ یہ انتہائی ذہانت بھرا سوال ہے۔ شائد کہ ہر طرح کا علم حاصل کرنا ہمارا فرض ہے یعنی وہ ''علم'' جو کہ بُرا تصور کیا جاتا ہے۔ وہ علم جسے سیکھ کر بہک جانے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ وہ علم بھی حاصل کرنا مگر بُرے کام سے دور رہنا، یہی سب سے بڑا جہاد ہے۔ خود قرآن نے نبیؐ کو حکم دیا ہے کہ ''ربِّ زدنی علمًا'' یعنی علم کے اندر علم کو جمع کرتے رہو:

مشن جاری ہے صفوتؔ تا ابد یہ اپنے مُرسلؐ کا

وہ لوگ جو کسی روایتی تعلیمی یا خالص مذہبی تعلیم کا تصور لئے بیٹھے ہیں میری نظر میں قرآن و سنت کے احکام کی گہرائی کو نہیں سمجھے۔ ہماری بقا صرف علوم سائنس میں نہیں، صرف علمِ حدیث میں نہیں، صرف آرٹ میں نہیں۔ اگر ہم ان سب کو ساتھ لیکر نہ چلے تو اللہ کسی اور قوم کو وہ لیڈرشپ دے گا جس کی وہ حقدار ہے۔ اسی لئے ''فکرِ فردا'' کا پہلا مضمون ''خط فقہی'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ اور یہ سوال اٹھایا کہ اگر ہم مریخ پر اُترتے ہیں اور بہت جلد ایسا ہونے والا ہے تو نماز کا رخ کیا ہوگا۔ ضروری نہیں کہ وہاں سے زمین یا چاند نظر آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ علماء جو سائنس میں شُد بُد نہیں رکھتے اور اُسے حاصل علم قرار نہیں دیتے وہ جان بوجھ کر لیڈرشپ کسی اور کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ میں یہ نظریہ تبدیل کرنا چاہتا ہوں اور امریکہ میں جوان ہونے والی مسلم کمیونٹی تک پہنچا رہا ہوں۔

☆ شمالی امریکہ کے ادبی منظر پر آپ کی اچانک آمد اور مقبولیت بھی سوالیہ نشان ہے؟

☆☆ نیویارک کے ادبی منظر پر میری آمد ۱۹۹۲ء سے ہے اور اِسکا سہرا مرحومین سلطان محمود خان اور مشہور شاعر ڈاکٹر مظفر شکوہ کے سر ہے۔ اس کے علاوہ مامون ایمن صاحب کا دباؤ بھی کافی حد تک شامل ہے۔ اس سے پہلے باقاعدگی

سے نہ لکھتا تھا اب یہ سلسلہ اُستوار ہے۔ انگریزی اور اُردو زبانوں میں باقاعدگی سے کچھ نہ کچھ روزانہ رقم کرتا رہتا ہوں۔ یہ کام دس مختلف کتابوں میں چھپ چُکا ہے۔ یہاں پر سید ضمیر جعفری (مرحوم) کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ اُنکی مستقل جہت اور حکمت سے ایک جوش ولولہ پیدا ہوا۔ اسی دوران ''چہارسو'' سے بھی روشناس ہونے کا موقع ملا۔ اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اسی جریدے میں مثنویٔ وقت کی اکثر قسطیں' کتابی شکل میں آنے سے قبل شائع ہوئیں۔ جعفری صاحب نے ہی محترم آصف محمود سے ملوایا اور یوں اُنہوں نے ''فکرِ فردا''، ''مثنویٔ وقت'' اور بعد میں ''مثنویٔ رسولؐ'' اپنے پریس میں چھپوائیں۔

☆ واشنگٹن پریس کلب، امریکن پوئٹری سوسائٹی کی ممبر شپ اور ''اردو ٹائمز'' میں کالم نگاری کے تجربات سے کیا کچھ حاصل ہوا؟

☆☆ انگریزی ادب میں اب میرا کام جانا پہچانا ہے۔ مگر شروع میں واشنگٹن نیشنل پریس کلب کی ممبر شپ (جو بڑی مشکل سے ملتی ہے) سے بہت فائدہ ہوا۔ میں یہاں مالی فائدے کی بات نہیں کر رہا۔ خیالات میں وُسعت کا تذکرہ ہے۔ سوچتا ہوں کہ دوبارہ ممبر بنوں اور انگریزی کی کتاب جو کہ مریخ (MARS) سے متعلق ہے کا افتتاح وہیں سے کیا جائے۔

☆ آپ کی شعلہ نوائی کے چرچے مثبت، منفی دونوں طریق پر اکثر سننے میں آیا کرتے ہیں۔ اس کھرتل مزاجی کا کوئی سبب تو ضرور ہوگا؟

☆☆ میری شعلہ نوائی کا تذکرہ آئے گا؟

مرنے کے بعد کچھ تو تری شاعری چلے
تیرے سُخن کے ساتھ رمِ زندگی چلے

یہاں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں ڈاکٹر یحییٰ نشیط صاحب اس ناچیز سے متعلق کچھ تحریریں جمع کر رہے ہیں۔ نقد و نظر سے خیالات میں پختگی آتی ہے۔ کتابیں اور رسالوں کے متعلق یہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

میری ہی غزل مجھ کو یہ سمجھانے لگے ہیں
ناقد کی سیاہی کو بھی چمکانے لگے ہیں

☆ آپ نے شاعری میں ایامِ شباب اور حسن و عشق کے جو اشارے کیے ہیں اُس کا سرا کس محلے یا گلی میں تلاش کیا جاسکتا ہے نیز آپ کو حال کا شاعر کہنے والے بزبانِ دیگر کہنا کیا چاہتے ہیں؟

☆☆ اس سوال کا جواب ایک قطعہ میں موجود ہے:

دیکھو تو ذرا غور سے نقشہ یہ زمیں کا
رستہ نظر آئے گا تمہیں عرشِ بریں کا
وہ خود بھی اُتر آئے مرے عشق میں لیکن
سینہ خس و خاشاک نہ ہو جائے زمیں کا

آپ مجھے حال کا شاعر دس فی صد کہہ سکتے ہیں۔ ۹۰٪ (نوے فیصد) شاعرِ مستقبل ہوں۔

☆ بھیڑ میں تنہائی محسوس کرنا کسی طرح کے ناسٹلجیا یا نفسیاتی مسئلے سے متعلق تو نہیں؟

☆☆

رقص کرتے ہیں سر پھرے نیوران دل جلے واردات کہتے ہیں

☆ نرم بستروں پر ہم بستری کے خواہاں تھے
کیا جہاد کر پاتے وقف وصلِ جاناں تھے

شعر مذکور میں کس طرح کے جہاد کی جانب اشارہ ہے اور نشانے کی زد پر کون ہے؟

☆☆ اگر آپ عظیم لیڈروں کے کیریکٹر کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ''دشمن'' کو للکارنے سے پیشتر تیاری کرنا ضروری ہے وگرنہ اپنی ہلاکت کو دعوت دینے والی بات ہے۔ شطرنج کے کھیل میں بھی پیادہ کو پہلے قربان کیا جاتا ہے مگر بادشاہ کی حفاظت آخر وقت تک کی جاتی ہے۔ یہ بھی روایات میں ہے کہ عظیم بادشاہوں نے نرم و گداز بستروں کی بجائے چٹائی پر سونا پسند کیا ہے حتیٰ کہ دشمن کو شکست ہوئی۔ وہ ممالک جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے اُن کے لیڈروں میں کوئی بھی ایسا نہیں اکثر کرپٹ ہیں۔ لہٰذا چند نہتے لوگوں کا امریکہ کے خلاف ''جہاد'' کو نکل کھڑے ہونا بے وقوفی کی بات ہے۔ اس کے لئے سالوں کی پلاننگ چاہیے۔ وہ بھی اُس صورت میں کہ یک جہتی اور ایمان ہوں، اتحاد اور منظم ہوں۔ اور اگر آپ اسلامی جہاد کی بات کرتے ہیں تو پہلے امریکہ کو امن کے مذاکرات کی دعوت بھی دینا ضروری ہے۔ اس کے بعد اگر جنگ کریں بھی تو کچھ مقابلہ بھی ہو وگرنہ خودکشی میں اپنا ہی نقصان ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ میں آباد مسلمانوں کی زندگی پر منفی اثرات مرتب ہونا اور بعض کا ہجرت کرنا یہ سب بے معنی ہیں۔ اسلام کی طاقت امن کی دعوت میں ہے نہ کہ دو بلڈنگوں کو گرانے میں۔ یہ کوئی مسجد ضرار کی بات نہیں ہو رہی۔

☆ ہمارے گرد چوپایوں کی حکومت سے مراد کیا ہے اور اشارہ کس جانب ہے؟

☆☆ چوپایوں کی حکومت کا تذکرہ ہر دور میں ہوتا چلا آیا ہے۔ ہمارا دور بھی جاہلیت کا شکار ہے۔ اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ ایسے میں

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر و انسانم آرزو است

والا مسئلہ ہے۔ میرے ہاں بھی اُمید کا چراغ جلتا ہے۔ شائد کہ امریکہ کی اکثریت اسلام قبول کر لے یا کم از کم اس جانب متوجہ ہو۔ (فکر فردا کا دیباچہ ملاحظہ کیجیے)

☆ آپ نے شعر کہنے کی ابتداء غزل، نظم کے بجائے ''مثنویٔ وقت'' جیسی ادق صنف سے کی اور اُس پہ طرّہ یہ کہ قدما کی مستعمل بحروں سے جدا

بحروں کا انتخاب بھی کیا؟

☆☆

آواز آئی طرزِ سخن اور چاہیئے
اس بحر کو سفینۂ فن اور چاہیئے

☆ ''مثنوئ وقت'' میں شعری معاملہ بندی کے باوجود ذاتی داستان نظر کیوں نہیں آتی؟

☆☆ مثنوئ وقت میں کردار ''وقت'' ہے۔ لہٰذا کسی کی داستان نہیں۔ خود وقت کی بات ہے۔ وقت کیسے پیدا ہوا اور اسے کیسے موت آئے گی (یا کم از کم پیمائش کی ضرورت ختم ہو جائے گی)

☆ آپ ''مثنوی'' کے فنی احترام کے باوجود ابلاغ کے حوالے سے ہر طرح کی پابندی سے آزاد رہنے کے خواہش مند کیوں نظر آتے ہیں نیز کبھی آپ سادہ زبانی کے ترجمان نظر آتے ہیں، کبھی طرح دار کبھی پیچیدہ تر الفاظ اور تراکیب برتنے لگتے ہیں۔ آپ کا مزاج اور میلان اصل میں کس طرز کا ہے؟

☆☆ آپ کے سوالات کا جواب ''سائنسی تصوف'' اور وسعتِ خیال سے ہے لامحدود وقت کو بیان کرنے کے لئے تصوراتِ اُلوہیت کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ اللہ کی ذات کا بیان آسان نہیں اور ہر طرح کی سادگی اور پیچیدگی اسی لامحدودیت کو بیان کرنے میں لگی ہوئی ہے۔

☆ اب باری آتی ہے آپ کی تخلیق ''مثنوئ رسول'' کی۔ محدود تجربہ اور کم عمری کے باوجود آپ نے اس قدر حسّاس موضوع اور انوار شخصیت کا انتخاب کیونکر کیا۔ آپ کی اس کاوش کو اہلِ علم بالخصوص مذہبی حلقوں میں کس کس زوایے سے جانچا اور پرکھا گیا؟

☆☆ ''مثنوئ رسولؐ'' بہت سوچ سمجھ کر لکھی گئی ہے۔ مذہبی حلقوں نے یا تو اسے پڑھا نہیں یا اگر پڑھا تو اعتراض نہیں کیا۔ بقول غلام مُرتضیٰ راہی اسے جنوبی ہند کے ایک مدرسے میں پڑھایا بھی گیا ہے۔ ہندوستان میں نسبتاً میرے کلام کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ شاید اس کا تعلق پاکستان کے سیاسی حالات سے ہو کہ اُردو ادب کی جانب توجہ کم ہے؟ ان سیاسی حالات کے باعث بعض اوقات پبلشر بھی کوئی ایسی چیز نہیں چھاپنا چاہتے جو کہ انتقام کا نشانہ بنے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''مثنوئ رسولؐ'' کی اشاعت میں پس وپیش کی گئی۔ پاکستان میں اجتہادی بات کہنا بھی مشکل ہے بلکہ اب تو نبیؐ کی تعریف کرنا بھی ناممکن ہو چلا ہے بس آپس کی نکتہ چینی رہ گئی ہے اور وہاں کا ہر ''ادیب'' اور ''عالم'' اپنے آپ کو قادرِ مطلق کے بعد سب سے زیادہ جانکار سمجھتا ہے۔

☆ ہمارے قارئین کو کچھ تفصیل اور افادیت ''مثنوئ نیوران'' تحریر کرنے کے حوالے سے بتلایئے؟

☆☆ نیوران ہمارے دماغ کا بنیادی خلیہ ہے۔ یوں ہماری سوچ کا آئینہ دار۔ اِسی لئے اس کی تعریف کرنا ضروری سمجھا گیا۔ یہ مثنوی سو سے اوپر اشعار کی صورت میں میری کتاب ''سوادِ حور'' میں شامل ہے۔ ہمارے معاشرے میں ذہنی بیمار کو جس جاہلانہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے وہ یقیناً لائقِ مذمت ہے۔ اگر کوئی شخص کینسر یا تپ دق میں مبتلا ہے تو ہم بیمار کو نہیں بلکہ اُسکی بیماری کو قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ اس کے برعکس ذہنی بیمار کو تمام تر ذمہ دار اور قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ مثنوی نیوران میں اس پر احتجاج کیا گیا ہے۔ امریکہ میں ذہنی مریضوں کے ساتھ دو سال کام کرنے کے بعد میں نے یہ مثنوی لکھی ہے اور میری نظر میں اُردو میں پہلی جامع کوشش ہے بلکہ انگریزی میں بھی۔

☆ ایک ہزار چوبیس اشعار پر مشتمل ''TIAMBIC'' میں مغرب بالخصوص امریکہ کو کیا پیغام دیا گیا ہے اور اس پیغام کا ردِعمل کس طرح کا رہا ہے؟

☆☆ انگریزی شاعری میں ایک مشہور میٹر کو Iambic کہتے ہیں چونکہ یہ کہانی وقت (Time) کی ہے لہٰذا میں نے پیار سے اس کو Tiambic کا عُنوان دیا ہے۔ جہاں تک امریکہ میں اس کو کیا پزیرائی ملی یا کیا ردِعمل ہُوا تو اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ یہ پہلی اور واحد شاعری کی کتاب ہے کہ جس کو اُس شیلف پر رکھا گیا ہے جو کہ NASA میں خلا بازوں کی ٹریننگ کے لئے استعمال ہوتا ہے میرے پاس اس کا تحریری ثبوت موجود ہے۔ اور یہ میرے لئے ہی فخر کی بات نہیں بلکہ ایسے ناقدین اور شناوران ادب جن کے ساتھ جید اور ثقہ جیسے الفاظ لگے ہیں وہ بھی اسے لائقِ توجہ سمجھیں۔

☆ ''مسلسل بہتری'' کے اصول کے تحت نئے کلینڈر کی ترتیب اور پذیرائی کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ ''اصولِ مسلسل بہتری'' Principle of Continious Improvement ایک بہت ہی ادق مسئلہ ہے۔ سائنس کی اس ریسرچ کو میں نے مختلف یونیورسٹیوں اور نوبل کمیٹی وغیرہ کو بھیجوا دیا ہے۔ میری نظر میں چاند اور سورج سے وقت کی پیمائش انسانی عملِ ارتقاع کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ ''Islam is the Future'' کے چھٹے باب میں اس مسئلہ پر بات چیت تفصیل سے موجود ہے۔ یہاں کچھ تجربات بھی تجویز کئے گئے ہیں۔ انتہائی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بات قرآن وسنت سے بھی ثابت کی ہے لوگ تو صرف اجتہاد کی بات کرتے ہیں مگر اس کتاب میں یہ کام عملی طور پر کر دکھایا ہے۔

☆ ایک نوجوان بیٹھے بیٹھائے ازل سے پہلے اور ابد کے بعد کی جستجو میں کیونکر پڑ جاتا ہے؟

☆☆ اس لئے کہ سائنس ازل سے پہلے کی بات پر خاموش ہے۔ اسی طرح ابد کا فلسفہ اور اُس کے بعد کی باتوں پر سائنس احاطہ نہیں کر پائی۔ اور یہی وہ باتیں ہیں جہاں مذہب، سائنس کی مدد کر سکتا ہے۔ یہی میری جستجو ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟؟؟

☆ باقاعدہ طریق پر کائنات کے مطالعے کا سلسلہ آپ کے ہاں کب اور کیونکر شروع ہوا اور کس طرح کے نتائج برآمد ہوئے؟

☆☆ کائنات کے مطالعہ کا سلسلہ بچپن سے جاری ہے۔ خیرآباد میں چند روز مولانا سید نجم الحسن مرحوم سے تعلیم حاصل کی۔ سات برس کی عمر ہوگی۔ میری دادی مرحومہ کا کہنا تھا کہ مولانا کے والد سید فخر الحسنؒ کے پاس جنّات کے بچے بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ خدا جانے یہ درست ہے یا نہیں۔ امریکہ چند روز آنکھ کے آپریشن کو مولانا سید ابوالحسن ندویؒ تشریف لائے تو اس لاعلم کو بھی دو روز کے قیام کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے جب اُن سے خیرآباد کے مدرسہ کا تذکرہ کیا تو ہند پہنچتے ہی مولانا نجم الحسن کو خط لکھا۔ ندوۃ کے موجودہ ناظم اعلیٰ مولانا رابع (جو اُنکے ہمراہ تھے) شاید اس بات کی تصدیق کرسکیں NASA میں ملازمت کے دوران یہ شوق اور بھی بڑھ گیا۔ میں نے کچھ عرصہ شٹل (Space Shuttle) کے ایک غیر اہم سسٹم پر بھی کام کیا اور گاڈرڈ خلائی سنٹر میں Tracking کے تعلق سے کام انجام دیا۔

☆ آپ کا تخاطب ''بنی نوع انسان'' کے بجائے ''ہم وطن'' کیوں ہے؟

☆☆ میری تخلیقات میں مخاطب بنی نوع انسان ہی ہے۔ میرا وطن پورا کرہ ارض ہے۔ جلد ہی ایک کتاب منظرِ عام پر آنے والی ہے جس کا عنوان ہے Colonization of MARS۔ اس کتاب میں کئی اہم سوال کرہ مریخ پر آبادی کے اٹھائے گئے ہیں۔ آباد ہونا۔ وہاں اُترنے سے لیکر عبادات اور محبت تک کے سبھی مسائل پر غور کیا گیا اور بعض تجربات بھی تجویز کئے ہیں۔

☆ سائنسی علوم اور اسلام میں تال میل کی جستجو آپ کے ہاں اس قدر شدّ ومد سے کیوں پائی جاتی ہے اور اب تک اس کا حاصل کیا ہے؟

☆☆ اگر کسی سائنس دان نے قرآن کو غور سے پڑھا اور سمجھا ہے تو اُسکے ہاں مذہب اور سائنس میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تو ربطِ خفی کی شناخت کا مسئلہ ہے۔

☆ تاریخی طور پر شاعری اور سائنس کے فرق کو جانتے بوجھتے ہوئے آپ کس طرح کی نئی بنیادیں ڈالنے کے خواہش مند تھے یا ہیں۔ آپ کو اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی حاصل ہوسکی ہے؟

☆☆ سائنس، مذہب اور شاعری ایک دوسرے سے جُدا نہیں کئے جا سکتے۔ جو لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں اُنہیں مزید علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اُردو میں مثنوئ وقت اور انگریزی میں Tiambic اس بات کا ثبوت ہیں۔ امریکہ میں اب یہ بات تسلیم کی جانے لگی ہے۔ اور یہی میرا بھی فلسفہ ہے۔

☆ آپ جس طرح سے مذہب اور سائنس میں ہم آہنگی دیکھنا یا دکھلانا چاہتے ہیں اس طرح تو آپ کو قدم قدم پر اسلام کے نام نہاد ٹھیکیداروں کی مخالفت کا سامنا ہونا چاہیے؟

☆☆ جن مسائل کی مخالفت نہیں وہ اہم مسائل میں شامل نہیں۔ میں تو اس بات کا خواہش مند ہوں کہ ''نام نہاد'' ٹھیکیداروں کو کنٹریکٹ پر کنٹریکٹ دیتا چلا جاؤں تاکہ اُن کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں۔

☆ خدا کا وجود اور اس کی تعریف ہر مسلمان کی طرح آپ کے ایمان کا بھی لازمی جزو ہونا چاہیے مگر اس سے سائنس کے ادھورے پن کی پردہ پوشی کا کیا جواز بنتا ہے؟

☆☆ اس گہرے سوال کا جواب ''اصول مسلسل بہتری'' کے تحت موجود ہے سائنس تعریفاً غیر مکمل ہے۔ اللہ کی ذات تعریفاً لامحدود ہے۔ اُس کو یعنی اللہ کو سمجھنے کے لئے لامحدود وقت کی ضرورت ہے۔ اپنے علم کی بنیاد پر انسان مزید علم جمع کرتا ہے اور اس طرح وہ اللہ کے علم کی لامحدودیت میں آگے بڑھتا جاتا ہے اور یہ سلسلہ لامحدود وقت کے لئے قائم رہ سکتا ہے بشرطیکہ انسان خود کو فنا کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھے۔

☆ ایک شخص جو سیاست دان ہے نہ معیشت دان وہ کیونکر امریکی حکومت کے تمام مسائل مثلاً واشنگٹن شہر کے موجودہ انفراسٹکچر اور توانائی کے بحران کا حل پیش کرتا ہے اور اگر کرتا ہے تو اُس کا نوٹس کس پیمانے پر لیا جاتا ہے؟

☆☆ آپ کا اشارہ میری کتاب President Obama & The Principle of Continious Improvement Volume II کی طرف ہے۔ میرا کام ہے مسائل اور اپنی حد تک اُن کے حل کو پیش کر دینا۔ یہ کتاب امریکی انتظامیہ کے نوٹس میں ہے۔ وہائٹ ھاؤس کے پاس اسکا مسودہ چھاپنے سے پہلے بھیجا گیا تھا تاکہ بعد میں کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو۔ اب میں Department of Energy کے سیکریٹری (امریکہ کے) صاحب کو مزید ایک محضر Triad system پر بھیج رہا ہوں۔ آگے وہ جانیں اور اُن کا کام۔

☆ تیسری دنیا کے اکثر لوگ مغربی چکا چوند میں اپنا ماضی فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ آپ کی طرز کے بے دار مغز احباب اپنی تہذیب، ثقافت اور مذہب سے لازوال تعلق کو نئے معنیٰ اور مفہوم دینے میں مصروف رہتے ہیں۔ مغرب میں پیدا اور پروان چڑھنے والی نوجوان نسل آپ کی خواہشوں اور امیدوں کا بار اٹھانے کی کس قدر اہل ہے؟

☆☆ امریکہ میں بڑھنے والی مسلمانوں کی نسل ہم سے کہیں زیادہ علم رکھتی ہے۔ خاص طور پر ٹیکنالوجی میں۔ میں جب اپنے بچوں کو قرآن سے ثبوت فراہم کرتا ہوں تو وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ تاہم یاد رہے کہ مجھے بھی اُنکی کئی باتوں سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ ''مفکرین'' کی تنگ نظری کی جانب توجہ دلاتے ہیں اور اصولِ مسلسل بہتری کو میرے ہی خلاف استعمال کرتے ہیں۔

میں مسکرا دیتا ہوں۔یہی وسعتِ خیال ہے۔

☆ وہ کون سا اہم کام ہے جو احباب کے خیال میں آپ ''مثنوئ وقت'' کے ذریعے سرانجام دینے کے خواہش مند ہیں؟

☆☆ یہی کہ ہمارا مستقبل کیا ہے' ہمارا راستہ کیا ہے' کیا ہم اپنی منزل پر پہنچ سکتے ہیں' کیا ہماری تاریخ کوئی اور لکھے گا یا ہم ایک فاتح قوم کی طرح اپنی تاریخ خود لکھیں گے جب خود ''وقت'' کو موت آنے والی ہے تو پھر ہم؟؟ کیا ہم جنت پہنچ چکے ہونگے؟

جہاں پر وقت بہتا ہی نہیں ٹھہری جوانی ہے

☆ مغرب میں طویل قیام کے باوجود آپ کی طرز کے بہت سے احباب زوال پذیر'' اردو زبان و ادب'' سے ناطہ برقرار رکھ کر حاصل کیا کرنا چاہتے ہیں۔جن ناقدین اور شناورانِ ادب کے ساتھ جید اور ثقہ جیسے الفاظ لگتے ہیں وہ تو آپ کی قلمی کاوشات کو لائق توجہ گردانتے نہیں؟

☆☆ میرے تجربات کے تحت اُردو ادب زوال پذیر نہیں۔ہمارا کام یہ ہے کہ مغرب میں سائنس اور شعر و ادب کو اکٹھا کر کے آگے بڑھتے چلے جائیں۔ جید اور ثقہ لوگ خود بخود ہماری تقلید میں پیچھے آتے جائیں گے۔ایک دو تو نجی طور پر مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ صفوت ہمارا دل چاہتا ہے کہ تیری طرح لکھنے لگیں۔آپکا دل چاہے تو اسے تعلّی کے زمرے میں شامل کرلیں اور مسکرائیں۔

☆ جس قدر تحرک اور توانائی آپ لوگوں نے اردو زبان و ادب کے لیے صرف کی اگر انگریزی زبان و ادب پر کرتے تو اُس کا بدل اس سے بہتر نہ ہوتا۔ہمارے خیال کی تصدیق آپ کی دو تازہ انگریزی کتابوں کی پذیرائی سے بہ خوبی کی جاسکتی ہے؟

☆☆ اسی لئے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کو ساتھ لیکر چل رہا ہوں۔ آج کل عربی پر بھی خاص طور پر توجہ ہے۔ساتھ میں جب وقت ملے تو شدھ ہندی بھی سیکھ رہا ہوں۔

☆ مغلیہ دور کے اخلاقی زوال کے پیشِ نظر غالب اور ذوق کی باہمی کشاکش کو کسی نہ کسی طور درگزر کیا جاسکتا ہے۔تیسری دنیا کے ناقص تعلیمی نظام اور نامناسب طرزِ زندگی کے پیشِ نظر برِصغیر کے ادبی حلقوں کی دھڑے بندیوں سے صرفِ نظر کرنا بھی ہماری مجبوری ہے مگر تمام تر اعلیٰ دماغی، روشن خیالی، جدید تر تعلیم اور اعلیٰ اطوارِ زیست کے باوصف آپ کے ہاں جا بجا ادبی جتھہ بندیوں اور دشنام طرازیوں کا جواز کیا ہے؟

☆☆ اگر آپ کی مُراد امریکہ سے ہے تو گروپ بندیاں صرف وسائل اور فاصلوں کی وجہ سے ہیں۔مثال کے طور پر نیویارک اور لاس انجلیز کے درمیان تین ہزار میل کا فاصلہ ہے۔جس کے باعث جس قدر ممکن ہے اپنے وسائل یہ دوریاں کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔کسی حکومت کی امداد شامل نہیں وگرنہ فلسفیانہ طور پر کوئی جتھہ بندی نہیں اور اگر ہے تو مجھے اس کا علم نہیں نہ ہی کسی دُشنام طرازی کا واقعہ یاد پڑتا ہے۔

☆ بات جب جب اسلامی تصور اور تعلیمات کی ہوا کرتی ہے ناقدین فرقہ پرستی کی وبا کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے کنفیوژن پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔آپ ہمیں اپنے اسلامی تصور اور ایقان کی بابت تفصیل سے بتلایئے؟

☆☆ میرا اسلامی تصور بنیادی ہے مگر یہ کسی مسلمان پر دھونس جمانے یا اُس پر چسپاں کرنے کے لئے نہیں۔ میرے نظریات اور تھوڑا بہت علم غیر مسلموں کو اسلام کے متعلق بنیادی باتیں سمجھانے میں ہے۔ایک آدھ غیر مسلم میری سُن لیتا ہے اور کبھی کوئی تو اسلام قبول بھی کر لیتا ہے۔اور باقی اپنی راہ لیتے ہیں۔ لکُم دینکُم وَلِیَ دین۔

☆ آپ سمیت اکثر احباب اسلام کو مستقبل کا مذہب گردانا کرتے ہیں مگر اس حوالے سے ٹھوس دلائل اور جواز دینا اکثر بھول جاتے ہیں؟

☆☆ اسلام ہی مستقبل ہے۔اس سلسلے میں میری کتاب Islam is The Future کے آخری باب میں پانچ واضح نکات پیش کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں وہ باب تفصیل کے ساتھ دوبارہ نہیں لکھ سکتا۔مثال کے طور پر اسلام وقت کے حساب سے آخری عظیم مذہب ہے۔اسلئے بنیادی سائنس کے حساب سے ارتقائی طور سے دوسرے عظیم مذاہب کے مقابلے میں آگے ہے۔ موجودہ وقت کے سائنسی حقائق سے بھرپور ہے یعنی یہ کامن سنس ہے کہ اسلام Scientifically most evolved religion in time ہے۔

☆ آپ کے ہاں استعماری قوتوں کا ذکر کثرت سے نظر آتا ہے۔اُن قوتوں کی براہِ راست نشاندہی، دائرہ کار یا دائرہ اثر سے متعلق قاری جو لاتعلقی محسوس کرتا ہے اُس کا سبب کسی طرح کا دیدہ یا نادیدہ خوف تو نہیں؟

☆☆ آپ کا یہ سوال حقیقت کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔مگر حقیقت کو چھونے سے گریز کرتا ہے۔عراق اور افغانستان پر امریکی حملوں کی میں نے کھُل کر مذمت کی ہے بھرے مجمعوں میں کھُل کر' اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر' سابق صدر بُش کو اُنکے زمانے میں' نشانۂ تنقید بنایا ہے۔نظم اور نثر دونوں میں۔لیکن میں کوئی ایسی حرکت نہ کرسکتا ہوں نہ کروں گا جس سے اس ملک کو کوئی جانی نقصان پہنچے۔ میں نہ صرف یہاں کا باشندہ ہوں بلکہ دیانت داری اور دلیل کے ساتھ امریکہ کی عظمت کا قائل ہوں۔تمام پروپیگنڈہ کے علاوہ جب ۹/۱۱ کا سانحہ ہوا تو مجھے یہ بات انسانیت کے خلاف نظر آئی۔اس واقعہ سے مسلمانوں کو امریکہ میں سائیکالوجیکل اور مادی نقصان پہنچا ہے۔اس کے باوجود ۹/۱۱ کے فوراً بعد مجھے ایک عظیم چرچ میں دہشت گردی پر سرمن (وعظ) کے لئے کہا گیا۔تو میں نے یہ دعوت بخوشی قبول کی۔اس وعظ میں امریکیوں پر یہ بات واضح کردی کہ یہ جنگ اسلام اور عیسائیت یا کسی اور مذہب

سے نہیں (اس مجمع میں کچھ یہودی بھی موجود تھے)۔ پھر یہ مثال دی کہ مذاہب کے درمیان جنگوں میں سیکیولر جنگوں کے مقابلے میں بہت کم جانی نقصان ہوا ہے۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جنگ عظیم اوّل اور جنگ عظیم دوئم جو کہ سیکیولر طاقتوں کے درمیان لڑی گئیں مجموعی طور پر ۵۹ ملین لوگوں کی جانوں کو نقصان پہنچا۔ اگر ازل سے آج تک تمام مذہبی جنگوں کو ملا کر اعداد و شمار جمع کریں تو وہ بھی اسکا ایک چوتھائی نہیں۔ پھر چرچ کے سامعین کے روبرو حضرت عمرؓ کے زمانے میں یروشلم کے فتح ہونے پر لڑائی میں جانی نقصان کا پوچھا تو خاموشی چھا گئی۔ بتایا کہ ایک سپاہی بھی دونوں جانب سے نہ مارا گیا۔ یہ تھی خالص مذہبی جنگ۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ یہ لوٹ مار اور قتل وغارت کے لئے نہیں بلکہ اللہ کی حکومت قائم کرنے کو ہے۔ پھر حضرت عُمرؓ کا مدینے سے یروشلم جانا اور وہاں کے کمانڈر کا اُنکے دستِ مبارک میں شہر کی چابیاں پکڑا دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ مذاہب کی جنگ نہیں۔ میرے اس وعظ کا چرچ میں بیٹھے لوگوں پر بہت اثر ہوا اور وہاں کی فضا میں سکون پیدا ہوا۔ بعد میں چائے کے وقفے پر لوگوں نے میرے گرد حلقہ کیا اور اسلام کے متعلق اس قدر سوال کئے کہ مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ پھر کبھی مزید وقت نکال کر اسلام پر بات کروں گا۔ اور پھر یہ سلسلہ کئی ہفتے جاری رہا۔

☆ جس تیزی سے امریکہ کی معیشت انہدام کی جانب گامزن ہے اُس کے ردِعمل میں امریکی شہریوں بالخصوص تارکِ وطن کو کس طرح کے خسارے کا سامنا ہے اور وہ اس خوفناک طوفان کا کیا انجام دیکھ رہے ہیں؟

☆☆ امریکہ میں نہ معاشی انہدام ہے نہ ہی کوئی بدحالی۔ البتہ پچھلے دو سال سے ایک معاشی بحران ضرور ہے۔ امریکی جلد ہی اس پر قابو پالیں گے۔ تارکِ وطن (پاکستانی اور ہندوستانی ہی نہیں) اب بھی پُرانے وطن کی نسبت بہتر زندگی گذار رہے ہیں۔ اب بھی ۹۰٪ سے اوپر اپنے کام کاج میں لگے اور باقی دس فی صد کی دیکھ بھال حکومت کر رہی ہے۔

☆ امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے خیال میں اسلام اور امریکی کشاکش کا جواز اور بنیاد کیا ہے اور انہیں اس کشاکش کا منطقی انجام کیا رخ اختیار کرتا دیکھائی دے رہا ہے نیز اس صورت میں مسلم دنیا بالخصوص امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے مستقبل کے حوالے سے کس طرح کے خدشات سر ابھار رہے ہیں اور اُن سے نبٹنے کے لیے کس طرح کی پیش بندی کی جانی چاہیے؟

☆☆ یہ کہنا غلط ہے کہ امریکہ اور اسلام کے درمیان کوئی کشاکش ہے۔ کشاکش اُس فلسفے کے خلاف ہے جو قتل وغارت پر تُلا ہے۔ یہ اسلامی فلسفہ نہیں۔ اس لئے امریکہ میں اسلام کی تبلیغ اب بھی جاری ہے۔ اللہ کی قدرت دیکھئے کہ اب بھی لوگ پہلے کی طرح اسلام قبول کر لیتے ہیں اور:

بدل دیتے ہیں اپنے نام جب اسلام لاتے ہیں

''قصیدہ آپ کا''

ازل سے گو ہے پارینہ یہ پارہ یا رسولؐ اللہ
قصیدہ آپ ہی کا ہے یہ سارا یا رسولؐ اللہ

بیاں جاری رہے دیجے اجازت یا رسولؐ اللہ
نئی اِک مثنوی کی ہو کتابت یا رسولؐ اللہ

زمیں پر وردِ ہو یوں گونج اُٹھے آسمانوں سے
کہ لکھوایا ہو جیسے آپ نے یہ میرے ہاتھوں سے

یہ میرے عشق کے معراج کی تصنیف ہو جائے
قلم جو بھی لکھے وہ آپ کی تعریف ہو جائے

مقام و حدِّ صِدرہ انتہا بھی پار ہو جائے
میں دیکھوں آپؐ کو اور اُس کا بھی دیدار ہو جائے

پڑھیں بیمار تو سب مرض اُن کے دور ہو جائیں
اندھیرے چھٹ رہیں دل عشق سے پُرنور ہو جائیں

مِرے الفاظ کی چادر کا تحفہ یا رسولؐ اللہ
قصِیدہ ایک پھر ہو جائے بُردہ یا رسولؐ اللہ

پکڑتا ہوں وہیں سے پھر یہ تارے یا رسولؐ اللہ
جہاں جلنے لگے تھے پَر ہمارے یا رسولؐ اللہ

تنِ تنہا ہے وہ اُس کو خیال آیا خیالوں میں
نہیں اُس کے سوا کچھ بھی عیاں اُس کے اُجالوں میں

نہ ہیں الفاظ نَے بحر وزمیں ہیں یا رسولؐ اللہ
قلم اور روشنائی بھی نہیں ہیں یا رسولؐ اللہ

مگر وہ سوچتا ہے یہ کمی اب دور ہو جائے
روایت اُس کی آگے بڑھ کے اب دستور ہو جائے

(مثنوی رسول سے نذرانہ عقیدت)

''چشمۂ علم''

محترم صفوت علی صفوت کے غزلیہ کلام سے مختصر انتخاب

عطیہ سکندر علی (سکھر)

صحرا کے پھول عشق سے منسوب ہو گئے
اس دشت میں جو آئے وہ مجذوب ہو گئے

تم خوبصورتی پہ کرو خود ہی تبصرہ
ہم تو تجلّیات میں محجوب ہو گئے

ہم نے تو کچھ کہا بھی نہیں اُس کی مدح میں
الفاظ اُس کے نام سے منسوب ہو گئے

رہتی تھی ہم کو نزع کے عالم کی تشنگی
وہ بڑھ کے صورتِ سرِ مشروب ہو گئے

ہم دیکھتے تو کیسے وہ جلووں میں اشتعال
قابو سے دَم نکل کے بہت خوب ہو گئے

عُشّاق اب ہماری سفارش کے مشتہی
کانٹے ہماری راہ کے محبوب ہو گئے

تعویذ پہنے آتے ہیں میرے مزار پر
دِل اجنبی جو طالب و مطلوب ہو گئے

صفوتؔ یہ شاعری تِری، واللہ عشق ہے
الفاظِ عشق کب کوئی معیوب ہو گئے

..... ☆ .....

پھر سے بہتات ہوئی جاتی ہے چوپایوں کی
کوئی بستی نظر آتی نہیں انسانوں کی

ہم نے مشرق سے تو کر ڈالا سفر مغرب تک
داستاں ایک ہے گرتی ہوئی دیواروں کی

کوئی تصویر ہی بنوا کے ہمیں دے جاؤ
چشمۂ علم سے اُٹھتے ہوئے فوّاروں کی

اب تو پیدا ہی نہیں ہوتے ولی و مجذوب
اور پرستش ہے مزاروں پہ نگہبانوں کی

روح کس دَور کی آخر ہے یہ تجھ میں صفوتؔ!
تیری آنکھوں میں جھلک آتی ہے ویرانوں کی

☆

کیا شعر پڑھیں ہم محفل میں یہ تم نے بجا ارشاد کیا
شاگرد نہ جو بن پاتے مِرے اُن کو بھی مِرا اُستاد کیا

اِس قصّۂ غم کو مت چھیڑو تقدیر کہاں لے آئی ہے
دہلی، لاہور، کراچی سے نیویارک کو جا آباد کیا

ساقی ہیں بہت، میخانے بھی، پینے کو بھی وافر ملتی ہے
اس شہر کے بے گھر لوگوں کو یوں فکروں سے آزاد کیا

عدل، انصاف کے بوتے پر یاں نسل پرستی قائم ہے
ہر کالے گورے چہرے نے چہرے کو مِرے ناشاد کیا

یہ کیسی روایت ہے صفوتؔ اس ہجرتِ امریکا میں پھر
کشتی بھی جلا ڈالی پہلے اور فتح بھی اس کو بعد کیا

☆

○

آنا جانا ہے اٹل، بیچ کی کاوش کیا ہے — اُس کا ہو جائے کرم، اپنی یہ کوشش کیا ہے
ہم تھے ناشکرے نکل آئے تری جنّت سے — ورنہ اِک ترکِ ثمر جیسی یہ بندش کیا ہے
آر یا پار بہانہ اُسے اِک چاہیے تھا — ہم کو معلوم ہی ہو جاتا کہ لغزش کیا ہے
چھوڑ یہ فلسفہ تقدیر کا کیوں اُلجھا ہے — بات یہ سوچ تری صورتِ بخشش کیا ہے
پھیر دینا مِرا مُنہ کعبے کو امریکا سے — بولے صفوتؔ جو کہا آخری خواہش کیا ہے

..... ☆ .....

○

نوجوانی ابھی قائم ہے گماں ہونے دے
تیرا کیا جاتا ہے دعویٰ مِری جاں ہونے دے
نوجوانی کی ہمیں آگ جلانے دے ابھی
کارِ آتش کدۂ پیرِ مغاں ہونے دے
نوجوانی کی سنانے دے حکایات ہمیں
کچھ پریشانیاں ایسے بھی بیاں ہونے دے
نوجوانی میں تو ناکامی کا سوچا ہی نہ تھا
ہم یہ کہتے تھے، جو ہوتا ہے، یہاں ہونے دے
نوجوانی میں سِتاروں سے پکار آتی تھی
چھوڑ دنیا کو، وہاں آہ وفغاں ہونے دے
نوجوانی میں کسی کام سے گر منع کیا
جوش آتا تھا تو کہتے تھے کہ ماں ہونے دے

☆

○

کیوں غزل کہتے ہیں صفوتؔ کس پہ ہے اتنا غرور
ریزہ ریزہ آپ کیا پھر سے کریں گے کوہِ طور
شمعیں سب بجھ جائیں گی کیا ہوش اُڑ جائیں گے سب
رات ہوگی دن سے روشن جب وہ آئیں گے حضور
کیا یہ سورج بھی اُلٹ کر ہوگا مغرب سے طلوع
یا کہ ٹکرا کر ستارے گر پڑیں گے چُور چُور
آپ بس انسان کو انسان رہنے دیجیے
وہ مِرا محبوب ہے، اُس کے مقابل کیا ہے حُور
ہم نے دیکھی ہے بہت فرعونیت اِس شہر[1] میں
لیکن اب موسیٰؑ کی اُمت کا بھی ہے تھوڑا قصور
مثلِ یوسفؑ آپ صفوتؔ ہوں گے بھی معصوم اگر
تو بھی پیچھے سے لگائی جائے گی تہمت ضرور

☆

[1] نیویارک کی طرف اشارہ ہے۔

''چہارسُو''

○

کھلتے ہوئے گلاب سے رُخسار دیکھنا ہر زاویے سے اُن کو لگا تا ر دیکھنا
جمہوریت کے عشق میں یلغار دیکھنا بُشؔ کا عراقیوں سے ذرا پیار دیکھنا
اُن کی محبتوں کی سُنامی ہے اَوج پر اب شہر بعد شہر کو ہموار دیکھنا
جو شاہ و بادشاہ ہیں اُن کا بھی حشر تم ''اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا''
کہہ دو کہ یہ تو صرف خداؤں کی جنگ ہے تم آدمی ہو مست سما چار دیکھنا
اسپِ مراکشی پہ ملائیشیا تلک خواہش تھی راشدہ ہمیں سرکار دیکھنا
اے صفوتؔ خیال یہ کیا لکھ رہا ہے تُو کچھ امن، آشتی کے بھی اشعار دیکھنا

..... ☆ .....

○

تیرے لہجے میں سفر اور بھی ہے آج کے بعد
ایک معراج ابھی اور ہے معراج کے بعد
تختِ طاؤس بھی محفوظ ہے تیرے ہی لیے
ہے ابھی تاج محل، تاخت و تاراج کے بعد
معجزہ ساتھ مِرے دیکھیو تم اہلِ خرد
جان پھر لوٹ کے آجاتی ہے اِخراج کے بعد
اپنے خیموں سے نکلنا ہے ہمیں سر بہ کفن
صورتِ اطلس و کم خواب و زر و تاج کے بعد
کیا شہادت کو اب اُکساتے ہیں ہم کو، صفوتؔ!
کچھ ملائک بھی اُڑے جاتے ہیں افواج کے بعد

☆

○

زہر کرتا ہے اثر شاید مِری تدبیر کا
لوح میں محفوظ ہے لکھا مِری تقدیر کا
اس پلانیٹ ایپ[1] میں انسان دہشت گرد ہے
متن تھا یہ مختصر بُش کی تقریر کا
کیا کریں اِک جانور کی ذہنیت پر احتجاج
پی گئے چپ چاپ ہم، لقمہ دیا خنزیر کا
سوچ ناقص ہو گئی چھینی گئی بینش مِری
طوق پوشیدہ رہا اغیار کی زنجیر کا
اپنا اپنا فائدہ سوچا کیے، صفوتؔ ! سبھی
ذکرِ غالب میں رہا منشا ہمہ تشہیر کا

☆

[1] Planet Ape یعنی وہ کرہ جہاں Apes کی حکومت ہو۔

مصرعِ شامِ غزل ہے، قافیہ گفتار ہے
میرے ارمانوں کی صورت کاسۂ اشعار ہے

منّ وسلویٰ ہو کہ روٹی جَو کی میرے یار ہو
شکر ہے ہر حال میں اُس کا جو پالن ہار ہے

یہ تو اُس پر منحصر ہے جب تلک چاہے چلے
وقت اُس کا، جام اُس کا، دین بے مقدار ہے

بات چودہ سو برس پہلے کی ہم کرتے مگر
آج بھی اپنے ہی خوں سے سرخ یہ گلزار ہے

بسنے والے ہیں یہودی روضۂ اطہر کے پاس
شیعہ وسنّی کی یہ ، خاکم، ہماری ہار ہے

کیفیت مجذوب کی ، یہ ہے روابط کے لیے
یہ کہاں سنسار ورنہ، وہ کہاں سنسار ہے

عشق کی منزل سیاست سے بہت اونچی ہے یار
عرش سے صفوتؔ اتر آئیں، اُنہیں انکار ہے

..... ☆ .....

وہ اپنے حُسن کی چنگاری دن رات اُڑایا کرتے ہیں
ہم آگ بجھایا کرتے ہیں، وہ آگ لگایا کرتے ہیں

گردش میں سُلگتے ہیں تارے، سورج بھی دہکتا رہتا ہے
ہے ساری تپش جو وہ سب کو اُنگلی پہ نچایا کرتے ہیں

اب اُس کی جوانی کی آتش اس پیرِ مغاں تک پہنچی ہے
اب ہم سے پرستش کیا ہوگی، دامن ہی بچایا کرتے ہیں

اُس برق فشاں کی باتیں بھی رہتی ہیں تصوّف میں ڈوبی
لاہوت میں اُڑنے والے بھی پَر اپنے بچایا کرتے ہیں

وہ شمع کی صورت ہیں بالکل پروانے بھی جلتے ہیں اُڑ کر
جواُن سے محبت کرتے ہیں، وہ جان سے جایا کرتے ہیں

ہے عشق پہ اپنا زور بھی اب، آتش سے بھی اپنی یاری ہے
ہم یار کی شعلہ باری سے گلزار بنایا کرتے ہیں

آتش پہ، تپش پر صفوتؔ کو ہم اپنا مقالہ بھیجیں گے
سُنتے ہیں کہ وہ شاگردوں کو اُستاد بنایا کرتے ہیں

☆

- طرحی غزل -

ہم بھی اشعارِ بریں، عرش نوا کہتے ہیں
شعرِ غالبؔ کو مگر شعرِ خدا کہتے ہیں

اُس کے اشعار عبادت پہ ہمیں اُکسائیں
ہم جو کہتے ہیں غزل پڑھ کے دُعا کہتے ہیں

اُس کے دیوان میں نغمے ہیں پری زادوں کے
سحرِ جذباتِ سخن، ہوش رُبا کہتے ہیں

اُس کے افکارِ مسیحائی، دَوائے اَمراض
بیچ نیوران سرِ برق شفا کہتے ہیں

بابِ عُشّاق میں ہے ذکرِ حدیثِ غالبؔ
''ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں''

بعد تعریف یہ ارکانِ کمیٹی سے ہے عرض
مصرعِ طرح نہیں، اس کو سزا کہتے ہیں

ایک صفوتؔ ہی بچے اب ہیں خدا کے آگے
اُن کے ہر شعر پہ اِک حشر بپا کہتے ہیں

☆

ہم بھی تو کھڑے ہیں راہوں میں

سید ضمیر جعفری (●)

جناب صفوت علی سے ہماری پہلی ملاقات ۱۹۹۷ء کے آغاز میں ایک مشاعرے کے موقع پر ہوئی تھی۔ اس مشاعرے کا اہتمام صفوت علی نے سبزہ زاروں کے درمیان واقع ایک حسین قصبے ''منرو'' کنے ٹی کٹ میں کیا تھا۔ اس مشاعرے کی دعوت انہوں نے فون پر دی جب کہ مجھے وہاں تک کشاں کشاں اردو مرکز کے روح رواں رئیس وارثی لے گئے۔ صفوت علی صاحب ہمیں پسند آئے۔ ہم نے انہیں بیک وقت شائستہ اور ہنس مکھ ایک ایسا شخص پایا جو کبھی بوڑھا نہ ہو، جو آندھیوں میں بھی اپنا چراغ جلائے رکھے۔ لاہور میں، علامہ اقبال کی ''جاوید منزل'' کے نواح میں جوان ہونے والا صفوت، ایک محبت کرنے والا انسان ہے۔ لہٰذا ہمیں پہلی ملاقات ہی میں اس کی شخصیت بہت میٹھی لگی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ جب وہ

اور بھی کھل گئے دو چار ملاقاتوں میں

تو ہم پر واپسی کے دروازے بھی بند ہو گئے۔ سچ پوچھیے تو اس کی محبت کا ''جپھا'' ایسا مضبوط ہوتا ہے کہ اس سے نکلنا محال ہے۔ وہ قریب آنے میں عجلت نہیں برتتا اور جب قریب آ جاتا ہے تو درمیان میں کوئی فاصلہ نہیں رکھتا ہاں، یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ کسی کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے نہ کسی کے آگے چلتا ہے۔ وہ اپنا کنواں خود کھود کر پانی پینے کا قائل ہے، ذاتی روابط کے ایجاب وقبول، میں جتنا دیر پسند ہے اتنا ہی دیرپا بھی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دوست نوازی کا ہنر جانتا ہے۔ (نیویارک کے ایک بزرگ شاعر ڈاکٹر مظفر شکوہ مرحوم کی کتاب ''پیمانہ دل'' کی اشاعت اس کے خلوص کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے)۔ یوں کہیے کہ صفوت رہتا ہے امریکا میں اور جیتا ہے پاکستان میں۔

شروع میں ہم نے صفوت کو دوست نوازی کے باعث پکڑا۔ قہقہوں کے جھرٹوں میں ہم نے اس کی چند شگفتہ چیزیں بھی سنی تھیں مگر بعد میں ہمیں اس کی فکرمندی نے جکڑ لیا۔ ہم نے اس فکرمندی پر تفکر کیا تو کھلا کہ موصوف کی فکرمندی ذاتی نہیں، کائناتی ہے۔ یہ فکر دراصل اسے سائنسی علوم سے ملنے والی بے چینی ہے۔ اس فکر نے اس کی ذات کو آگ میں کھلے گلاب کی صورت بنا دیا ہے۔ لہٰذا جو چیز بعض کو مکمل نظر آتی ہے وہی چیز اسے نامکمل نظر آتی ہے۔ اسی باعث یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کی کوکھ میں کروٹیں لینے والے لاوے اس کی طرف لپک رہے ہوں، کہکشائیں اس کے پہلو میں سمانے کے لیے بے قرار ہوں اور درخت اسے لہک لہک کر آواز دیتے ہوں۔

ہم بھی تو کھڑے ہیں راہوں میں

اس کیفیت کی ایک ممکن وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سائنس اور فلسفے کے ڈانڈے کسی پگ ڈنڈی پر ضرور مل جاتے ہیں جہاں سائنس دان اور فلسفی ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے ہیں۔ اقبال نے شاید اسی لیے کہا تھا:

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
خلوت لالہ وگل سے مقام پیدا کر

غنیمت ہوا کہ مذہب پر صفوت کا مطالعہ گہرا ہے۔ شہر میں اپنے گھر کے علاوہ اس کا کوئی اور گھر ہے تو وہ مسجد ہے۔ عالم اسلام کے بطل جلیل ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (جو امریکا میں اپنی علالت گزار رہے ہیں) کے فیضان صحبت نے اس کے مزاج میں ٹھہراؤ اور اس کی بیوی فوزیہ نے اس کی طبیعت میں مثالی جماؤ پیدا کر رکھا ہے۔ اس کی شخصیت میں یہ ٹھہراؤ اور جماؤ نہ ہوتے تو شاید وہ نظام شمسی کا ہم رکاب ہو کر پل صراط سے گزرنے کی تیاری میں سرگرداں پایا جاتا۔

نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایت زمانہ

زیر نظر مثنوی تخلیق کائنات کے پرتوں اور کروٹوں کو شعر میں ڈھالنے کی ایک مربوط کوشش ہے۔ اس مثنوی کی ابتدائی اقساط ماہ نامہ چہارسو راولپنڈی میں چھپ چکی ہیں۔ اکتوبر ۱۹۹۸ء میں صفوت نے پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ اس وقت اس کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقاریب میں ان اقساط پر اعترافی باتیں ہوئی تھیں۔ بے شک صفوت نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا تھا۔ مگر اس کی ''سائنس'' نے ''غزل'' کو روایتی انداز میں نہ چلنے دیا بلکہ یوں کہیے کہ اس کا راستہ روکے رکھا۔ ہمیں تو اس کی غزل اوپری اوپری لگتی تھی جیسے کوئی بلوچی لڑکی قبیلے سے باہر بیاہ دی گئی ہو۔

سائنس اور آرٹ کے ضمن میں، صفوت مجھ سے زیادہ پارکھ ہے۔ اس کے نزدیک، تخلیق کے عمل میں سائنس کے دھوئیں اور پتھروں کی رگڑ کا وجود ضروری ہے کہ اب زمانہ صرف خیال آرائی کے دور سے نکل رہا ہے۔ اب بیان میں وسعت کے لیے اشاروں اور کنایوں کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری اور وجدان کے عناصر بھی ناگزیر ہیں۔

مثنوی وقت میں اسلام کا ذکر ایک فطری بہاؤ کے ساتھ آیا ہے۔ اس کے متون کو ''مسلمان'' بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس میں دریافت کے فطری سوتے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ اس میں سائنس اور آرٹ ہم آہنگ ہیں۔

صنف مثنوی کا ایک بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس میں ''کہانی پن'' ہو۔ صفوت کی مثنوی میں تخلیق کائنات کی کہانی بڑی طاقت اور تاخیر سے چلتی نظر آتی ہے۔ اس میں زبان اور بیان کے جمالیاتی رخ بھی تابندہ ہیں۔ نقد ونظر کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایسے گنی گیانی ہی اس پر تبصرہ کر سکتے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ سکتا ہوں مثنوی وقت کا موضوع ایک کٹھن مشرقی راستہ تھا جسے صفوت علی نے مغرب میں کامیابی سے طے کیا ہے۔

''دربارِ محمدؐ''

ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط
(مہاراشٹر، بھارت)

''رَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ'' کی صدا قرآن حکیم نے جب سے لگائی ہے، اللہ تعالیٰ کے پیارے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر چہار دانگ عالم میں ہر زماں اور ہر زبان میں ہو رہا ہے۔ یوروپین ممالک کی ترقی یافتہ زبانوں سے لے کر افریقہ اور آسٹریلیا کی غیر متمدن اقوام کی اجڈ اور غیر ترقی یافتہ بولیوں تک میں اللہ کے رسولؐ کا ذکر نہایت والہانہ اور عقیدت مندانہ انداز میں کیا جا رہا ہے۔ کہیں اذانوں میں محمد رسول اللہ کی گونج ہے تو کہیں اوراد و اذکار میں نامِ رسولؐ وردِ زباں ہے۔ کہیں محافلِ وجد و سماع میں ذکرِ رسولؐ پر سر دُھنے جاتے ہیں، تو کہیں محافلِ میلاد مدحتِ رسولؐ کے لیے سجائی جاتی ہیں۔ تسبیحات میں درود و سلام کا ورد ہوتا ہے تو نمازوں میں صلوٰۃ و سلام کا اہتمام۔ ذکرِ حبیبؐ محلوں میں بھی ہے، کاشانوں میں بھی۔ خانقاہوں میں اللّٰہُ کی ضرب کے ساتھ محمد رسول اللہ کا ذکر ہے تو مدارس میں قال اللہ و قال الرسول کی صدا۔ دشت و صحرا میں اسی کی بازگشت ہے تو گلزاروں اور کشت زاروں میں بھی اسی کی پکار۔ یادِ رسولؐ پہاڑوں پر بھی ہو رہی ہے اور میدانوں میں بھی اسی کا آوازہ بلند ہے۔ سمندر کے سینے پر بھی انسان ذکرِ رسولؐ میں رطب اللسان ہے تو بسیط فضاؤں میں ہواؤں کے دوش پر بھی رسول اللہ کی یاد دلوں کا انبساط اور روح کی نشاط اور ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ فضاؤں سے پرے خلاؤں سے آگے فلک الافلاک سے بہت اوپر اللہ کے عرش پر بھی یادِ رسول میں صلوٰۃ و سلام کا ورد ہوتا ہے۔ شاید یہ ہی وجہ ہے کہ ثنائے محمدؐ اور وصفِ حبیبؐ سے دنیا کی کسی بھی زبان کا ادب ناآشنا نہیں۔ یہی وہ ذات ہے جس کا تذکرہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر دو طرح سے ادبی دنیا کے لیے شان اور سببِ عظمت بنا رہا ہے اور جس کے ذکر کی لذت انسانیت کی فلاح و کامرانی کی ضامن بنی۔ جس کی وجہ سے آپؐ کے نہ ماننے والے بھی آپؐ کی عظمت کے قائل رہے ہیں، انہوں نے والہانہ انداز میں آپؐ کی ثنا گستری کو شعارِ حیات بنایا۔

ذکرِ حبیبؐ اور ثنائے محمدیؐ کا چسکا ہمارے ان شعراء کو بھی لگا ہے جو تارک الدیار ہیں اور مہاجرت اختیار کر کے سمندر پار دنیا میں جا بسے ہیں۔ یادِ رسولؐ کے ذریعے ان شعراء نے آسودگی، دلبستگی اور اطمینانِ قلبی حاصل کی ہے۔ مہاجرت کی کلفتوں کو دور کرنے اور غیروں کے درمیان اپنا تشخص قائم رکھنے کے لیے حضورؐ سے اپنے قلبی وابستگی کا اظہار ان شعراء نے اپنے نعتیہ کلام میں مختلف انداز سے کیا ہے۔ گویا نعتِ رسولؐ ان کے لیے مداوائے رنج و الم اور سامانِ نشاط و انبساط ہے۔ سمندروں سے اس پار دیارِ مغرب میں فروکش اُردو شعراء کے نعتیہ کلام کے تجزیے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عقیدت کی فراوانی ان کے یہاں باوجود مغرب پرستوں کے درمیان رہنے کے ویسی ہی ہے جیسے ہمارے برصغیر کے شعراء کے نعتیہ کلام میں پائی جاتی ہے۔ ہاں! خیالات کا کچھ نیا پن جو مغربی افکار کی دین ہے، ان کے یہاں ضرور پایا جاتا ہے۔ ذیل میں براعظم امریکہ میں کی جانے والی نعتیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے صفوت علی صفوت کے مقام کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔

نعت آپؐ کی مدحت طرازی کو کہتے ہیں۔ یہ فنِ حمد یہ شاعری کے بالمقابل زیادہ مشکل ہے۔ مدحتِ رسولؐ میں نہ اسراف و تبذیر کی گنجائش ہے نہ استقصار۔ اس لیے شاعری کو ہر دو جانب سنبھلنا ہوتا ہے۔ مدحت عربی لفظ ہے۔ یہ مدح سے مشتق ہے اور عربی شاعری کے چار ارکان میں سے ایک ہے۔ کتاب العمدۃ میں ابن رشیق نے مدحت طرازی کے اصول و ضوابط بیان کیے ہیں۔ مولانا شبلی نے اپنے مقالے میں ان کا خلاصہ اس طرح پیش کیا ہے:

۱۔ الفاظ گزیدہ اور شستہ ہوں۔ سوقیانہ الفاظ اور محاورے نہ آنے پائیں۔
۲۔ مدح میں زیادہ اشعار نہ ہوں۔
۳۔ مدح میں تفاوتِ مراتب کا لحاظ رکھا جائے۔
۴۔ زیادہ تر ذاتی اور اصلی اوصاف بیان کرنے چاہئیں۔ جو اوصاف عارضی ہیں مثلاً دولت، جاہ و مال وغیرہ ان چیزوں کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

ابن رشیق عارضی اوصاف کو سرے سے ترک کرنا نہیں چاہتے البتہ وہ ذاتی اوصاف کو مقدم رکھنے کے مؤید ہیں۔ عربی شاعری میں شاہوں اور سلطانوں کی مدحت سرائی کے لیے یہ اصول اور ضوابط مرتب کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ کی مدح سرائی میں ان اصولوں کا التزام بدرجہ اتم رہے گا، کہ آپؐ تو شاہوں کے شاہ اور سلطانوں کے سلطان ہیں۔ ان خطوط کی روشنی میں جب دیارِ مغرب بالخصوص براعظم امریکہ میں بسنے والے شعراء کی نعتیہ شاعری کو نقد کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ شریعت و شعریت کا امتزاج

حسنِ شعری کا نام شعریت ہے۔ شاعری کو اگر جسم تسلیم کر لیا جائے تو شعریت اس کی روح ہے۔ شعریت کے بغیر شاعری مردہ جسم کے مانند ہے۔ وارداتِ حیات کی ترجمانی اگر شاعری ہے تو اس میں تخیل و جذبات کا وجود اس کی شعریت کو قرار دیا جائے گا۔ محبّ عارف اپنی اہم کتاب ''شعریات: مسلکِ و معقولیت'' میں شعریت کی یوں تعریف کرتے ہیں:

> ''شعریت ایک معنوی دلکشی ہے۔ یہ ہماری جمالی جبلت کی اس شاخ کی تسکین کا باعث ہوتی ہے جو ذوقِ شعری کی روحِ رواں ہوتی ہے۔ ذوقِ شعری کے دراصل دو

پہلو ہوتے ہیں: ایک تخلیقی، جو شاعر سے شعر کہلواتا ہے، دوسرا انفعالی، جو قاری کو شاعر کی تخلیق انگیز قلبی کیفیت میں کیف انگیز شرکت سے ہم کنار کراتا ہے۔''

گویا شعر کی اثر آفرینی، جاذبِ توجہ اور دل میں سما جانے کی خوبی کا نام ''شعریت'' ہے۔ لیکن ہر شعر نہ جاذبِ توجہ ہوتا ہے نہ دل میں سماتا ہے۔ شعر میں یہ خوبی عود کر آنے کے لیے مندرجہ ذیل لوازمات کا ہونا ازحد ضروری ہے۔

۱۔ شاعر کے اپنے مشاہدات اور تخیل کی ہم آہنگی
۲۔ جذبے کی ترسیل کے لیے الفاظ کی پیکر تراشی۔
۳۔ طرزِ اظہار میں دلکشی اور فطری پن۔
۴۔ دوراز کار معنویت سے عاری الفاظ کا استعمال۔
۵۔ سادگی و پرکاری۔
۶۔ تنافر و نامانوسیت اور خلافِ قواعد جملوں سے اجتناب۔
۷۔ شعر میں اپنی بات کہنے کی بجائے، بولنے والے الفاظ کا استعمال۔
۸۔ اظہارِ خیال کی برجستگی۔
۹۔ احساس کو برانگیختہ کرنے کا ہنر۔
۱۰۔ سلاست، نزاکت، جدت، روانی اور موزونیت۔

یہ سارے لوازمات پیکرِ شعر میں ڈھل جائیں تو شعریت عود کر آتی ہے اور اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔

تقدیسی شاعری میں بالعموم ان لوازمات کا نباہ ذرا مشکل ہوتا ہے۔ نعتیہ شاعری میں ان کے استعمال میں اور بھی زیادہ دِقت پیش آتی ہے، اس لیے اس میں شعریت کا نہ پایا جانا بدیہی ہے۔ بقول محمد حسن عسکری:

''بیشتر مذہبی شاعری کے ناکام رہنے کی ایک تاویل تو ہم یوں کر سکتے ہیں کہ شاعری کا تعلق عالم طبعی سے ہے اور مذہبی تجربات عالمِ طبعی سے ماورا ہیں۔ اس لیے شاعری سے ان تجربات کے اظہار کا کام لیا ہی نہیں جا سکتا۔

(محمد حسن عسکری: ''مجموعہ''، لاہور، ۱۹۴۴ء ص:۴۱۲)

شریعت، احکامِ الٰہی کو سنتِ رسولؐ کے طریقے پر پورا کرنے کا نام ہے۔ شریعت معمولات روحانیہ کی عملی تفسیر ہی نہیں، معاملاتِ دنیا کے عملی تجربات کے خدائی ضابطوں کا منشور ہوتی ہے۔ یہ مابعد الطبیعیاتی روحانی نظام کو انسانی زندگی کے مادّی نظام سے نہ صرف یہ کہ مربوط کرتی ہے بلکہ دونوں میں مطابقت و مماثلت پیدا کرتی ہے۔ شریعت ہمیشہ پاک و مطہر اور خیر و صالح خیالات کا سرچشمہ ہوتی ہے، وہاں لہویات و لغویات کا کوئی گزر نہیں۔ شریعت سعید جذبات کو تحریک دیتی ہے اور لطیف احساسات کو جگاتی ہے۔ وہ آدمی کو حسنات کا خوگر بناتی ہے اور قبائح سے دور رکھتی ہے۔ غرضیکہ شریعت کلیتاً خیر ہی خیر ہے۔ نعت میں جب شریعت و شعریت دونوں یکجا ہو جائیں تو اس کا ہر شعر خیر و صداقت و حسن کا مرقع بن جاتا ہے۔ امریکہ کے نعت گو شعراء کے یہاں ایسے حسین مرقعے جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔

شمالی امریکہ میں عبدالرحمٰن عبد پہلے نعت گو شاعر ہیں، جن کا حمد و نعت پر مشتمل کلام کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔ ''عرفانِ عبد'' ان کے نعتیہ مجموعے کا نام ہے۔ نیویارک میں مقیم عبدالرحمٰن عبدؔ دیارِ غیر میں انوارِ حرم، ذکرِ رسولؐ کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ ان کا کلام پختہ، سادگی و پرکاری کا حسین سنگم نظر آتا ہے۔ مؤدّت و محبتِ رسولؐ ان کی نعتوں میں جا بجا اپنا وجود منوا لیتی ہے۔ ان کی نعتوں میں مدحتِ رسولؐ پابندِ شریعت دکھائی دیتی ہے۔ نہ ان کے یہاں عقیدت میں غلو ہے کہ شریعت سے منحرف ہو جائے نہ عشقِ رسولؐ میں تنگ دامانی کا احساس ہوتا ہے۔ اپنی نعتوں میں انہوں نے عقیدت کے ساتھ شعری تقاضوں کو بھی نبھایا ہے۔ یہ چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

داستاں معتبر انھیں سے ہے
زندگی کی سحر انھیں سے ہے
عبدؔ اس لالہ زارِ ہستی میں
رنگ ہے جس قدر انھیں سے ہے

عبدؔ تکمیلِ بیانِ مصطفیٰ ممکن نہیں
شرح یہ ایسی ہے جس کی انتہا ممکن نہیں
ہیں محمدؐ مظہرِ نورِ خدائے لم یزل
کر سکیں الفاظ اس کا حق ادا ممکن نہیں

صفوت علی صفوتؔ کی نعتیہ شاعری میں بھی شریعت و شعریت باہم یکجا ہوئے ہیں۔ نعت کے ایک شعر میں تو انہوں نے نعت کے لیے نام محمدؐ ہی کو شعریت سے تعبیر کر دیا ہے:

یہاں شعریت بس ہے نامِ محمدؐ
یہ تعریف میں بے حساب آ رہا ہے

گویا ذکرِ رسولؐ میں تو اثر صفوتؔ کے نزدیک شعریت سے کم نہیں۔ اس لیے کہ شعریت شاعر کی جمالی جبلت کی تسکین کا باعث ہوتی ہے اور ذکرِ رسولؐ تسکینِ قلب کا موجب ہوتا ہے۔ صفوتؔ نے عقیدت اور شعریت کو بھی یکجا کرنے کی کوشش کی ہے:

فقط نور ہیں وہ، ہمہ نور ہیں وہ
جسد تو یہ بن کر نقاب آ رہا ہے

۲۔ اسالیب کا تنوع

طرز بیان اور طرز تحریر کو اسلوب کہتے ہیں۔ شاعری میں طرزِ سخن اسلوب کہلائے گا۔ کسی بات کو مختلف طور پر پیش کرنے یا ایک بات کو سو طرح سے بیان کرنے کی وجہ سے بیان میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ طرزِ بیان کے ایسے کئی

اقسام ہوتے ہیں۔ان کے سہارے شاعر اپنے کلام کو مؤثر اور حسین بنانے کا جتن کرتا ہے۔نعت گو شعراء عقیدت کی فراوانی اور عشقِ رسولؐ میں وارفتگی کی بنیاد پر گلہائے مدحت میں اسالیبِ سخن کے رنگ بھر بھر کر گویا چمنستانِ نعت سنوارتے ہیں۔ اُردو شاعری میں انیسؔ ایک مضمون کو سو طرح سے باندھنے کے لیے معروف ہیں۔شعراءِ نعت گو نے بھی اس طرز کو اپنایا ہے۔حضرت مولانا مفتی اعظم احمد رضا خاں بریلوی نور اللہ مرقدہ کے یہاں اسالیبِ شعری کے کئی ابعاد پائے جاتے ہیں۔انہوں نے واقعی نعت گوئی کے فن کو عقیدت و محبتِ رسولؐ سے جوڑ کر بلندی پر پہنچا دیا ہے اور ایک غیر ملتفت صنف کو مرکزِ التفات بخشا ہے۔ مولانا مرحوم کی تقلید میں برصغیر کے سیکڑوں نعت گو شعراء نے نعت میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنی عقیدت ، جذبات اور وادراتِ قلبیہ کو نعتیہ اشعار میں مختلف اسالیب کے سہارے بیان کیا ہے۔دیارِ مغرب کے نعت گو شعراء کے یہاں بھی اسالیب کا تنوع پایا جاتا ہے۔ظفر علی خاں نے ''**لولاک لما خلقت الافلاک**'' کی تصریح اپنے ایک شعر میں کچھ اس طرح کی ہے:

سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کے غایتِ اولیٰ تمہیں تو ہو

اب اس خیال کے مختلف ابعاد مہاجر شعراء کے یہاں ملاحظہ فرمائیے۔حامد امروہی(USA) نے لولاک کے تصور کے کئی پہلو تراشے ہیں:

تخلیقِ کائنات کا منشاء کہا گیا
دونوں جہاں کا ان کو اجالا کہا گیا
باعثِ کُن فکاں مرے آقا
رونقِ دو جہاں مرے آقا
وجہِ کون مکاں آ گئے
صدرِ بزمِ جہاں آ گئے

''لولاک'' کی وضاحت کے لیے حامدؔ امروہی نے ''تخلیقِ کائنات کا منشاء''، ''باعثِ کون ومکاں''، ''رونقِ دو جہاں''، ''وجہِ کون ومکاں'' ''صدرِ بزمِ جہاں''، ''باعثِ عالم امکاں'' اور ''قصہٗ زیست کا عنواں'' جیسی بامعنی اور پراثر تراکیب استعمال کی ہیں جن میں عظمتِ رسولؐ کی جھلک نمایاں ہے۔

محسن احسانؔ نے ''لولاک'' کی ترجمانی کرتے ہوئے آپؐ کو ''رونقِ دوعالم کے نگہباں'' اور ''سینۂ کونین میں رواں سانس کی وجہ'' قرار دیا ہے۔ طلعتؔ سلیم آپؐ کی ذات کو ''وجہِ نمودِ شش جہات''، ''زینت کون ومکاں'' کہتی ہیں۔خواجہ محمد عارف ''لولاک کی تصریح الفاظ میں عود وعنبر کی خوشبو بسا کر کرتے ہیں:

بزمِ کونین مہکتی ہے انہیں کے دم سے
پیکرِ عطر کہو، ان کو گلِ تر لکھو
یوں کہو ان کی ہی رحمت ہے جہانوں کو محیط
سارے عالم کے وہی مرکز و محور لکھو

لیکن ان تمام شعراء سے ہٹ کر صفوت علی صفوتؔ نے اشارے کنائے میں آپؐ کی ذات کو ''وجودِ وجہِ وجود'' یعنی Cause اور Effect کے رشتے سے جوڑا ہے۔اسے Principle of Casualty کہتے ہیں۔اس میں کائنات کی تخلیق سے پہلے کے ان اصولوں کا ذکر ہے جن کی اطاعت اجسام کے لیے طے پائی۔اسے صفوت نورِ احمدِ مجتبیٰؐ سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہی وجہِ تخلیقِ کائنات۔آپؐ کے لیے یہ توجیہہ سائنسی فکر سے لگا کھاتی ہے۔لیکن شاعر اس کی وضاحت نہیں کرتا اور اسے بعد میں بیان کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔

تو وہ نورِ احمدِ مجتبیٰ وہ الگ ہے عشق کی داستاں
یہ عبورِ وقت کی بات ہے وہ میں پھر کروں گا کبھی بیاں

صفوتؔ نے اپنا یہ وعدہ ''مثنوی رسولؐ'' لکھ کر پورا کیا ہے۔ صفتِ لولاک کی طرح آپؐ کے وصفِ نور، رحمۃ اللعالمینی صفت، سفرِ معراج، صحائف قدیمہ میں آپؐ کے متعلق پیشین گوئیاں اور سیرت کے مختلف واقعات کے بیان میں دیارِ مغرب کے اُردو نعت گو شعراء نے مختلف النوع اسالیب اپنائے ہیں۔ یہ اسالیب کہیں تو واقعی جاذب نظر اور دلکش دکھائی دیتے ہیں، لیکن بعض جگہوں پر نظر ٹھوکر کھا جاتی ہے۔

۳۔ عصری مسائل

سائنسی ایجادات ، تہذیبی گراوٹ، اخلاقی بدحالی اور انسانیت کی پستی نے زمین پر بسنے والے انسانوں کی زندگی میں پیچیدہ صورت حال پیدا کر دی ہے۔آدمیت کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔حیوانیت اور بہیمانہ طرزِ زندگی کو ترقی اور تہذیبِ نو کے پرفریب القاب دیے جا رہے ہیں۔سیاسی نظام جنگل راج بن کر عالمی سطح پر پھیلتا جا رہا ہے۔سلطانی/ زمینی عذابوں کی قہر آلود مسموم فضاؤں کو ختم کرنے کے لیے رحمتوں کا نزول ضروری ہے۔اس لیے محسن احسان عالم انسانیت کی تیرہ بختی کا منظر بارگاہِ رسولؐ میں یوں پیش کرتے ہیں:

شاہ یثرب ہے عجب اُمتِ مرحوم کا حال
اب نہ احساس ہے باقی نہ مروت باقی
اب ہر اک فرد ہے قید اپنے صنم خانے میں
اب محبت نہ صداقت نہ اخوت باقی
اب فقط فرقہ پرستی کی ہوا چلتی ہے
اب خدا ہے نہ خدا کی ہے اطاعت باقی

صفوت علی صفوتؔ کی ''مثنوی رسولؐ'' میں البتہ عصری مسائل کا زاویۂ نگاہ تمام نعت گو شعراء سے مختلف نظر آتا ہے۔وہ خود سائنس داں ہیں اور اُمت کے سائنسی علوم کی جانب مراجعت کے خواہاں ہیں۔لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اُمت کو علم سے دلچسپی نہیں رہی۔ ناخواندگی کا گراف امت میں بڑھتا جا رہا ہے۔اس دکھ کا برملا اظہار وہ اپنی نعتیہ مثنوی میں یوں کرتے ہیں:

ابھی اُمت کی کثرت نام اپنا پڑھ نہیں سکتی

خلاء کی دوڑ میں آگے تو ایسے بڑھ نہیں سکتی
بصیرت عالموں کی علم سے اب دور رہتی ہے
مکمل روشنی میں بھی شبِ دیجور رہتی ہے

صفوت علی صفوتؔ نے ملّی مسائل کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی مسائل کو اپنی نعتیہ شاعری میں پیش نہیں کیا اور نہ ہی قدرتی آفات، اچانک رونما ہونے والے حادثات، سماجی مناقشات اور عالمی سیاست کے پیدا کردہ مصنوعی مسائل کی وجہ سے ہونے والی پیچیدگیاں وغیرہ انسانی حیات سے جڑی پریشانیوں کا رونا صفوتؔ نے اپنی نعتوں میں رویا ہے۔ نعت جیسی مقدس شعری ہیئت کو شاید وہ اس کا متحمل نہیں سمجھتے ہیں۔

۴۔ تاثراتی نقوش (Impressionistic Paintings)

شاعری میں تاثراتی نقوش کا ارتسام نہایت مشکل ہوتا ہے۔ کسی منظر، واقعے یا حادثے کو دیکھ کر اُمڈے ہوئے جذبات اور شدید احساست سے تشکیل پانے والے تاثر کی شعر میں لفظی تصویر کھینچنے کا عمل تاثراتی نقوش کہلاتا ہے۔ یہ عمل محاکاتی اور تجسیم کاری نیز پیکری بیانیہ (پیکریت) سے مختلف بھی ہوتا ہے اور بعض دفعہ ان کا ہم معنی۔ مصوری میں تاثراتی نقوش ظل و نور کی مدد سے اُبھارے جاتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال پندرہویں صدی عیسوی کے اٹالین مصور لیونار دور۔ ونچی کی مشہور پینٹنگ ''لاسٹ سپر'' (آخری ناشتہ) ہے۔ مصور نے اس تصویر میں عیسیٰؑ کے حواریوں کے اس وقت کے جذبات و کیفیات کی تصویر کشی کی ہے، جب آپؑ نے ان سے کہا تھا کہ ''تم میں سے ہی ایک شخص مجھے گرفتار کروائے گا''۔ ادب بالخصوص شاعری میں تاثراتی نقوش ابھارنے کے لیے انتخابِ الفاظ ایک امتحان ہوتا ہے۔ الفاظ کی معنوی نزاکتوں اور لطافتوں کا خیال رکھتے ہوئے شاعری میں ان کا انتخاب ہو تو تاثراتی نقوش کا ارتسام ہوتا ہے وگرنہ شعر کا معنوی حسن اور تاثر غارت ہو جاتا ہے۔ شبلی نے انیسؔ کے کلام میں ایسے نقوش تلاش کیے ہیں۔ مثلاً

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اور

شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

اوس اور شبنم اگرچہ ہم معنی ہیں لیکن ان کے مناسب نشست سے دونوں مصرعوں کا جو تاثر اُبھر کر سامنے آیا ہے وہ دیدنی ہے۔

ہمارے نعت گو شعراء نے ایسے تاثراتی نقوش قائم کرنے کے جتن کیے ہیں۔ واقعۂ معراج، مسجدِ نبوی کے در و دیوار اور ہجرت و غزوات کے بیان میں بعض شعراء اپنے شدید جذبات و احساسات کا اظہار کرنے کے لیے ایسے مراحل سے گزرے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی نعتوں کی اثر آفرینی میں اضافہ ہوا ہے۔ ان شعراء کے یہاں زبان کی سادگی اور تراکیب کی غیر پیچیدگی تاثراتی نقوش اُبھارنے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔ طلعتؔ سلیم کے یہاں تاثراتی نقوش کے نمونے ملاحظہ ہوں:

کیے تخلیق اللہ نے زمیں پر پھول بوٹے تتلیاں جگنو
کہ آپؐ آئیں تو رنگ و نور کی محفل سجائیں آپؐ کی خاطر
کھلائے جا بہ جا نرگس کے ڈھیروں پھول اس نے باغِ ہستی میں
خبر آئے! کہ آپؐ آئے تو وہ آنکھیں بچھائیں آپؐ کی خاطر

صفوت علی صفوتؔ کی ''مثنوی رسولؐ'' میں ایسے تاثراتی نقوش کی وافر مثالیں مل جاتی ہیں۔ معراج کے سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے وہ فلک اول کی کیفیت کی یوں تصاویر کھینچتے ہیں:

جدھر سے آپ گزرے ہیں فلک کی سیج بدلی ہے
ستارے خود ہی آگے بڑھ کے چادر تان آئے ہیں

شعاعیں آپ کی یہ عرش بھی نہلائے جاتی ہیں
کہ ہم تک شمعِ محفل چشمۂ ایمان آئے ہیں

بسی جاتی ہے ذہنوں میں ہمارے نکہتِ مرسلؐ
گلاب و یاسمین و خوشبوئے ریحان آئے ہیں

عطا روزِ ازل سے بس یہی خواہش ہوئی ہم کو
اس اک شرفِ نظر میں سب نکل ارمان آئے ہیں

ایسے تاثراتی نقوش ڈاکٹر سید تقی عابدی کے نعتیہ کلام میں اپنے وجود کو منوا لیتے ہیں۔ کینیڈا میں مقیم ڈاکٹر سید تقی عابدی کے نعت و منقبت کا مجموعہ ''جوش مؤدت'' کے عنوان سے معروف ہے۔ آج سے بیس تیس برس قبل ان کا نعتیہ مسدس ''وہ میرا نبی میرا نبی میرا نبی ہے'' برصغیر میں کافی مقبول ہوا تھا۔ اس مسدس میں جوشِ مؤدت و عقیدت کے ساتھ تاثر آفرینی کا ایک سیلِ رواں دکھائی دیتا ہے:

اسلام یہی ہے میرا ایمان یہی ہے
سنت ہے یہی اور میرا قرآن یہی ہے
کہتا ہے خدا عرش کا مہمان یہی ہے
جس نے کیا ہم سب کو مسلمان یہی ہے
قدسی کے لحن میں جو عجب خوش لقبی ہے
وہ میرا نبی میرا نبی میرا نبی ہے

۵۔ شخصی تداخل

نعتِ رسولؐ میں شاعرانہ تعلّی کی مطلق گنجائش نہیں۔ کوئی شاعر اگر حسنِ عقیدت کے اظہار میں تعلّی سے کام لیتا ہے تو یہ مدحت طرازی نہ ہوگی بلکہ خود نمائی کے مترادف ٹھہرے گی۔ البتہ نبیؐ سے اپنی نسبت استوار کرنے کے

جذبے کا اظہار، تمنا، خواہش اور حسرت کے ساتھ اشعار میں نمایاں ہو تو یہ خود نمائی تعلّی میں نہیں شخصی تداخل Personal Involvement میں شمار ہوگی۔ یہ جذبہ حبِ رسولؐ سے عود کر آتا ہے، اس لیے خیر و صالحیت کا مرقع ہوتا ہے۔ نعت میں اس طرح کا شخصی تداخل رسول عربیؐ سے نسبت استوار کرتا ہے۔ یوں بھی شدتِ احساس، تضرع و زاری اور کربِ دروں رسول اکرمؐ سے قلبی وابستگی کے غماز ہوتے ہیں۔ یہی عناصر نعت کے تاثر کو بڑھاتے ہیں۔ ان عناصر کے حامل نعتیہ اشعار میں اگر افکار کی گہرائی اور شعریت کا لحاظ بھی شامل ہو جائے تو ایسی نعتوں کا شمار خیر الحدیث میں ہوتا ہے۔ ہماری شاعری میں شخصی تداخل کی مثالیں پائی جاتی ہیں لیکن ایسی مثالیں بہت کم پیش کی جا سکتی ہیں جن میں Personal Involvement کی سطح قلبی وابستگی اور وارفتگیِ شوق تک پہنچتی ہو۔ الا ماشاء اللہ، بعض شعراء کی نعتوں میں یہ سطح بلند نظر آتی ہے۔ ان میں ریا اور دِکھلاوے کے برعکس فطری پن جھلکتا ہے۔ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی نور اللہ مرقدہ، اقبالؔ، ابوالخیر کشفیؔ، مولانا ظفر علی خاں، صبیح رحمانی، حفیظ میرٹھی، بہزاد لکھنوی، ماہر القادری، محسن کاکوری اور امیر مینائی جیسے نعت گو شعراء کے یہاں شخصی تداخل میں وارفتگی اور خود سپردگی کے جذبات اوج پر دکھائی دیتے ہیں۔ ''مدینہ کی جوگن''، ''بلا مورے پیارے''، ''لاج رکھو''، ''راج دلارے'' ''پیا کی گلی یہ جوگنیا'' وغیرہ عنوانات کی نعتیں اس پر دال ہیں۔ دیارِ مغرب میں بسے شعراء کے کلامِ نعتیہ میں بھی شخصی تداخل کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ جیسے:

کاش میں ہوتی، جہاں میں چودہ صدیاں پیشتر
مجھ کو ہوتے میسر دیکھنے وہ ماہ و سال
آپؐ کے قدموں میں جھک کر پیش میں کرتی سلام
آپؐ سے لے کر دعائیں کس قدر ہوتی نہال
(طلعت سلیم)

مجھے مل گئیں نعمتیں سب جہاں کی
مرا نام اُمت میں تری لکھا ہے
میں نامِ محمدؐ پہ قربان جاؤں
مری روح کے واسطے یہ غذا ہے
(آغا محمد سعید)

لیکن صفوت علی صفوتؔ کے یہاں Personal Involvement کی نادرہ کاری کچھ اور ہی رنگ پیش کرتی ہے۔

دربارِ محمدؐ ہے مری آنکھ کے اندر
بیٹھے ہوئے وہ صاف نظر آنے لگے ہیں

لو سانس بھی آہستہ کہ ٹوٹے نہ مرا خواب
سرکارِ دوعالم مرے پاس آنے لگے ہیں

درود ان پہ پڑھ کر کے سو جاؤ صفوتؔ
انہیں دیکھنے ایک خواب آ رہا ہے
بالآخر ڈھونڈ لیں گے محورِ نورِ خدا صفوتؔ
بالآخر نورِ احمد گرد اس محور کے دیکھیں گے

مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ صفوتؔ نے دیارِ مغرب کے نعت گو شعراء سے ہٹ کر بھی کچھ سوچا ضرور ہے اور اپنے نعتیہ کلام کی دیگر نعتیہ کلام سے علیحدہ شناخت کرانے کی کوشش کی ہے۔ معراج ناموں کی قدیم روایتوں سے لے کر عصر جدید کی نعتیہ شاعری میں تجربوں تک ان تمام روشوں سے ہٹ کر ''مثنوی رسولؐ'' دکھائی دیتی ہے۔ گویا شاعر بذاتِ خود نعتیہ ادب میں اپنی علیحدہ شناخت کے خواہاں ہیں۔ اگر صفوت اس راہ دو دم پر استقلال کے ساتھ جمے رہیں اور تسبیحِ ریاضت کے دانوں کو مستقل پھیرتے رہیں تو یقیناً دیارِ مغرب میں نعتیہ شاعری میں ان کی علیحدہ شناخت قائم ہو جائے گی اور ان کا قد بھی بلند ہو جائے گا۔ مستقبل کے اس تارک الدیار شاعر سے ہمیں اُمیدیں وابستہ رکھنی چاہیے۔

☆

- بقیہ -

ثنا خوانی ہمیں بھی آ گئی ہے

سال نوری ہوں جام قنطاری
ہم رہیں آسماں پر بھاری

برق پاشی کیا کریں نیوران
لفظ دھل جائیں حفظ ہو فرمان

پھر زمیں ایک ہو نئی آباد
دھوم اپنی زباں کی ہو استاد

تیری دنیا ہی اور ہو صفوتؔ
عالیہ روح و مسکنِ عظمتؔ

صفوت علی صفوتؔ کے ان اشعار میں عظمت و عالیہ ان کے مرحوم والدین کے نام ہیں۔ ۱۰/ مصرعوں پر مشتمل اس نظم میں انہوں نے جس انداز سے انسانی ارتقاء اور ارتفاع کی تشریح و توضیح کی ہے وہ ایک نقشِ ثبات بن کر رہ گئی ہے اور صفوت علی صفوتؔ کی تمام تر شاعری وقت کی غیر مختتم شاہراہ کا ایک روشن اور تابناک سنگِ میل ہے۔

صفوت علی کا انگریزی اسلوب

پروفیسر مامون ایمن
(نیویارک)

دیگر مخلوقات کی طرح، صفوت علی بھی تقویم کا ایک حصہ ہے۔ اس اعتراف میں ''عدم''، ''حیات''، ''عدم'' ایسے اسرار اپنا وجود منواتے نظر آتے ہیں۔ صفوت بھی اس اعتراف کو ایک حقیقت جانتا اور مانتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اعتراف مجرد ہے کہ اس کی ذات شریکِ محفل ہونے کے باوجود، ہر لحظہ تنہائی کا اعلان بھی کرتی ہے اور ممکنات کے جلو میں اس تنہائی کی تشہیر بھی کرتی ہے۔ محفل میں تنہائی کا احساس ایک بشری جبلت ہے۔ یہ بشری جبلت صفوت کو بھی ''تلاش'' کی دعوت دیتی ہے۔ صفوت کا اندازِ تلاش اس کے ہم عصروں سے مختلف ہے کہ اس کی تعلیم اور تربیت مجوزہ ہم عصروں سے مختلف نہیں۔ وہ دیس کے شب و روز سے بھی آگاہ ہے اور پردیس کے شب و روز سے بھی آگاہ۔ ابلاغ کے ضمن میں، وہ اپنی مادری زبان اُردو کی وسعت اور حسن کا خوب دلدادہ ہے، بجا، لیکن وہ اس زبان کے دائرہ سے باہر بھی سفر کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ اس کی ''اصلیت'' میں پاک و ہند کے نام آتے ہیں۔ وہ ان ناموں کا احترام کرتے نہیں تھکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اس احترام کو خول کا درجہ نہیں دیتا۔ اپنی استعداد کے مطابق وہ خود کو ہر آن امتدادِ زمانہ سے کامیاب مقابلہ کے لیے تیار کرتا ہے کہ یہی امر سرخ روئی کی کلید ہے۔ اس کلید کا ایک نام، انگریزی۔ جی ہاں! انگریزی۔ بحری قزاقوں کی یہ زبان اب دنیا کی زبان ہے۔ صفوت اب شمالی امریکا کے انگریزی دان ملک، ریاست ہائے متحدہ امریکا، المعروف بہ امریکا کا شہری ہے، لہٰذا اب اس کی زندگی انگریزی زبان سے مربوط ہے۔ اب وہ اپنے ماضی کے تحفظ اور نباہ کے لیے اپنے افکار اور احساسات کو اردو زبان کے چاک پر ڈھالتا ہے۔ اس چاک کا رُخ کبھی نثر کی صورت اُبھرتا ہے اور کبھی نظم کی صورت۔ یہ رُخ تشکیک سے دوچار ہوتا ہے تو وہ خود کو نئے ماحول کی ضروریات سے آگاہ کرنے کے لیے، ایک نئی زبان کی اجنبیت کو آشنائی قرار دیتے ہوئے، ایک نئی راہ کا راہی بن جاتا ہے۔ ''نئی راہ'' صفوت کے انگریزی اسلوب کی اساس ہے۔ اس اساس میں گہرائی اور گیرائی کے چھینٹے ہیں۔ ان چھینٹوں میں یادوں کی بارش بھی ہے اور زندگی بسر کرنے کا سیلاب بھی۔ بہ الفاظ دیگر، یوں کہیے کہ صفوت کے نزدیک انگریزی زبان ایک قوت ہے جو اسے ایک خود ساختہ سیلاب سے نبرد آزما ہونے کا جوہر عطا کرتی ہے۔

صفوت کی انگریزی زبان میں تحریریں، تلاش کی چھلنی سے کبھی گم رہی اور کبھی آگہی سے منسوب عوامل چھانتی ہیں کہ احتسابِ ذات کا یہی افضل طریقہ ہے۔ گمرہی اور آگہی نہ ہو تو گمرہی کا وجود بے مقصد ہو جاتا ہے۔ گمرہی اور آگہی بالواسطہ طور پر ''تقویم'' سے مربوط ہے۔ تقویم کا براہِ راست واسطہ بدلتے موسموں سے ہے۔ بدلتے موسم نشیب و فرازِ طلب ہائے حیات کے زاویے متعین کرتے ہیں۔ وہ زاویے سفرِ حیات کے اصولوں اور آداب کے پیامی ہیں۔ صفوت ان پیاموں کی تشکیل الفاظ سے اس طرح کرتا ہے کہ منظر کے ساتھ ساتھ پس منظر بھی دیدۂ دل پر وا ہو جائے۔

صفوت کے انگریزی اسلوب میں ''تقویم'' سے کیا مراد ہے؟ لغوی طور پر یہ لفظ ''سالانہ نظام کار'' ہے۔ اسے ہندی میں ''جنتری/ بہی'' کہا جاتا ہے۔ یہ سامنے کی باتیں ہیں۔ صفوت یہ باتیں آگے بڑھاتا ہے ان باتوں کی وضاحت کرتا ہے اور ان باتوں کو عمرانیات کی رو سے، انسانی زندگی کے رہن سہن سے جوڑتا ہے۔ اس کے نزدیک لفظ ''تقویم'' وہ زمانہ ہے جو ازل سے تا ابد مصروفِ سفر رہے گا۔ اس سفر کا راستہ ''وقت'' ہے۔ خاموشی سے، رُکے بغیر قدم اُٹھاتے رہنے والا وقت۔ وہ وقت جس کا انتظار فرد تو کر سکتا ہے، کرتا ہے لیکن جو خود کسی کا انتظار نہیں کرتا کہ انتظار وقت کی سرشت میں داخل نہیں۔ مجوزہ وقت فرد کو ہر دھڑکن پر نہایت خاموشی سے یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ جنتری/ بہی میں لکھے جانے والے حالات و واقعات پر نظر رکھے، اُن کا تجزیہ کرے، ان میں خفی و جلی مسائل حل کرنے کی سعی کرے، خوش کن اُمور کو آسائش قرار دیتے ہوئے ان کا شکر بجا لائے اور آئندہ زندگی کو درست رکھنے کے لیے اپنی راہ سیدھی کرتا رہے۔ سو یہ کہا جا سکتا ہے کہ صفوت کے نزدیک تقویم/ وقت کا تقاضا ہے کہ فرد اپنی راہ سیدھی کرتا رہے۔ یہ امر دنیاوی علوم اور ان سے منسلک افہام و ادراک سے بالا ہے کہ اس کا براہِ راست رشتہ دینی علوم اور ان سے منسلک افہام و ادراک سے ہے۔ اس رشتے میں حق کا اعتراف بھی ہے اور اعلان بھی۔ یہ رشتہ فرد کو ''اذکار، اعراف'' کی دعوت بھی دیتا ہے اور تعلیم و ترغیب بھی کہ مجوزہ دعوت پر لبیک کہہ کر دنیا و آخرت کی آزمائشوں اور سزاؤں سے بچ کر، فردِ نجات کی راہ پا کر، خود کو ربوبیت کی نظر میں سرخ رو کر سکتا ہے۔ یہ سرخ روئی انسانی زندگی کا مقصد بھی ہے اور مدعا بھی۔۔۔۔ تقویم/ وقت کے درست اتباع کی منزل انسانی زندگی کی سرخ روئی ہے۔ صفوت اس سرخ روئی کی نشاندہی سے اس کی اہمیت اور ضرورت کی وضاحتیں بھی کرتا ہے۔ ان وضاحتوں میں آرٹس اور سائنسوں کو تخاطب کے اضافی عناصر ٹھہرایا گیا ہے۔ کیوں؟ آج کا دور آرٹس کو بھی سائنسوں کی راہوں میں سفر کرنے کا ہنر سکھاتا نظر آتا ہے۔ یہ دور نثر و نظم کو

سائنسی علوم سے ہم کنار ہونے اور ہم کنار رہنے کا اصرار کرتا ہے۔ یہ دور کمپیوٹر اور جدید صنعتوں کا دور ہے۔ بلاشبہ، یہ دور بھی، دیگر گذشتہ ادوار کی طرح، فرد کو ادب سے جڑا رکھنا چاہتا ہے تاکہ حواسِ خمسہ ماحول سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں، زندگی رنگوں، خوشبوؤں، احساسات، اصوات اور لذتوں سے معمور ہوتی رہے۔

صفوت حواسِ خمسہ کو اصول ہائے صحت سے نزدیک تر رکھنا چاہتا ہے۔ یہ بھی ایک طرفہ تماشا ہے کہ انسان تحقیق و تجویز سے پرانے امراض پر قابو پانے میں کامیاب اور اُمید کن ہوتا نظر آتا ہے تو دوسری جانب نئی نئی ترقیاں اسے نئے نئے امراض و مسائل میں اُلجھاتی جاتی ہیں۔ صفوت اب امریکا میں رہتا ہے لہٰذا اس ضمن میں اس کی بنیادی توجہ اسی خطۂ ارض کی جانب ہے۔ امورِ صحت کے تعلق سے وہ جسم کو بھی زیرِ بحث لاتا ہے اور ذہن کو بھی۔ اُس کے نزدیک، ذہنی درستی اتنی ہی ضروری ہے جتنی جسمانی درستی۔ وہ جسم اور ذہن کی گفتگوؤں میں معاشی خوشحالی، سماجی رفاہ اور انسانوں کے درمیان صلح اور قرب ایسی ضروریات کی اہمیت بھی بیان کرتا ہے۔ حیاتِ بشر کے حوالے سے اس کا دائرہ بیاں صرف اس دنیا تک محدود نہیں۔ علمِ طبیعیات کے ایک سنجیدہ طالب علم (اور استاد کہ اُس نے اِس مضمون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری امریکا میں حاصل کی ہے) کی حیثیت سے وہ اس دنیا کا رشتہ کائنات میں موجود، فی الوقت معلوم دنیاؤں سے جوڑنے کی سعی کرتا ہے۔ اس سعی میں وہ قدماء اور ہم عصروں کی خدمات کا ذکر بھی کرتا ہے اور اُن کی خدمات کا اعتراف بھی۔ علم طبیعیات کے ایک فعال، متجسس ذہن کے حامل فرد کی حیثیت سے وہ اپنی ذات کو ''ماحول'' کا ایک قریبی رکن کہتا ہے۔ یہ رکن افلاک کے ہر ستارہ، ہر چاند اور ہر سورج سے ایک قریبی، بامقصد اور ترقی پذیر نسبت رکھتا ہے۔ یہی نسبت اُسے ارض و سماوات کے علوم سے رشتہ استوار کرنے کی دعوت دیتی رہتی ہے۔ اس دعوت سے سکون کی تلاش جلا پاتی ہے، بجا، لیکن یہ جلا بذاتِ خود تہہ دار بے قراریوں سے معمور ہے کہ ہر انسانی نسل قدم قدم پر نئی آزمائشوں، ضروریات، واقعات، حالات اور انجانے سوالات سے دوچار ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال انسانی زندگی کا بہ یک وقت المیہ بھی ہے اور مژدہ بھی۔ صفوت اس المیہ کی آنکھوں میں مژدہ کی چمک دیکھتا ہے۔ وہ چمک اسے تخلیقی سفر پر آمادہ رکھتی ہے۔ مجوزہ آمادگی صفوت کو دین کی وہ دین ہے جس پر وہ نازاں و فرحاں ہے۔ اُسے بہ ہر صورت یہ اعتراف ہے کہ اُس کا دین ہی اُسے راہِ راست پر یوں محوِ سفر رکھتا ہے کہ وہ انفرادی طور پر ربّ العزت کی ذات سے منسوب صفات کا اعتراف بھی کرے اور تعریف بھی تاکہ اس کی زندگی حقیقتِ حق کی روشنی سے خود کو یوں پُر نور کرے کہ زمانہ بھی اس سے مستفید ہو یعنی فرد اور سماج ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ رہیں، آشنا بن جائیں۔ اس آشنائی میں احترام کا عنصر ہے۔۔۔۔ یہی عنصر حیات کو رہِ نجات کی مسرت عطا کرتا ہے۔

عین نوجوانی میں، پاکستان سے امریکا آنے والا صفوت قدم قدم پر دونوں ممالک کی توصیف کرتا ہے۔ اُسے پاکستان اس لیے عزیز ہے کہ وہاں اُسے دینِ اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی۔ اُس نعمت نے اُس کی زندگی کے شب روز کو ایک باضابطہ، باقاعدہ، بامقصد سانچہ میں ڈھالا تھا۔ سو وہ ربّ کائنات کا ذکر بھی کرتا ہے اور تعریف بھی کہ یہی افعال تعلیماتِ اسلامی کا ماحصل ہیں۔ دوسری جانب، وہ اپنے نئے ملک امریکا میں قیام کو ایک خوش آئند فیصلہ قرار دیتا ہے۔ یہاں رہ کر وہ اس ملک کی سلامتی اور ترقی کا خواہاں اور پیامی ہے۔ یہاں وہ مذہبی طور پر امیر ہے اور معاشی طور پر رئیس۔

صفوت یہ بات اصرار کے ساتھ کہتا ہے کہ امریکا اور دیگر ممالک کی فلاح صرف اور صرف اسلام میں مضمر ہے۔ اس فلاح کو وہ انسانیت کے لیے ایک نیا نظامِ کار گردانتا ہے۔ مجوزہ نظامِ کار ہمہ جہت ہے لہٰذا صفوت کے اصرار میں اعتماد بھی ہے۔ یہ نظامِ کار فرد کو اپنی ذات سے آشنائی اور آگاہی کے لیے تیار کرتا ہے۔ فرد اپنی ذات سے آشنا اور آگاہ ہو کر ہی اپنی ضروریات پوری کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے، اپنے مسائل حل کرنے کی سعی کر سکتا ہے اور وقتاً فوقتاً ذہن اور معاشرے میں اُبھرنے والے سوالات کے جوابات تجویز کر کے حیات کو امن اور مسرت سے معمور کر سکتا ہے۔

اسلامی تعلیمات کو پیشِ نظر رکھ کر ایک نظامِ کار تجویز کرنے کی سعی میں کامیابی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ موجودہ شمسی اور قمری نظام ہائے کار حد بندیوں کے باعث رکاوٹوں کا شکار ہیں۔ مجوزہ نظامِ کار انسان میں اندرونی طور پر پائے جانے والے فطری، طبعی میلانات کا سرچشمہ ہے۔ یہ سرچشمہ ربّ العزت کی جانب سے اُترنے والی الہامی کتاب قرآن اور رسول محمدؐ کی تعلیمات کا مرہونِ منّت ہے۔ لہٰذا اسے مسلسل آگاہی اور ارتقاء کا سرچشمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ نیز مجوزہ نظامِ کار ماضی سے یکسر روگردانی کا سبق اس لیے نہیں دیتا کہ ماضی میں روشن اوراق بھی پائے جاتے ہیں۔ یہودیت اور عیسائیت کی تعلیمات برحق ہیں گو اُن پر رہِ راست سے بھٹکنے کے جائز الزامات بھی ہیں۔ ان الزامات کی تائید کے ساتھ ساتھ دفاع کے طور پر بدلتے زمانوں اور ضروریات کے حوالے بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ اسلام کی ہمہ جہت اور ہمہ وقت تعلیمات بدلتے زمانوں اور ضروریات کے قدغنوں سے آزاد ہیں۔ یہی آزادی وجودِ اسلام کو ازل سے تا ابد ناگزیر قرار دیتی ہے۔

تنگیٔ وقت کے باعث، مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ صفوت کی انگریزی تحریروں میں ''وقت'' کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ وقت کی سرخ روئی بشر کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام عالمی رفاہ اور صلاح کا مذہب ہے جو راستی کے ذریعے بنی نوع انسان کو سلامتی اور مسرت کا پیام دیتا ہے۔ اس پیام میں ''مسلسل آگاہی'' کا جوہر ہے۔ یہ جوہر صفوت کے انگریزی اسلوب کا انسلا کی عنصر ہے۔ اس عنصر میں دین بھی اور دنیا بھی کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی سعی عبث ہوگی۔

☆

''سفر یہ مختلف ہے''

غلام مرتضیٰ راہی
(فتح پور، بھارت)

صفوت علی صفوت امریکا کے بیحد ممتاز اور سربرآوردہ ادیب و شاعر ہیں۔ انہوں نے انگریزی میں ISLAM IS THE ،TIAMBIC ،FUTURE ،PRESIDENT OBAMA ،MARS اور اردو میں ''مثنوی وقت''، ''مثنوی رسول'' اور ''سوادِ حور'' جیسے ادبی سائنسی اور مذہبی نہج کے فن پاروں میں شاعری کے نئے آفاق روشن کر کے اپنی غیر معمولی تخلیقی توانائی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ''فکر فردا'' (مضامین کا مجموعہ) سے بھی صفوت کے مفکّر، مدبّر اور صاحبِ طرز انشاپرداز ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

صفوت علی صفوت امریکہ کے شہری ہیں، ان کا تہذیبی ماحول بظاہر مختلف ہوسکتا ہے مگر باطنی طور پر ان کے رگ و ریشہ میں روحِ مشرق، خون کی طرح رواں دواں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف کی زبان شیریں و پاکیزہ ہے، اظہار میں ندرت ہے، سوچ میں ارتفاع ہے، نئی جہتوں کی تلاش ہے اور یہی نہیں بلکہ نئی جہتوں کی فتوحات بھی شامل ہیں۔ ان کی نثر و نظم میں انفرادیت ہے جہاں ان کی جولانی طبع قابل دید ہے۔

صفوت علی صفوت نے شعر میں ''مثنوی وقت''، ''مثنوی رسول'' اور ''سوادِ حور'' جیسی شاہکار کتابیں تخلیق کی ہیں، جنہیں بالخصوص برصغیر کے اساطین و اکابرین ادب نے بنظر استحسان دیکھا ہے اور سراہا ہے۔ ''فکرِ فردا'' نثری مضامین پر مشتمل ایک اہم تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مختلف النوع موضوعات پر فکر انگیز مقالات سپرد قلم کیے ہیں اور اہل نظر سے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ قدیم علوم ہوں یا جدید سب پر صفوت کی گہری نظر ہے۔ ''مثنوی وقت'' میں انہوں نے جو عقدہ کشائیاں کی ہیں، ادب میں اس کی مثالیں شاذ ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ''مثنوی رسولؐ'' حضور اکرم کی سوانح ہے جسے بالکل نئے انداز و آہنگ میں قلمبند کیا گیا ہے۔ اس میں تاریخ کے ان تمام پہلوؤں کو سمیٹا گیا ہے جو نظر سے اوجھل رہے ہیں اور جن کی ہماری معلوم دنیا کو اشد ضرورت تھی۔ ''سوادِ حور'' ان کی نظم و غزل کی تخلیق ہے جس میں غزل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں عہد حاضر کی تمام روشنیاں موجود ہیں۔ بنیادی طور پر صفوت کا میدان سائنس ہے۔ انہوں نے اس خشک مگر عہد ساز موضوع کو اپنی تخلیقیت کی رعنائی دے کر بے حد معنی آفریں اور پُرکشش بنا دیا ہے۔ تفکر اور تجسس کے اس میدان میں وہ مرزا غالبؔ کی روایت کی توسیع کرتے نظر آتے ہیں جہاں پانی کا ہوا ہو جانا باور کیا گیا ہے۔ صفوتؔ کے شاہکاروں کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ایسے لوگ تکلیف جہاں گردی بہت کم کرتے ہیں اور ذرّے میں ہی نبضِ دنیا دیکھنے کے ہنر سے واقف ہوتے ہیں۔

صفوت علی صفوتؔ کی شاعری قادر الکلامی کا شاہکار ہے۔ مثنوی جیسی صنف سخن جو مدت ہوئی ماضی کی گرد میں پنہاں ہو چکی ہے، اسے باہر نکالا، اسے نئے خدوخال دیئے، اس کے لیے ان جہانوں کی تلاش کی جو اس سے پہلے نادیدہ و ناآفریدہ تھے۔ چنانچہ ''مثنوی رسول'' کی طرف جب ہم نظر اٹھاتے ہیں تو وہاں ایک مقدس اور سحر آفریں دنیا نظر آتی ہے۔ اس مثنوی کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے جس کا یہ مطلع بڑی اہمیت کا حامل ہے:

سربلندی کی باتیں بھی ہوں گی کبھی عجز کی پہلے معراج ہونے تو دے
بے نیازی کے سب راز کھل جائیں گے سرمراسر نگوں آج ہونے تو دے

اس کے بعد مثنوی کا آغاز ہوتا ہے۔ پوری مثنوی ''بحر ہنرج مثمن سالم'' میں تخلیق کی گئی ہے جو بہت غنائیت اور سادگی کی حامل ہے۔ اساتذہ نے اس بحر کا غزل میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثنوی میں بھی ابوالاثر حفیظ جالندھری کا ''شاہنامہ اسلام'' اسی بحر میں ہے۔ رسولِ اکرم کی منظوم سوانح بہت سے شعرا نے لکھی ہے، جن میں بعض کافی طویل اور ضخیم ہیں۔ صفوتؔ کا کمال فن یہ ہے کہ انہوں نے بہت ہی کم اشعار میں بہت سی رمز آمیز باتیں کہہ دی ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ ہے مگر معنوی سطح پر خاصا عمیق اور پیچیدہ ہے۔ چونکہ صفوتؔ کا علم کائنات کافی وسیع و عریض ہے، اس لیے ان کے یہاں مثنوی میں نیا رنگ جھلکتا ہے۔ دیکھئے معراج کے واقع کی طرف اشارہ کرتے یہ اشعار:

سفر یہ کیوں ضروری تھا لکھا دیں یا رسول اللہ
کہ اب یہ راز بھی کھل کر بتا دیں یا رسول اللہ
ہماری بھی یہ خواہش ہے خلا میں گھوم کر آئیں
وہاں بھی آپ ہی کے نقشِ پا ہم چوم کر آئیں
خلا سے بھی تو ہم خود بھی جڑے ہیں یا رسول اللہ
خیالوں سے بھی ہم آگے اڑے ہیں یا رسول اللہ

اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جدید ایجادات و انکشافات کے حوالے سے بات کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کرۂ ارض پر بسنے والی نوع بشر کس طرح خلاء سے وابستہ ہے۔ گویا اس کی بود و باش خلا میں ہے۔ زمین بھی تو خلا کا ایک سیارہ ہے، جس طرح چاند سورج اور ستارے ہیں اور یہ کہ انسانی زندگی کے لیے جو بھی کچھ ضروری ہے زمین پر موجود ہے۔ اگر دوسرے سیاروں پر مخلوق ہے تو اس کے جینے کے سب وسائل وہاں مہیا ہوں گے۔ صفوت نے وقت کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسی کے تناظر میں وہ پوری کائنات کو دیکھتے ہیں، پرکھتے ہیں اور سوالات قائم کرتے

ہیں۔وہ ایک متجسس ذہن رکھتے ہیں۔خلاء بسیط ہے، بے کراں ہے، پھر بھی ایک زنداں ہے۔صفوت کے سینے میں یہی تڑپ ہے کہ ان پر وہ جہان بھی منکشف ہوں جو ابھی تک انسانی دسترس سے دور ہیں، نا آفریدہ تو نہیں نادیدہ ضرور ہیں۔مثنویٔ رسول اور مثنویِ وقت میں انہوں نے اس کرب کا اظہار کیا ہے۔''مثنوی رسول'' میں انہوں نے امت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی ہے۔مثنوی میں انسان کے اشرف ہونے کا ذکر بھی ہے اور ابدی زندگی کی طرف اشارہ بھی۔ان میں انواع واقسام کی لذتوں کا بیان بھی شامل ہے۔تخلیق انسانی کو کائنات کے وجود کے لیے ناگزیر بتاتے ہوئے کہیں کہیں بے باکانہ انداز میں گفتگو بھی کی ہے۔ظاہر ہے تخلیق انسانی کے متعلق جو انکشافات ہو رہے ہیں اور جو ایجادات سامنے آ رہی ہیں ان سے صفوت علی صفوت اچھی طرح واقف ہیں اور وہ اسی تناظر میں انسانی زندگی کو دیکھتے ہیں۔انہیں معلوم ہے کہ ارتقاء کیا اور پستی کیا ہے۔اس کتاب کے مقدمے کے ابتدائی حصّے میں انہوں نے کہا ہے:

''انسانوں میں عظیم ترین ہستی پر قلم اٹھانے کے لیے علم ہی نہیں عشق بھی لازمی ہے۔عشق ہی نہیں کشف کی سیڑھیاں بھی طے کرنا ضروری ہے۔عالمِ خیال میں اس ہستی سے رجوع کرنا بھی شرط ہے۔اس عالم سفر میں وہ ہدایات بھی حاصل کرنا ضروری ہے جس کے ساتھ موجودہ نسل کو آگے بڑھنا ہے اور یہی ہدایات اجتہاد کا درجہ رکھتی ہیں''

اس کتاب کا مختصر مقدمہ ''مثنوی رسول'' کی افہام وتفہیم میں معاون ہے۔صفوت کو جن علوم پر دسترس ہے وہ اس کتاب سے نمایاں ہیں۔چونکہ وقت صفوت کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے اس لیے مثنوی رسول میں معراجِ رسول کے حوالے سے بہت اہم باتیں کہی گئی ہیں اور تخلیقِ انسانی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح کہ تمام تاریخ سمٹ کر آ گئی ہے مگر انتہائی حزم واحتیاط کے ساتھ۔عشقِ رسول کی تمام منزلوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی گئی مگر دل کی باتیں بیان کر دی گئی ہیں:

سفر یہ مختلف ہے آپ کو آگے تو جانا ہے
حیات برزمیں پھر وقت میں پیچھے بھی آنا ہے

نظامِ زندگی میں مختلف ہیں عرش وحشت کے
لہٰذا کام بھی کچھ اور ہوتے ہیں ضرورت کے

سوال اٹھتا ہے پہلے بھی کہ روحانی کہ جسمانی
خدا کے سامنے کیسے یہ پہنچا جسمِ انسانی

اجازت دیجیے یہ بھی بیاں ہو یا رسول اللہ
جو مجھ پر کشف ہے لب پر عیاں ہو یا رسول اللہ

ہے دونوں طرز کی معراج جسمانی و روحانی
مری تشریح اب شاید سمجھ لے نوعِ انسانی

خدا کا فضل ہر اک معجزہ ہے گر نہ سمجھیں ہم
سمجھ لیں گر تو پھر سائنس میں ہے تجربہ پیہم

بہت ہی نازک مسئلہ ہے جسے صفوت نے انتہائی حسن وخوبی اور حزم واحتیاط کے ساتھ بیان کیا ہے اور اپنے علم کی وسعت سے سمجھانے کی سعی کی ہے۔صفوت نے وقت کے شہپروں کی جولانی و برق رفتاری کے حوالے سے بات کی ہے۔

''مثنوی وقت'' صفوت کی نادر البیان مثنوی ہے جو اردو میں علم و ادب کا ایک شاہکار ہے۔وقت کی تاریخ بیان کرنے میں بہت سے علماء ادب آگے آئے ہیں مگر وقت کی حدوں تک کوئی پہنچتا نظر نہیں آتا۔وقت کس طرح پیدا ہوا، کس طرح اس کی ترتیب وتشکیل ہوئی، اس کی تاریخ کیا ہے، اس کے عناصر کیا ہیں، اسٹیفن ہاکنگ نے ''بریف ہسٹری آف ٹائم'' قلمبند کی تھی پھر اس کے بعد اس نے اپنے ہی کچھ نظریات سے انحراف بھی کیا تھا مگر بنیادی باتیں وہی تھیں۔اردو میں صفوت علی صفوت کی ''مثنوی وقت'' میں سوا اس موضوع پر کہیں کچھ نظر نہیں آتا۔وقت ایک پُر اسرار طاقت ہے جو پوری کائنات پر حکمراں ہے۔اس کتاب میں وقت کی گردش اس کے اثمارِ تلخ وشیریں پر کھل کر بات کی گئی ہے۔چونکہ کائنات کی ہر چیز وقت کی تابع ہے، اس لیے سب کچھ انہیں مناظر کے تحت ظہور پذیر ہوتا ہے۔انسانی جبلت اور فطرت بھی وقت سے تعلق رکھتی ہے۔حکومت، معاشرہ، بہار، خزاں، تعمیر وتخریب، تخلیق تشکیل غرضیکہ تمام تر چیزیں وقت کے دائرے میں گردش کرتی ہیں۔گویا وقت کی گرفت میں جکڑا ہوا ہر لمحہ قیدی ہے مگر انقلاب آفریں ہے۔اس کتاب پر سید ضمیر جعفری اور مامون ایمن جیسے اساطین ادب کی آراء موجود ہیں لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ خود مصنف اپنی کتاب کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

''کائنات کی تخلیق اور اس کی تباہی کی داستان ''مثنوی وقت'' کی صورت میں میری سائنسی شد بد کی بنیاد پر اہلِ نظر کے سامنے ہے۔سائنس اور ادب کا امتزاج ایک مشکل کام ہے لیکن طبعِ دشوار پسند نے مجھے انہیں گھاٹیوں میں اتار دیا ہے۔اس سے قبل ایسی کوئی مربوط کاوش شاعری میں اگر موجود بھی ہے تو وہ میری نگاہ سے نہیں گزری۔پھر یہ کہ غور وفکر کے راستے بھی تو اپنے اپنے ہوتے ہیں۔مجھے اپنے تجربے کے حوالے سے دو قسم کی مشکلات کا سامنا تھا جن کو میں زبان اور وجدان کی مشکلات کہوں گا۔زبان کی چٹانوں کو جہاں تک ممکن تھا

پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں میرے بس میں نہیں رہا اصل لفظ کو استعمال کیا ہے اور انہیں ابلاغ ولسانی توسیع کے لیے ضروری سمجھا۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ اس مثنوی میں مذہب اور سائنس کو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنا تھا جس کو بدقسمتی سے آگ اور پانی کا امتزاج بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ فطرت کے دروازے دونوں طرف ہی کھلتے ہیں۔ مسئلہ دونوں کے درمیان ربطِ خفی کی شناخت کا ہے۔ میں اپنی توسیع کی حد تک مذہبی مباحث کا طالب علم رہا ہوں تا کہ ہر ممکن احتیاط کے باوجود اگر اس ضمن میں کہیں سلوٹ محسوس ہو تو اس کے ازالے پر مجھ سے زیادہ کوئی دوسرا آمادہ نہ ہوگا''۔

''مثنوی وقت'' میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سائنس انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہے، سائنس مذہب کی راہ میں حائل نہیں ہے بلکہ ارتقاءِ فکر و ذہن عطا کرتی ہے۔ یہ مثنوی بلا شبہ ادب کا شاہکار ہے۔ اردو میں دور دور تک اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ دونوں مثنویاں صفوت علی صفوتؔ کو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

''سوادِ حور'' صفوتؔ کی تازہ موقر شعری تخلیق ہے جو غزل، نظم، حمد، نعت، منقبت جیسی گوناں گوں اصنافِ سخن پر مشتمل ہے۔ ''سوادِ حور'' کی غزلیں اور نظمیں آج کے دور پُر آشوب سے پوری طرح جڑی ہوئی ہیں، ان کی اہمیت اور معنویت مسلّم ہے۔ غزلوں اور نظموں میں فکری دبازت اور دروں بینی ہے، اظہار میں برجستگی اور دلاویزی ہے۔ ایک مستقل تڑپ، کسک اور آفاقی دردمندی کی زیریں لہر ہے۔ صفوت کی شاعری میں جمالیاتی روّیہ بہت ٹھوس اور واضح ہے، اس میں ان کا شخصی اندازِ فکر اور جذباتی رجحان، حسن اور سچائی کے پیرائے میں ظاہر ہوئے ہیں جن پر ان کے اسلوب کی چھاپ ہے۔ اس مجموعے میں کلاسیکی آداب کو فنکارانہ شعور، وفور اور فنّی نظم وضبط کے ساتھ برتنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس میں اسلوب اور معنی کے نئے اور مختلف العباد Dimensions ابھرتے محسوس ہوتے ہیں جو قاری کو حیرت زا مسرت اور بصیرت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ صفوتؔ کے مضطرب اور متجسس ذہن کو موجودات اور مظاہر سے شعر اخذ کرنے کی زبردست قوت متخیلہ ودیعت ہوئی ہے۔ نت نئے تجربات اور مشاہدات کے تجسس میں وہ ناہموار زمینوں اور علاقوں میں قدم رکھنے سے گھبراتے نہیں ہیں۔ انہوں نے نئی اور نامانوس لفظیات، تراکیب، اصطلاحات، تلمیحات اور اساطیر کا بے دریغ استعمال کیا ہے تا کہ شاعری کی رسمی اور روایتی حدود میں وسعت پیدا کر سکیں۔ دراصل اجتہادِ صفوتؔ کی شاعری کا جوہر اصل ہے۔

''سوادِ حور'' کا شاعر ایک منفرد اور بلاشرکتِ غیرے شخصیت کا حامل کردار ہے۔ اس کے شعری اظہار میں ایک طرح کا ترچھا پن ہے۔ زبان اور بیان کا ایک ایسا انصرام ہے جو رمز و ایما اور ایہام و ابہام کے تانے بانے سے مرتّب ہوا ہے جو قاری کو اسرارِ معنی کی پرتوں کو کھولنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ ''سوادِ حور'' نے قاری کو شاعری کے ایک نئے اور انوکھے ذائقے سے آشنا کیا ہے۔

"O God"

O God! Change my fear of stark loneliness on Mars into love! Have mercy on me and make me among the greatest of the explorers. Make me remember what I have forgotten and give me knowledge of what I have become ignorant of. O God! Make us not the enemy of the other on this planet; make Mars habitable and provide us all the provisions for a pious living as you did for many of us on Earth; raise our conscious on Mars so we don't repeat the mistakes we made on the Planet Earth. O God! Let the soil produce green plants and the meanings of Mars become peace; O Almighty! Let there never be a war on this Planet!

Amen!

(A wishful Pray from the Author of "Mars")

''ہے دوام بھی اسی ذات کو''

ف۔س۔اعجاز

(کول کتہ، بھارت)

''مثنوی وقت'' اس کتاب کی حیثیت گرچہ بقول مصنف ایک کتاب شعر کی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اندرونِ کتاب ایک کائنات بسی ہوئی ہے۔ کلاسیکی مثنویاں، داستانی یا حکایتی عنصر کی وجہ سے لوگوں کے لیے دلچسپ بن گئی ہیں۔ جیسے دیا شنکر نسیم کی ''گلزار نسیم'' مرزا شوق کی مثنوی، میر تقی میر کی ''زہر عشق'' غواصی کی ''سیف الملوک'' سراج اورنگ آبادی کی ''بوستانِ خیال'' وغیرہ۔ مفرد اشعار کی مثنویت (دو مصرعی خصوصیت) نہ صرف یہ کہ داستان کے گرد ایک طلسمی ہالہ بنتی چلی جاتی ہے بلکہ نہاں مفہوم کی ترسیل کو آسان اور اثر انگیز بھی بناتی چلی جاتی ہے۔ شاعر اگر پُر گو ہو اور تخیل اور زبان پر حاوی ہو تو مثنوی بہ یک وقت افسانہ اور افسوں سے لبریز ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس صنف کو موجودہ شعراء نے نظر انداز کر رکھا ہے ورنہ یہ وہ صنف ہے جو شاعر کے غایت کی معروضی کفالت کرنے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔

ایسے میں ایک شاعر صفوت علی صفوت نے ایک نئے مقصد کے تحت اس صنف کا انتخاب کیا جو کلاسیکی مثنویوں کے مقاصد سے الگ ہے۔ صفوت سائنسداں شاعر ہیں۔ وہ امریکہ کی ایک شمالی ریاست کنے ٹی کٹ میں مقیم ہیں اور نیویارک شہر کی مشہور ٹیلی فون کمپنی ''بل اٹلانٹک'' کے شعبۂ مواصلات میں کمپیوٹر کے ماہر کی حیثیت سے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔

مثنوی کہنے کے لیے اوّلاً تو وہ موضوع ہونا چاہیے جسے تسلسل سے بیان کرنا ضروری ہو یا جو بہ الفاظِ دیگر ایک بیانیہ تسلسل کا محتاج ہو۔ اگر شعراء اس صنف کو معمولاً اختیار نہیں کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ان کے پاس ایسے موضوعات نہیں ہیں جنہیں وہ صراحت سے بیان کریں۔ صفوت علی صفوت نے جو موضوع لیا ہے وہ مثنویوں کے روایتی عشقیہ، متصوفانہ یا ناصحانہ موضوعات سے جدا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس صنف کے لیے ان کی اپنی دریافت ہے۔ انہوں نے وقت کو موضوع بنایا ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کو ایک تسلسل میں لے کر مثنویِ وقت تحریر کی ہے۔

وقت کوئی جامد شے نہیں ہے۔ تحرک اور رفتار نے ازمنہ کو انسان اور کل تخلیقِ خداوندی یعنی کائنات کی مرحلہ وار داستان بنا دیا ہے۔ ازل اور ابد کے روابط ظاہری بھی ہیں اور مبنی بر اعتقادات بھی۔ موجودات کی شروعات فلسفہ انگیز خیالات سے ڈھکی ہوئی ہے۔ ''نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا'' صفوت علی صفوت نے بعد از حمد، مرسلِ ازلؐ سے پہلے کے پس منظر کو یوں بیان کرنا شروع کیا ہے۔

ابھی وقت پیدا نہیں ہوا، ابھی لفظ کُن ہی کہا نہیں
ہیں تصوراتِ الوہیت ابھی اور کچھ بھی بنا نہیں

بوقتِ تخلیقِ ارض وسماء نہ وقت کا کوئی جواز تھا اور نہ اس کی پیمائش کی ضرورت سمجھی گئی، نہ ناپنے کا آلہ ایجاد ہوا۔ مثنوی اس اسرار آفرینش کے ذکر کے ساتھ آگے بڑھی ہے۔ عموماً ادب میں وقت کو ایسی طاقتور تباہ کن شے بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ آدمی اس سے ڈرے۔ اس میں معتقدات اور موروثی توہمات بڑی وجہ بنتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ صفوت علی صفوت نے شاعری میں مذہب اور سائنس کو متخالف بننے نہیں دیا بلکہ دونوں کو اثباتی رنگوں اور مفاہمتی صورتوں میں پیش کیا ہے۔ اور وقت کے حرکی کردار کو اُجاگر کیا ہے۔ اس میں مذہب سائنس کے آڑے نہیں آتا۔ قرآن شریف میں سورۂ عصر میں زمانے کی قسم کھائی گئی ہے۔ وقت کا کردار نہایت اہم اور برحق ہے۔ صفوت نے اس کی اپنے ایمان سے تائید کی ہے۔ سب سے پہلے تو شاعر اس وجود کا سپاس گزار ہے جسے ''وجود وجہِ وجود'' کہا جاتا ہے۔ پھر اس کائنات کی ہتھیلی پر وقت کے مقدرات کی جو لکیریں وضع ہوئی ہیں ان میں نور و نار، آب و غبار اور مادّوں کی شناخت از روئے علمِ طبیعیات اور فزکس بڑی خوبی اور اُپج کے ساتھ کی گئی ہے۔ جس سے موجوداتِ عالم کے حرکت و استقرار تاریخی پس منظر کو لیے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ کرۂ آب کو ''جواز سہو وجود'' قرار دیا ہے۔ شمس و قمر نے گردش کرنا شروع کی، آسمان نے نیلگونی اور سرمئی رنگ اختیار کیے اور زمین کی جنبش کو شاعر نے اس طرح وقت کے پیمانے سے ماپا:

یہ زمیں چلی تو یہ رم کی رو میں ہزار صدیاں نکل گئی
یہ کئی خلائیں نگل گئی، یہ کئی مدار بدل گئی

شاعر نے ''اسے عبور وقت کی بات'' کہا ہے اور کششِ مرکز ارض اور ثقل کو ڈائناسور کے عہد قدامت سے تا حال نیوٹرون، کاربن، کوارک، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ جیسے سائنسی مظاہر کو انسانی شعور کی ترقی سے تعبیر کیا ہے اور اسے ''انٹلکٹ'' گردانا ہے اور جسم انسانی کے حیاتیاتی خلیوں کو ''ممکناتِ صفات'' کا مجموعہ قرار دیا ہے:

ترے خون ہی میں رواں دواں ترے ممکناتِ صفات ہیں
یہ جو سرخ اور سفید ''سیل'' ہیں لہو کے سیلِ حیات ہیں

خون کے فشار اور دوران کو نظامِ تنفس کے عملی اثرات سے بڑی خوبصورتی سے مربوط کیا گیا ہے۔ پھر وقت کی اونچی پرواز اور غیر ارضی (فلکی) سیارگان کی تسخیر کے ضمن میں میجر گاگرن، شپر ڈ اور نیل آرم اسٹرانگ (جنہوں

نے خلاء کو پہلی بار مسخر کیا) کا ذکر چھیڑ کر شاعر آناً فاناً معراجِ رسولؐ کا حوالہ دیتا ہے:

نہیں سوچ صرف یہ مغربی کہ خلاء سے گزرے رسولؐ بھی
یہ جہاز اور شٹل سبھی ہیں اسی براق کی پیروی

کہیں اُڑ کے پہنچے ملائکہ، کہیں سنگ ہے کسی میل کا
کہیں تذکرہ ہے بہشت کا، کہیں صور اسرافیل کا

یہاں مثنوی کچھ دیر قیام کرتی ہے اور ۱۸ اشعار کی ایک مرصع غزل کو راہ دیتی ہے جس کی پہنائی میں محبوبِ خدا نبیؐ آخر الزماں ﷺ کی حسین و جمیل موجودگی کے سائے جھلملا اُٹھتے ہیں:

کبھی وقت پیچھے چلا اگر تو میں جا بسوں گا حجاز میں
جو اذان ہوگی بلالؓ کی تو رسولؐ آگے نماز میں
انہیں چوم لوں گا عقیدتاً یہ کہوں گا ان سے میں رِقّتاً
کہ حضورؐ آنکھیں تڑپ رہی ہیں سبھوں کی وقتِ دراز میں

پئے حضورؐ یہ کہنا کہ سبھوں کی آنکھیں وقتِ دراز میں تڑپ رہی ہیں تکلم انکسار اور محبت کی بے تابی کی دلیل ہے۔ یہاں ''وقتِ دراز'' کی ترکیب لاجواب ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا ذکر ایک شعر میں آیا ہے۔ اس میں الفاظ کی موزونیت دیدنی ہے:

ذرا اور آگے چلیں گے جب تو ملیں گے عیسیٰ جلوہ نشیں
میں یہ پوچھ لوں گا نبی ہیں یا کہ خدا لباسِ مجاز میں

حضرت عیسیٰ کے لیے ''خدا لباسِ مجاز میں'' کے الفاظ مسیحی عقیدے کا فطری اظہار بن گئے ہیں جس سے تکریم شعری میں بلیغ اضافہ ہوا ہے۔ زمین اور خلاء میں وقت کی عمروں میں تفاوت کو سائنسی اکتشاف کے ذریعے ایک مصرع میں یوں باندھا ہے:

کہ زمیں پہ وقت ضعیف ہے پہ خلاء میں وقت جوان ہے

اور وقت کی اس تفاوتِ رفتار کو قمر، سعد اور شہاب کی گردش پر محمول کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ خلاء میں تیزیٔ وقت کے جواز پر ابھی ''کسی فارمولے پر غور ہے''۔ صفوت علی صفوتؔ ایک ایسا سائنسداں شاعر ہے جو وجودِ مخلوقات پر پیہم اپنی نظر رکھے ہوئے ہے اور اس کا سائنسی و شعری علم اس کی رہنمائی صانعِ حقیقی کی سمت میں کر رہا ہے۔ آسمان کی گردش، بلندی اور اس کا بلا ستون استقرار و استحکام، زمین کی پستی، دریاؤں کی روانی، نباتات و موجودات کا تنوع، شجر و ثمر کے ذائقے ایک ایسی ذاتِ واجب الوجود میں انسان کے یقین کو پختہ کرتے چلے جا رہے ہیں جو اس دورِ سائنس میں بھی ناقابلِ تردید ہے۔ صفوتؔ کی مثنوی لامکان اور مکان کی سیر کراتے ہوئے مصر و روم، کاشی، اَودھ، بابری مسجد، سومنات مندر وغیرہ وغیرہ کو چھوتی ہوئی نیوٹرون، الکٹران، پلازمہ، کوراک، انتروپی، کلوننگ، مرکری (پارہ) کے تفاعل اور سبب و نتیجہ کا جائزہ لیتی ہوئی خدا کی برتری اور عظمت کے اعتراف پر ختم ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے:

جو یہ فلسفہ سا لگے تمہیں تو وہ فلسفی ہے بہت بڑا
جو دلیل اس میں لگے تمہیں تو وہ منطقی ہے بہت بڑا

آخر میں وقت پھر سوالِ کن فیکون کے تابع نظر آتا ہے۔ شاعر کا فیصلہ یہ ہے کہ:

ہے دوام بھی اسی ذات کو جو مدام جلوۂ طور ہے

مثنوی کے بعد ''توجیہہ مثنوی'' میں صفوتؔ نے اس کا ثبوت بہم کیا ہے کہ وہ خود شناس سخن گو ہے۔ اسے احساس ہے کہ اس نے موضوع کی ضرورت کے تحت سائنسی اصطلاحات و ایجادات کے انگریزی ناموں کو اردو میں بخوبی منتقل کر کے اس زبان کی وسعت میں اضافہ کیا ہے۔ اس نے بابائے اردو امریکہ حضرت مامون ایمن اور ضمیر جعفری مرحوم جیسے ماہر لسان و ادب کی رہنمائی میں کئی سائنسی اصطلاحات کو اُردو قالب میں نرمی سے ڈھال دیا ہے۔ مثلاً ریڈیو کے لیے رادیو، ٹیلی ویژن کے لیے تل ویژن، Entropy کے لیے انا تاروپی، Pulsar کے لیے پلے سار کے متبادل الفاظ نئے تو ہیں مگر نامانوس نہیں لگتے۔ اسی طرح کئی انگریزی الفاظ براہِ راست یا ترجمے کی شکل میں مثنوی میں داخل کیے گئے جن سے اشعار کا آہنگ بگڑ نہیں گیا ہے۔ سہولت اور صحیح رہنمائی کے لیے ایسے الفاظ کا ایک فرہنگ کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ ''توجیہہ مثنوی'' میں ایسے اشعار کی شمولیت شاعری کی خود شناسی پر دال ہے:

پیرایۂ غزل نہیں اس فکر کے لیے
تازہ لغات چاہیے اس ذکر کے لیے

تجھ پر ہوئی ودیعتِ اشعار جاوداں
سائنس کی ہے بات تو سائنس کی زباں

دستِ ہنر میں شوق کا پیمانہ چاہیے
آفاق پر نگاہِ حکیمانہ چاہیے

صفوت علی صفوتؔ ان باطنی فنی اوصاف کے حامل ہیں اسی لیے ان کی چشمِ تحقیق کو باریکی اور گہرائی نصیب ہوئی ہے جس سے یہ مثنوی ایک کشف کے درجے تک جا پہنچی ہے۔ بقول شاعر:

جالا تمہاری آنکھ کا اس طرح سے ہو صاف
کہ ماں کے رحم میں نظر آجائے تم کو ناف

میں نے ان کے شعری اسلوب اور طرزِ ادا کے رسمی ذکر سے گریز کیا ہے کہ یہ سامنے کی باتیں ہیں۔ ان کی اُپج غیر رسمی داد کی مستحق ہے۔

☆

''ثناخوانی ہمیں بھی آ گئی ہے''

عشرت ظفر

(کانپور، بھارت)

صفوت علی صفوتؔ کی شاعری سے متعلق بہت بنیادی رائے جناب سید ضمیر جعفری (مدیر اعلیٰ ماہنامہ چہارسو، راولپنڈی) کی ہے کہ وہ اپنا کنواں خود کھود کر پانی پینے کے قائل ہیں۔ میں اس رائے سے متفق اس نقطۂ نظر سے ہوا کہ جب میں صفوت علی صفوتؔ کی کتاب ''مثنوی وقت'' کا مطالعہ کر رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ میں ایک عظیم الشان دنیا کی سیر کر رہا ہوں جس کے دیوار و در، سقف و بام اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

کم وبیش ایک سال قبل میں صفوت علی صفوتؔ کی کتاب ''مثنوی وقت'' کے ذریعہ شاعری کی ایک نئی دنیا سے متعارف ہوا تھا۔ حالانکہ کتاب کے آغاز میں جناب مامون ایمن کی منفرد و معتبر رائے نے مجھے کافی چونکا دیا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مجھے اُکسایا تھا کہ میں اس کتاب کا مطالعہ کروں۔ جہاں الفاظ کے نرد بانوں سے معنی کے فرشتوں کا نزول ہو رہا ہے اور بساطِ قرطاس پر مہر و ماہ و کہکشاں کا ایک ہجوم ہے۔

''مثنوی وقت'' کا تاثر اب بھی میرے ذہن پر بہت شدید ہے اور میں اکثر اس کے پورے منظرنامے پر غور کرتا رہتا ہوں جس میں زندگی اندیشۂ سود و زیاں سے برتر ہے۔ ایک ایسی زندگی جسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہیں ناپا جا سکتا۔ مگر اب جبکہ صفوت علی صفوتؔ کی کتاب ''سوادِ حور'' میرے ہاتھ میں آئی تو مجھ پر ایک نئی دنیا روشن ہوئی۔ حمد و نعت، غزل، نظم اور رباعی سے مزین صفوت علی صفوتؔ کی فکر گہر ریز کا ایک ثمرِ شیریں ہے اور اقبال کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے۔

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ ہا شکنند آفتاب می سازند

''سوادِ حور'' نے مجھے نشاطِ مطالعہ سے ہمکنار کیا۔ ''مثنوی وقت'' صفوت علی صفوتؔ کی پہلی شعری کاوش ہے۔ ایک مسلسل کتاب جس میں وقت کہکشانی دائروں کی ایک ناقابلِ تسخیر مملکت ہے۔ اس کا لطف یہی ہے کہ اس شعر اب کو جرعہ جرعہ پیا جائے تاکہ وہ رگ و ریشے میں باقاعدہ سرایت کر سکے۔ لیکن ''سوادِ حور'' ایک الگ ہی شاہکار ہے اور بقول غلام مرتضیٰ راہی:

> ''سوادِ حور'' کا شاعر ایک منفرد اور بلاشرکتِ غیرے شخصیت کا حامل ہے۔ اس کے شعری اظہار میں ایک طرح کا ترچھا پن ہے۔ زبان و بیان کا ایک ایسا انصرام ہے جو رمز و ایما، ابہام اور ابہام کے تانے بانے سے مرتب ہوا ہے۔ جو قاری کو اسرارِ معانی کی پرتوں کو کھولنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ ''سوادِ حور'' نے مجھے شاعری کے ایک بالکل نئے اور انوکھے ذائقے سے آشنا کیا ہے۔''

بیان اسالیب اور لفظیات ہی شاعر کو ایک منفرد لہجہ عطا کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں اُردو شعراء بہت ہی کم لفظوں میں ساری عمر شاعری کرتے رہے یا ان کے پاس ذخیرۂ الفاظ نہیں تھا یا پھر وہ اس کے استعمال کے ہنر سے واقف نہیں تھے۔ غزل پر یوں بھی الزام رہا ہے کہ وہ ڈکشن کا محدود دائرہ رکھتی ہے لیکن چند الفاظ کا بار بار استعمال کر کے شعر کی تخلیق کرتے رہنا دراصل کم مائیگی کی طرف ایک واضح اشارہ ہے۔ الفاظ کا تنوع ہو، الفاظ معانی کے حامل ہوں، محض شوکتِ لفظی ہی طرۂ امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔

میں یہاں کسی کو مثالاً پیش نہیں کروں گا۔ حالانکہ اُردو میں نظم گوئی کے حوالے سے ایسے کئی شاعر ہیں جن کے ایوانِ فکر میں پرشکوہ مشعلیں تو روشن ہیں مگر ان کی روشنی بہت پھیکی ہے اور خود کو محدود دائروں میں سمیٹے رکھتی ہے۔ میں نے الفاظ کا بے تکلف استعمال، بے محابا اور بے باکی کے طریق سے انہیں برتنے کا انداز صفوت علی صفوتؔ کے یہاں پایا۔ جہاں پوری کائنات لفظوں میں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان کے یہاں اوزان و بحور کے تنوع کے ساتھ فارسی، عربی، انگریزی، ترکی زبانوں کے الفاظ کا بے حد تخلیقی استعمال ہوا ہے۔ اس شاعری کے اعماق میں اُتریں تو ایک جہانِ ہوش ربا سامنے آتا ہے۔ مٹی کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور اس ایوان میں غیر فانی مشعلوں کا منظرنامہ ہے۔ جس پر نظر مرکوز کر دینے کے بعد پلک جھپکانے کو جی نہیں چاہتا اور اگر بے خیالی میں پلک جھپک بھی جائے تو رنگ تماشا پاش پاش ہو سکتا ہے۔ بقول بیدلؔ:

نزاکت ہاست در آغوش مینا خانہ حیرت
مژہ بر ہم مزن تا بشکنی رنگ تماشا را

یہاں مناظر کا ایک تسلسل ہے۔ ایک آئینہ شاعر کی فکری ارتفاع میں کہیں نصب ہے۔ اس میں تمام مناظر اپنے وجود کا اظہار کر رہے ہیں۔ گویا غالبؔ کی زبان میں:

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

''سوادِ حور'' میں شامل صفوت علی صفوتؔ کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے دوران اکثر مجھے اس بات کا شدید احساس ہوا کہ اس قدر اہم شاعری جو کائنات کے ذرہ ذرہ کا احاطہ کرتی ہو اس پر اظہارِ خیال دو چار صفحات میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ایک کتاب درکار ہے جو صفوت علی صفوتؔ کے فکری آئینوں میں وجود پذیر ہونے والے عکسوں کو سمیٹ سکے۔

رمزیت، ایمائیت، مکاشفہ ان کی شاعری کی اہم ترین معنوی

جہتیں ہیں جن پر تفصیل سے اظہار خیال کیا جانا چاہیے۔ حالانکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سید ضمیر جعفری اور مامون ایمن جیسے ثقہ قلمکاروں نے صفوت علی صفوتؔ کی شاعری کے بیشتر پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ گلزار جاوید نے اپنے مقتدر ماہنامہ ''چہارسو'' میں ان کی ''مثنوی وقت'' قسط وار شائع کی ہے جو مشاہیر ادب کی نگاہ میں اہمیت کی حامل ہے۔

ایک بات اور جو صفوت علی صفوتؔ کی شاعری کو ارفع ترین منصب عطا کرتی ہے وہ مولائے کائنات حضرت علیؓ سے ان کی بے پناعقیدت، گویا ان کے ہاتھ دروازۂ حلم کو بوسہ دے رہے ہیں اور شہرِ علم کے خدوخال ان کی نگاہوں میں روشن ہیں:

اُٹھا لاؤ سبھی جام و سبو، فنجان و ساغر کو
علی کی منقبت بھرنے لگی ہے حوض کوثر کو

ثنا خوانی ہمیں بھی آ گئی ہے اے مہِ کعبہ
کہ سر ہر شخص کا پھیرا گیا آخر اسی گھر کو

''سوادِ حور'' کا حمد باری تعالیٰ سے آغاز ہوتا ہے۔ اس میں نعتیں بھی ہیں، منقبتیں بھی ہیں، غزلیات کا طویل سلسلہ بھی۔ دیگر موضوعات پر بھی منظومات ہیں جن میں سائنسی موضوعات کو اہمیت حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ کائنات کے ذرہ ذرہ پر شاعر کی نگاہ ہے۔ اشیاء کی ماہیت کو وہ سمجھتا ہے۔ ذروں کے شریانوں میں بہتی ہوئی آگ تڑپتی ہوئی بجلیوں کے رقص کو وہ مسلسل دیکھ رہا ہے۔

وقت کی گردش اور اس کے تناظر میں انسانی ذہن کی جولانی، ایجادات کے کرشمے، فکر و نظر کی طغیانی، سب کچھ اس کے سطحِ چشم پر منعکس ہو رہے ہیں جس میں بصارت سے زیادہ بصیرت کو دخل ہے اور کائنات کے اسرار میں بھی یہی ہے کہ انہیں چشمِ بصیرت سے پہچانا جائے۔ ان کے خدوخال کی روشنی میں ان کے شعروں کو پڑھا جائے۔ ان جذبوں کا احساس بھی کیا جائے جو چہروں سے نمایاں ہیں۔

صفوت علی صفوتؔ کی غزل کسی ایک دائرے میں محدود نہیں ہے۔ انہیں غزل کے نئے جہانوں کا علم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ غزل خود میں کس قدر وسعت رکھتی ہے، کیسے کیسے زمانوں کو سمیٹ سکتی ہے، کن کن رنگوں کا اظہار کر سکتی ہے، اس کی ہزار شیوگی کیا ہے۔

نوجوانی کی ہمیں آگ جلانے دے ابھی
کار آتش کدہ پیر مغاں ہونے دے

پھر سے بہتات ہوئی جاتی ہے چوپایوں کی
کوئی بستی نظر آتی نہیں انسانوں کی

اس پلانیٹ ایپ میں انسان دہشت گرد ہے
متن تھا یہ مختصر بے بون کی تقریر کا

آج آدم ہے کہاں نوح و براہیم و کلیم
ہے مسیحا کی خبر دینے کی تارا کوئی

مریخ کی ہو دھول کہ خاک ہمہ ارضی
تاریخ مری کیا ہے جہاں بھی ہوں وہیں کا

ہیں لحم طیر و حور کی باتیں بھی ضروری
اُٹھتا تھا جو لہو میں شرارہ نہیں رہا

روشن ہے جگمگے میں زلیخا کا شمع دان
سو آفتاب یوسف کنعاں سے آئے ہیں

بہتا ہے خون اب بھی سرِ دجلہ و فرات
بیٹھے ہیں خود کو شامِ غریباں کیے ہوئے

دیارِ مغرب میں بود و باش رکھنے والے حبِ رسولؐ سے سرشار ''مثنوی وقت'' و ''مثنوی رسولؐ'' کے مصنف صفوت علی صفوتؔ کے ان اشعار میں جو ان کے شعری مجموعے ''سوادِ حور'' میں شامل ہیں، ماضی سے لے کر مستقبل تک ایک تاریخ مکالمہ کرتی ہے۔ ایک مشعل آفتاب ہے جو ہر لمحے کے اُفق پر فروزاں ہے۔ یہ اشعار اس بات پر دال ہیں کہ شاعر نے کتنے زمانوں کو اپنی چشمِ تخیل سے نہ صرف یہ کہ دیکھا ہے بلکہ انہیں اپنے وجود میں سمیٹا بھی ہے اور وہ زمانہ جو اس کے گرد و پیش بکھرا ہوا ہے وہ کس طرح اس کے وجود میں سانس لے رہا ہے۔

اس طرح کی شاعری کرنا بے حد مشکل کام ہے جہاں اس قدر بے باک لہجہ ہو جو براہِ راست دل کی رگوں میں نہ صرف اُڑ رہا ہو بلکہ لہو میں چراغوں کی فصل اُگا رہا ہو۔ اس طرح کی شاعری ایک منشور کی طرح ہوتی ہے، ایک عصری منشور، ایک تقویم جس میں گزرے زمانے بھی ہیں اور نا آفریدہ اعصار بھی۔

''سوادِ حور'' ایک خوبصورت کتاب ہے۔ صوری و معنوی دونوں جہتوں میں اسے سال کی سب سے اہم کتاب کہنا چاہیے جس کا ہر لفظ معنویت سے لبریز ہے۔ بس شرط یہی ہے کہ قاری خود بھی اس تفکر کی شاہراہ کا مسافر ہو جہاں مناظر کی تنصیب سنگ میلوں کی مانند ہے۔ گویا یہ ایک بیکراں خلاء ہے جس میں یوں تو کچھ نظر نہیں آتا لیکن اگر چشمِ بصیرت ہو تو یہ جولان گاہِ سیارگان ہے۔ ان کے یہ اشعار بھی قابل ملاحظہ ہیں:

ساتھ لے چل ہمیں خلاء بازن
ہوں سماوات میں بھی تر دامن

باقی صفحہ ۴۷ پر ملاحظہ کیجیے

''لوسانس بھی آ ہستہ''

ڈاکٹراسماعیل آزاد

(فتح پور،بھارت)

راقم کوشعری مجموعہ ''سوادِحور'' ممتاز شاعرمحترم غلام مرتضیٰ راہیؔ کی وساطت سے نظرنواز ہوا۔آج اس گھڑی سے پیشتر اس کاتخلیق کار راقم کے لیے بالکل اجنبی تھا۔کتاب ہاتھ میں لی اور ورق گردانی کرنے لگا۔آدھے گھنٹے کے کوتاہ عرصے کے بعد شاعراپنا سا لگنے لگا جیسے اس سے برسوں کی شناسائی ہو۔ان چندلمحات کی جستہ جستہ ورق گردانی سے شاعر کی بابت جوتاثرات راقم کے جریدۂ قلب پر مرتسم ہوئے، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ شاعر موصوف کو اسلام اور شعائرِ اسلام سے کافی وابستگی ہے۔وہ دل سے راست باز، موحد اور نبی ختمی المرتبت ﷺ کا لائقِ رشک عقیدت مند معلوم ہوتا ہے۔نعت گوئی کو اپنا وتیرہ بنانا، نبی امی ﷺ سے اس کی والہانہ عقیدت کا مظہر ہے۔یہ ایک مسلمّہ حقیقت ہے کہ نعت کی وادی پُر خار ہے اور وہ بذاتِ خود ایک مشکل صنفِ سخن ہے،اس میں فوق وتحت دونوں جانب قدغن ہیں۔اگر بشریت اور عبدیت قاب قوسین اوادنیٰ کی حد بندی توڑ کر اُلوہیت میں مدغم کردی گئی تو یہ سراسر غلط اور موجبِ تعزیر ہے اور اگر بشریت کو نور سے علیحدہ کر کے صرف بشریت کے جامے میں دیکھا اور دِکھایا گیا تو وہ بھی گرفتنی اور لائقِ پشیمانی ہے۔فی الواقع ایسے شعرائے نعت کو اُنگلیوں کے پوروں پر گِنا جا سکتا ہے جو اپنی نعتیہ کاوشات کو افراط وتفریط سے بالا تر رکھ پائے ہوں۔صفوتؔ صاحب کی نعتوں میں چندلمحوں کے لیے ڈوب جانے پر اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ محترمی صفوتؔ ان معدودے چند وابستگانِ نعت میں ہیں، جنھوں نے شرعی حدود کے اندر رہ کر محبوبِ رب العالمین، حاصلِ کائنات اور گل سرسبدِ تخلیقاتِ خداوندی سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔اچھی اور صالح نعت کہہ لینا زورِ بازوئے سخن کا نہیں بلکہ فضلِ الٰہی کا ثمرہ ہوتا ہے۔اسی بات کو صفوتؔ کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں۔

پیرہن عشق کا الفاظ کو پہناؤں گا
اور فریاد کے رنگ سے اسے رنگواؤں گا
خوں عرب ہی کا سہی پر یہ زباں ہے عجمی
لفظ تعریف کے ایسے میں کہاں پاؤں گا
سُن کے یہ دل نے کہا ہاتھ سے فوراً صفوتؔ
تم اُٹھاؤ تو قلم نعت میں لکھواؤں گا

موصوف کو آدابِ نعت سے اچھی خاصی آ گاہی ہے۔اس سلسلے میں ان کا درج ذیل شعر قابل رقم ہے۔

لو سانس بھی آ ہستہ کے ٹوٹے نہ مرا خواب
سرکار دوعالمؐ مرے پاس آنے لگے ہیں

یقیناً وہ خواب لائق تکریم ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کی آمد آمد ہو۔

محمد امی سرتاجِ انبیاء ورسل ﷺ کی ذاتِ گرامی اصلاً نور ہے، بشریت کا جامہ آپؐ کو اس لیے عطا کیا گیا ہے کیونکہ نور غیر متشکل ہونے کی صورت میں غیر مرئی ہوتا ہے۔آپ ﷺ نے خود فرمایا ہے '' اَنَا مِنْ نُورِ اللّٰہ'' ۔اسی لیے آپؐ بغیر سحری وافطاری کے چالیس چالیس دنوں تک روزہ سے رہتے تھے اور جب آپ ﷺ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ ﷺ کے اتباع میں صوم وصال کا آغاز کیا تو آپ ﷺ نے انہیں اس سے باز رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا ''اَيُّكُمْ مِثْلِي يُطْعِمُنِي رَبِّي وَيُسْقِينِي '' (بخاری ومسلم روائ اوّل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) تم میں سے کون مجھ جیسا ہے، مجھ کو میرا رب کھلاتا پلاتا ہے۔اس مختصر سی تمہید کے بعد صفوتؔ صاحب کے اس شعر کی قرأت کریں۔

فقط نور ہیں وہ ہمہ نور ہیں وہ
جسد تو یہ بن کر نقاب آ رہا ہے

''سوادِ حور'' کے تخلیق کار کا مذہبی مطالعہ بہت عمیق اور کافی وسیع ہے۔موصوف حروف والفاظ کے انتخاب پر زبردست قدرت رکھتے ہیں اور ایجازِ بیانی موصوف کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ طویل سے طویل مذہبی واقعات و دینی روایات کو ایک شعر کے دو مصرعوں کی ننھی سی دنیا میں محفوظ کر لینے کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ابن عیینہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ مسجد نبوی میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ حضرت ابو بکرؓ اپنے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کو اپنی آنکھوں سے لگا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک یا رسول اللہ ﷺ آپ ہیں۔ جب حضرت بلالؓ اذان سے فارغ ہوگئے تو نبی رحمت ﷺ نے فرمایا کہ اے ابو بکرؓ! میری ملاقات کے شوق میں جو کچھ تم نے کہا اور کیا اس پر جو بھی عمل پیرا ہوگا اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف فرمادیں گے۔ گناہ خواہ نئے ہوں یا پرانے، عمداً ہوں سہواً، پوشیدہ ہوں یا آشکارا۔

ایک دوسرے موقع پر سیّدی وحبیبی محمد عربی ﷺ نے فرمایا جس نے اذان میں میرا نام سنا اور اپنے ہاتھوں کے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کو بوسہ دیا اور ان کو اپنی آنکھوں پر پونچھ لیا، تو وہ سدا حزن وغم سے محفوظ رہے گا۔(تفصیل کے لیے جلالین شریف، ص:۳۵۷، حاشیہ۱۲،۱۳ کی طرف رجوع فرمائیں)اس تمہید کے بعد شاعر محترم صفوتؔ کا درج ذیل شعر سماعت فرمائیں۔

سنتے ہیں محمدؐ وہ چومے ہے انگوٹھوں کو
کہتا ہے اسی سے تو آنکھوں میں اجالا ہے

بزرگ شاعر تلمیحات اور رمز وکنایہ کا شہنشاہ ہے۔قرآنی واحادیثی

تلمیحات میں اس کا درک کافی دمدار اور خاصا جاندار ہے۔ آیت کریمہ ہے '' اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا''

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے ، نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! آپؐ پر درود و سلام خوب بھیجو) قرآنی آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے شاعر موصوف کا درج ذیل شعر ملاحظہ فرمائیں۔

سنتے ہی محمدؐ وہ بھیجے ہے درود ان پر
کہتا ہے خدا بھی تو جپتا یہی مالا ہے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نصف گھنٹے کے مطالعے کے ثمرہ میں صفوتؔ صاحب کی غیر مذہبی شاعری بالخصوص ان کی غزلیہ شاعری کی بابت جو خیالات راقم کے ذہن میں سر اُٹھا رہے ہیں ان کو بھی بہت اختصار کے ساتھ قلم بند کر دیا جائے۔

صفوتؔ صاحب کی شاعری کا مابہ الامتیاز عنصر ان کی اجتہادیت ہے۔ راقم کو ان کی شعری کاوشات میں بہت سے ایسے اشعار پڑھنے کو ملے ہیں، جن سے ان کی جدت طراز ذہنیت کا اندازہ لگتا ہے۔ وہ تقلید کے نہیں اجتہاد کے قائل ہیں۔ اسی لیے خیالات کو نظم کرنے کا ان کا انداز نرالا اور اچھوتا ہے۔ ان کی تشبیہات اور ان کی تلمیحات تازہ اور جدید ہیں۔ صفوتؔ کی جس خوبی نے راقم کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔ وہ ان کی جرأت اظہار ہے جو اس دنیا میں کم شاعروں بلکہ کم انسانوں کے حصے میں آئی ہے، اسی لیے نبی امیؐ نے سلطان جابر کے سامنے اظہارِ حق کو جہاد کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ ''سوادِ حور'' سے اس قبیل کے چند اشعار بشرِ ملاحظہ پیش ہیں۔

یہ عیاری، یہ مکاری، یہ دھوکے
یہ خوں تاثیر میں برطانوی ہے
ایک دن اچانک پھر تاجروں کے مندر میں
حشر کی ریہرسل کو اُترے کرّوبیاں
منسلک ہوں جنگوں سے فیل ہے نشاں جن کا
پھر نہ ہوں ابابیلیں ، جھنڈا ک اُڑاؤ میں
جمہوریت کے عشق میں یلغار دیکھنا
بش کا عراقیوں سے ذرا پیار دیکھنا
سب منتظر ہیں آمد عیسیٰ کے شہر میں
پر جانے کیا ہوا کہ یہ بش آزاد ہو گیا
مری جانب سے جا کر آپ بش کے باپ سے کہہ دیں
کوئی اسلام کو مرہونِ منّت کر نہیں سکتا

صفوتؔ عصر حاضر کی مفسدہ پردازیوں اور انسانیت کے لیے سم قاتل کے سے اثرات رکھنے والے حالات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ اس (بزعمِ خود ترقی یافتہ) معاشرہ کا موازنہ و مقابلہ عہد جاہلیت کے معاشرے سے کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہے زنا بالجبر صادر اب سزائے بے قصور
یہ ہمارے منصفوں کا اب طریقہ طور ہے
اس سے بہتر تھا کہ زندہ دفن کر دیتے تھے جب
عہدِ جاہل سے بھی جاہل یہ ہمارا دور ہے
خود اپنے کٹہرے میں کھڑی اب ہے عدالت
آئین اور آئین کی پرواز تو دیکھو
کیا تحائف، کیا طوائف، کیا وہ اوراقِ اُمم
عزّت و ناموس تک نیلام انٹرنیٹ پہ ہے

صفوتؔ کے شعری مجموعے میں کئی اشعار ایسے ملے ہیں جن میں کائناتی صداقتیں اور آفاقی حقیقتیں کافی حسین اور دلآویز انداز میں نظم ہوئی ہیں۔ طنز و مزاح اگر سلیقگی سے بے بہرہ ہے تو وہ فن نہیں پھکڑ پن ہے۔ صفوتؔ کے یہاں اس حقیقت کا اظہار ملاحظہ فرمائیں۔

صفوتؔ کے گھر میں ستھری ملائم ہے گفتگو
طنز و مزاح بھی ہے مگر اک وقار سے

زبانِ عالم کی زد سے آج تک کوئی نہیں بچ پایا، اس کائناتی حقیقت کا اظہار صفوتؔ کے یہاں کچھ اس طرح ہوا ہے۔

مثل یوسف آپ صفوتؔ ہوں گے بھی معصوم اگر
تو بھی پیچھے سے لگائی جائے گی تہمت ضرور

اس شعر میں تہمت کا پیچھے لگایا جانا کافی دلآویز اور معنویت سے بھر پور ہے۔

آخر میں اتنا عرض کرتا چلوں کہ کلامِ صفوتؔ میں جو پاکیزگی اور رعنائی ہے وہ ان کے خلوص اور معاصی سے بچتے رہنے کی ان کی دل کی پکار اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ راقم اپنی اس مختصر سی تحریر کو صفوتؔ ہی کے منقولہ ذیل شعر پر ختم کرتا ہے۔

رسولوں کا بھی تھوڑا خون جیسے اس میں بہتا ہو
ہو جس میں فسق ہرگز کام صفوتؔ کر نہیں سکتا

۔ عالمی اردو ادب ۔

ہمیشہ کی مانند اس بار بھی چار سو سولہ صفحات مجلد پر مشتمل عالمی اردو ادب علم و ہنر کا بھر پور خزینہ لیے منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ عالمی اردو ادب ایک جریدہ ہی نہیں بلکہ سالِ گزشتہ کا ایسا مکمل ضمیمہ اور زائچہ ہے کہ جس میں گزرے ہوئے تمام حالات و واقعات ایک لڑی کی طرح پرو دیے گئے ہیں۔ فیض صدی کی مناسبت سے گوشۂ فیض کی اضافی سوغات شاملِ اشاعت ہے۔

F-14/21-D, کرشن نگر، دہلی 110051، بھارت

''میرے اردگرد ہے کہکشاں''

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط
(مہاراشٹر، بھارت)

سائنس اور شاعری کے مابین رشتوں کے متعلق نقدِ ادب میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ایک گروہ دونوں میں بعد و مغائرت کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک سائنس اور شاعری ایک دوسرے سے ایک ہی متغائر متبائن ہیں جیسے قطبین۔اس گروہ کے خیال کے مطابق شاعر اوہام کی وادیوں میں بھٹکتا رہتا ہے تو سائنسداں طبعی حقائق کی تلاش میں سرگرداں۔ایک غیر مرئی دنیا کا صید تو دوسرا مرئی دنیا کا اسیر۔ایک تصورات وخیالات کے سہارے احساسات کی دنیا کو رنگ وروغن عطا کرتا ہے تو دوسرا تجربات وتعاملات کے ذریعے جہانِ رنگ وبو کو سنوارتا ہے۔ اس نظریے کے ماننے والوں میں Mathew Arnold، Leigh Hunt اور ورڈزورتھ، Lord-Snow، جان بروز اور Huxley وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

دوسرے گروہ کے قائلین سائنس اور شاعری میں انسلاکات کو تلاش کرنے میں ایمان رکھتے ہیں۔ان کے نزدیک سائنس قدرت کو سمجھنے کا آرٹ ہے۔''سائنس جب جذبات کے ساتھ مل جائے تو وہ آرٹ بن جاتی ہے''۔اسی لیے Shelly اپنے معاصر شعراء سے یوں ہم کلام ہوتا ہے۔

''وہ (شعراء) سائنس کے علم کو جذب کریں اور اسے انسانی ضروریات کے عین مطابق متشکل کر دیں۔اس میں جذبوں کا رنگ بھریں اور اسے انسانی فطرت کے خون اور گوشت سے نئی شکل دیں۔''

اس گروہ کے ماننے والوں میں Shelly، پیٹر اوجر اور ٹی۔ایس ایلیٹ وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

اگرچہ مذکورہ بالا ساری مثالیں مغربی ناقدین کی ہیں لیکن جب ہم اُردو نقد پر نظر ڈالتے ہیں تو آزاد، حالی اور شبلی سے لے کر (یعنی اُردو تنقید کے ابتدائی دور سے) مجنوں، احتشام حسین آل احمد سرور اور کلیم الدین احمد تک تمام کے یہاں سائنس اور شاعری کے روابط اور ان کے درمیان پائے جانے والے اتصال وافتراق پر سیر حاصل مباحث کا فقدان نظر آتا ہے۔درآں حالیکہ اُردو شاعری میں (اگر علم نجوم کو فلکیاتی سائنس کا جزو تسلیم کیا جائے تو) سائنسی موضوعات کو برتنے کا چلن قدیم دور سے رہا ہے۔چنانچہ علم نجوم پر ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد میں سترہویں صدی کی دو مستقل منظوم کتابیں مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں۔ان کے علاوہ رنگین، مرزا رسوا، جمیل مظہری، عمیق حنفی، کرامت علی کرامت، اظہار اثر، صفوت علی صفوت، گلزار، پرویز شاہدی اور مجید امجد وغیرہ کے یہاں بھی فلکیاتی سائنس کے متعلقہ موضوعات کو برتنے کی مثالیں ملتی ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ دنیا کی قدیم ترین شاعری میں بھی اس فلکیاتی موضوع کو بہ استخصاص برتا گیا ہے۔چنانچہ ہومر کی ''اوڈیسی''، دانتے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' (طربیۂ خداوندی)، ملٹن کی ''پیرڈائز لاسٹ'' (جنت گم گشتہ)، محی الدین ابن العربی کی ''فتوحاتِ مکیہ''، ابن شہید الاندلسی کی ''رسالۃ التوابع و الزوابع''، ابو العلاء المعری کی ''رسالۃ الغفران''، امیر خسرو کی ''نہہ سپہر'' اور ''بوستانِ خیال''، حکیم سنائی کی ''مثنوی سیر العباد الی المعاد'' اور علامہ اقبال کی ''جاوید نامہ'' وغیرہ اس کی بین مثالیں ہیں۔لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ اُردو شعراء نے اس موضوع کو برتنے میں عربی، فارسی شعراء کی تقلید سے کلیتاً اجتناب برتا۔ اُردو کے ان شعراء میں صفوت اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ان کی شاعری میں صفوت نے سائنس کی اصل روح اس طرح کھینچ لی ہے کہ سائنسی کثافت شعری لطافت میں ڈھل گئی۔پھر انہوں نے علم نجوم ہی نہیں فضائے بسیط کے ان تمام رازوں کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے جن پر گزشتہ صدی سے سائنسداں متواتر تحقیق کر کے انہیں منکشف کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے کہ اردو کو ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر جیسا ایک ہی سائنسداں شاعر نصیب ہوا تھا۔ان کا اوّلین مجموعۂ کلام ''لاجونتی'' ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا لیکن اس میں سائنسی موضوع پر کوئی نظم نہیں ملتی۔صفوت نے بھٹناگر کے سہواً یا عمداً نظر انداز کیے ہوئے سائنس کے متعلق ادبی کام کو بہت آگے بڑھایا ہے۔

''مثنوی وقت'' صفوت کی ایسی ہی تخلیق ہے جس میں سائنس کے نہایت ادق، تحیر خیز اور سائنس دانوں کے علاوہ خواص اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے بھی گلے سے نہ اُترنے والے کثیف ''علم الخلاء'' کو لطیف صنفِ ادب یعنی شاعری میں پوری طرح سمو دیا ہے۔یاد رہے کہ اُردو شاعری میں علم الخلاء (Space Science) کو اتنی کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں۔صفوت نے اس مثنوی میں علم وفن (Science & Art) کو یکجا کر دیا ہے۔اس مثنوی کا موضوع تخلیق کائنات ہے۔شاعر نے تخلیق سے لے کر تحلیلِ کائنات تک کے سائنسی نظریات کو اپنے خلاق تخیل سے اشعار میں ڈھالا ہے۔یہاں مرزا رسوا کی مثنوی ''اُمید وبیم'' کے باب الفلکیات کا مقابلہ ''مثنوی وقت'' سے کیا جائے تو یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ رسوا کے بالمقابل صفوت کے یہاں سائنسی نظر کا عمق کچھ زیادہ ہی ہے۔اس کے علاوہ خیالات میں تنوع اور افکار میں وسعت بھی پائی جاتی ہے۔صفوت نے جدید فلکیاتی سائنس کا بہ غائر مطالعہ ومشاہدہ کیا ہے۔اس لیے ان کے یہاں اس علم کے جزوی پہلوؤں تک کو کامیابی کے ساتھ برتنے کی مثالیں مل جاتی ہیں۔

''مثنوی وقت'' کے علاوہ صفوت نے ''سوادِ حور'' کی غزلیات میں

بھی علم الخلاء کے باریک لیکن اہم گوشوں کی صراحت فنکارانہ انداز میں کی ہے۔ سیاہ بھنور (Black Hole)، حیاتیاتی گھڑی (Biological clock)، ایٹم، Planet Ape، انٹرنیٹ، آلۂ رکتر (زلزلہ پیما)، DNA، Helix، Cloning، Time، Mushroom Cloud (ایٹمی چھتریاں) اور Principle of uncertainity (اصولِ غیر یقینی) وغیرہ ایسی ثقیل سائنسی اصطلاحیں ہیں جو غزل کی شیریں وشگفتہ طبیعت سے لگا نہیں کھاتیں لیکن صفوتؔ نے ان کی ثقالت کو اپنے اسلوب و آہنگ سے ایسا لطیف بنا دیا ہے کہ غزل کے الفاظ میں ڈھل کر وہ تغزل کا حصہ بن گئی ہیں:

مکیں کھو گئے مشری بادلوں میں
مکاں کیا یہاں اک کھنڈر بھی نہیں ہے

سائنس کے نظریہ Twin Paradox کے مطابق روشنی کی رفتار سے سفر کرنے والے خلاء باز کی عمر مستحکم (Stunt) رہتی ہے۔ صفوتؔ نے اس نظریے کی توضیح شاعرانہ لب و لہجے میں مؤثر انداز میں کی ہے۔ ''سوادِ حور'' کی غزلوں میں بھی اس موضوع کو بڑے دلآویز انداز میں برتا گیا ہے۔

خلاؤں میں بہت ہی دور ایک چھوٹی سی وادی ہے
جہاں پر وقت بہتا ہی نہیں ٹھہری جوانی ہے

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ہمارے غزل گو شعراء کے یہاں جوانی کا مضمون بڑے شد و مد کے ساتھ استعمال ہوا ہے، لیکن ان شعراء کو تاسف اس بات کا بھی ہوتا ہے کہ وقتِ جوانی روبہ زوال ہے۔ یاسیت و محرومی کے اس پس منظر میں وقت کی طنابیں کھینچ جانے کی وجہ سے ٹھہری ہوئی جوانی کا متغزلانہ تصور کتنا بامعنی محسوس ہوتا ہے۔ باوجود مضمون کی ثقالت کے صفوتؔ کی غزلوں کا رنگِ تغزل قائم رہتا ہے اور یہی ان کے فن کا کمال ہے۔

صفوتؔ کی غزلوں میں سائنس اور مذہب کے ڈانڈے ملانے والی لفظیات کی بھی بہتات نظر آتی ہے۔ سفرِ سماوی کے متعلق اشعار میں مذہب و سائنس کے نظریات کیسے یکجا ہو گئے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

مرے اردگرد ہے کہکشاں، مرا ہم سفر مری جانِ جاں
ہیں خلا نورد براق پر، شب و روز پا بہ رکاب ہے

ہو رختِ سفر صورتِ بُرّاق ہمارا
معراج پہ معراج ہو ہر روز یہاں اور

آخری شعر میں لفظ ''بُرّاق'' کا تلفظ عربی نحو کے مطابق درست ہے۔ اسے عجز شاعر پر محمول کرنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔ سماوی سفر کی روداد کی حامل ان غزلوں میں کہیں بھی رطب و یابس کا عیب نظر نہیں آئے گا۔

سائنس کی ایک شاخ طب بھی ہے۔ یہ موضوع بھی نہایت خشک ہے لیکن صفوتؔ نے اس موضوع پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ''نیوران'' ایک سو ایک اشعار کی ایسی مثنوی ہے جس میں طبِ جدید کی محققہ دماغی مرض کی تفصیل درج ہے۔ ''نیوران'' دماغ کے ایک بنیادی خلیے کا نام ہے جس میں نقص در آنے سے یہ دماغی مرض آدمی کو ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک طرف تو آدمی کا مغز گھٹنے لگتا ہے تو دوسری طرف آدمی Manic Depression کا شکار ہو کر خودکشی کی طرف مائل ہو جاتا ہے یا قتل جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ ''نیوران'' مثنوی لکھ کر صفوتؔ نے اُردو شاعری کو نیا موضوع دیا ہے۔ اس میں اکثر جدید طبّی اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے لیکن شاعر نے ان کے دروبست کا بحسن وخوبی خیال رکھا ہے تاکہ شعر کی تفہیم اور اس کے آہنگ میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آجائے۔

طبعی سائنس کے علاوہ صفوتؔ نے Political Science (سیاسیات) کے بعض جزئیات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے سیاست کے غلط رویوں کی وجہ سے پیدا شدہ عالمی سطح کے سماجی مسائل کی ترجمانی مؤثر انداز میں کی ہے۔ یہاں شاعر کی عصری حسیت بڑی متحرک دِکھائی دیتی ہے۔ ایسے مسائل کے بیان میں بعض جگہ طنز و تضحیک کا انداز بھی اپنایا گیا ہے۔

صدر کیا چنا ہم نے موجِ بحر میں آ کر
چھید کر لیے ہم نے خود ہی اپنی ناؤ میں
منسلک ہیں جنگوں سے فیل ہے نشاں جن کا
پھر نہ ہوں ابابیلیں، جھنڈ اک اڑاؤ میں

(یاد رہے کہ سابق امریکی صدر بش جوری پبلیکن پارٹی کے صدر بھی تھے، ان کی پارٹی کا نشان ہاتھی رہا ہے)۔

غرضیکہ صفوتؔ کی شاعری میں سائنسی تحقیقات کے موضوعات کو بالالتزام برتا گیا ہے۔ ایسی سنگلاخ وادی میں ٹھوکریں لگنا غیر فطری نہیں۔ صفوتؔ کی ''سوادِ حور'' میں بعض مقامات پر نظر ٹھہر جاتی ہے لیکن انہیں استثنیات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ میں صفوتؔ کی شاعری شروع ہی سے پڑھتا رہا ہوں۔ ''مثنوی وقت'' کے ہندوستانی ایڈیشن میں میرا پیش لفظ بھی ہے۔ اس مطالعے میں مجھے غزل سے زیادہ منظومات/مثنوی میں صفوتؔ کامیاب نظر آئے ہیں۔ اس لیے اپنا عندیہ ان ہی کے شعر میں بیان کرتا ہوں:

صفوتؔ غزل یہ بعد ازاں ''مثنوی وقت''
صورت مٹی مٹی سی لگے جامِ جم پہ یار

''روٹی''

عوام تو کہتے ہیں۔ میں ان کے سامنے روٹی پھینکوں گا اور جہاں جی چاہے گا انہیں لے جاؤں گا اور جو چاہوں گا وہی کام ان سے لوں گا۔ (نپولین)

''وجودِ انتقال''

صفوت صاحب کے نظیہ کلام سے مختصر انتخاب

فاری شا

(لندن)

اُردو کے نام

آئی تھی دُھوم دَھام سے بابر کے ساتھ ساتھ
اُڑتی پھری تھی طاقتِ شہپر کے ساتھ ساتھ

دلّی مِرا جو شہر تھا عالم میں انتخاب
لگتی تھی نو بیاہی مَیں شوہر کے ساتھ ساتھ

اُجڑا مِرا چمن تو ہوئی گھر سے دَر بدر
اب سوکنیں بہت ہیں مِرے گھر کے ساتھ ساتھ

صفوتؔ کی راہ اور ہے، کچھ دن کا ساتھ ہے
دو چار گام اور ہیں رہبر کے ساتھ ساتھ

○

سوچتا ہوں

سوچتا ہوں یہ صدی مسلم پہ بھاری ہے اِلٰہ
غیر قوموں نے لگائی ضربِ کاری ہے اِلٰہ

قتل وغارت پھر ہُوا بغداد کے گرد ونواح
حاکمانِ مسلماں کی عقل ماری ہے اِلٰہ

غیر کی تلوار سے بہنے لگا افغان خون
اب یہ آفت بُزنیا پر پھر سے طاری ہے اِلٰہ

موت کی تصویر ہیں صومالیہ کے شیر خوار
اب ہمیں کس صبر کی تلقین جاری ہے اِلٰہ

فوج اپنی اب ہوئی جاتی ہے پسپا ہر جگہ
قیصر وکسریٰ کی ہر سو فوجداری ہے اِلٰہ

لیڈری سائنس میں ہے اور نہ ہے علمِ فلسفہ
دشمنوں کی پیروی ہے، شرمساری ہے اِلٰہ

رازِ دیں صفوتؔ بھی جانیں، بات واضح ہوگئی
پیشِ غیر اللہ، اپنی گریہ زاری ہے اِلٰہ

○

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء

نرم بستروں پر ہم بستری کے خواہاں تھے
کیا جہاد کر پاتے وقفِ وَصلِ جاناں تھے

ہو رہی تھی یونہی بس زندگی بسر اپنی
خوب عیش وعشرت کے ہر طرف ہی ساماں تھے

ہو چکی تھیں فرسودہ سب روایتیں اپنی
بس حریمِ مغرب کے اُونچے اُونچے دالاں تھے

ایک دن اچانک پھر تاجروں کے مندر میں
حشر کی رہرسل کو اترے کرّو بیّاں تھے

دیکھتے ہی پھر جُڑواں سر بلند مینارے
گر پڑے تھے سجدے میں زیرِ غیظِ یزداں تھے

آگ اور دھواں، شعلے، راکھ، کرچیاں، کنکر
یومِ حشر کی صورت سر پہ باد و باراں تھے

کہہ رہے تھے امریکی یہ قصورِ مسلم ہے
نام کے سہی لیکن، ہم بھی تو مسلماں تھے

کیا جہاز، کیا دفتر، اُنگلیاں اُٹھیں ہم پر
صورتوں میں ہم چہرہ اس قدر نُمایاں تھے

بہہ رہا تھا ہر جانب پھر سے خونِ انسانی
اپنی اپنی دہشت میں سرخ سب کے داماں تھے

موت سب کو آئی تھی جو بھی جس کا مذہب تھا
اپنی اپنی جنّت میں سب کے حور وغلماں تھے

آپ کی زمیں صفوتؔ اِک یتیم خانہ تھی
اور سارے عالم کے اس میں طفلِ انساں تھے

مثنوی واشنگٹن

Simpson جیسا ایک کھلاڑی Milken جیسا منعم
ان تہذیب کے پرچاروں میں کیسے کیسے مجرم

نابینا اک شیخ تو گلٹی، Simpson چھوٹے جائیں
کس جیوری کو منصف جانیں کس پر ہم شرمائیں

پچھواڑے وائٹ ہاؤس کے، خوف کے، ڈر کے مارے
جان ہتھیلی پر رکھے پھرتے ہیں شہری سارے

نشّے کے بیوپاری کھُلّم کھُلاّ اب منڈلائیں
گلیاں کوچے ایسے ایسے دن میں بھی ڈر جائیں

دروازے ہیں کیسے مزّین قفل سجے ہیں اندر
سوراخوں سے چھپ چھپ دیکھیں کون ہے گھر کے باہر

چوری، ڈاکہ، قتل و غارت ریپ سبھی گِن جائیں
کس میں سب سے پیچھے آخر، بے شرمی، بتلائیں؟

گھر کے بیدی وکلاء سارے مل کر لنکا ڈھائیں
نکتہ اِک آئینی لے کر مجرم کو چھڑوائیں

ملزم کو پاگل ٹھہرایا، کیسی پھر حیرانی
ثابت بھی ہو جرم اگر، تو بھیجیں کالے پانی

ایٹم بم سے لڑنے والو! گُھن اندر ہے سوچو
خانہ جنگی کا خطرہ ہے کالی گوری نسلو

جرم سے آگے ظلم کی شق ہے ظلم کی شق سے آگے
دورِ بغاوت آتا ہے سُن لیں واشنگٹن والے

سنو!

ہجومِ انس میں یارانِ فکر وغور میں اب
سنو! کہ میں ہی ولی ہوں تمہارے دَور میں اب

تمہارے محضرِ خونی میں ہر جواں کی قسم
تمہاری قید میں ہر ایک ناتواں کی قسم

تمہاری ساری سُپر پاوری کی جاں کی قسم
تمہاری اور ہماری، ہر ایک ماں کی قسم

یہاں پہ اور بھی طاقت کی بارگاہیں ہیں
کہ جن میں دفن تکبر کی داستانیں ہیں

شراب وحسن، قیامت کے جو بھی ساماں ہیں
سنو! کہ ہم ایسی تَردامنی سے نالاں ہیں

تمہارے شہر کے بالغ سبھی تو زانی ہیں
تمہاری ساری معیشت میں سود خوانی ہیں

تمہارے شہر جُوئے کے سبب ہی شاید اب
ہیں لاٹری کے ٹکٹ، سیل سب سے زاید اب

طوائفوں کا بھی پیشہ بہ لفظ سادہ میں
تمہیں پتا ہے کہ جائز ہے یہ نواڈا میں

ابورشن کا یہ قانون ہے عجیب و غریب
کہ منصفوں میں بھی باقی نہیں ہے کوئی منیب

تمہارے عیب ، یہ اغلام، کام کا جی سب
تمہارے دور کی جمہوریت کے پاجی سب

شہاب و مہر کی اقطار پھر سے ماپیں گے
بناتِ نعش کی مالائیں پھر الاپیں گے

منات ولات کہ عُزّا کو پھر تراشیں گے
کہ اسپ و فیل ، بقر، بُت بنا کے بیچیں گے

کہ تم بناؤ گے اہرامِ مصر کی قبریں
کہ طورِ سین سے لاؤ گے اب نئی خبریں

یہ تابکاریِ ایٹم، یہ لُو، ہوائیں سب
تمہارے ذہن میں جو بھی ہیں کہکشائیں سب

یہ زینِ عرش یہ زیبِ حرم یہ کچھ بھی نہیں
وہ داستان ہے خود اور قلم یہ کچھ بھی نہیں

شروع ہے ہی نہیں، اختتام ہے ہی نہیں
ولود ہے ہی نہیں، موت فام ہے ہی نہیں

وجود صرف وجود انتقال ہے ہی نہیں
عروج صرف عروج اور زوال ہے ہی نہیں

وہ لامکاں کی عبارت ہے، سرسراہٹ ہے
جہاں پہ کچھ بھی نہیں وہ وہاں کی آہٹ ہے

شبیہ ہے نہ کسی سے کوئی شباہت ہے
مگر تمام زمانے کی بادشاہت ہے

سنو! تمہیں بھی یہ فرعونیت نہ لے ڈوبے
چمک دمک کسی موسیٰؑ کے ہاتھ میں دے دے

کسی کا حشر ہوا ہے، کسی کی باری ہے
بس اِس نزول پہ ہیبت سی ہم پہ طاری ہے

لوری

(چھوٹی بیٹی آمنہ کے لیے)

آمنہ سوئے گی، اب گیت سنانے آئیں
آئیں پریاں، مِری گڑیا کو سلانے آئیں

چھیڑ اے بادِ صبا بیٹھے سُروں کا مَلہار
بُلبُلیں سُن کے یہ سُر ناچنے گانے آئیں

مسکرانا یہ ترا نیند کے جھونکوں میں عجب
تیرے خوابوں میں بہت خواب سہانے آئیں

ہو کے خاموش بھلے شوق سبھی بھائی بہن
گود میں لیں، کبھی جھولے میں جھلانے آئیں

والدہ تھک گئیں، جھنجھلائیں، خفا ہو بیٹھیں
جاؤ والد سے کہو اب وہ کِھلانے آئیں

کیسی معصوم حسیں نیند سے اوجھل آنکھیں
ماشاء اللہ نظر بد نہ لگانے آئیں

خوابِ خرگوش، قریں فجر کے لے لیں صفوتؔ
بعدِ دختر، وہ مؤذّن نہ اُٹھانے آئیں

○

قیصر افغانی

(شاعر محترم قیصر افغانی کے انتقال پر)

چھوڑ کر یاں جسم سارے نوع انسانی چلے
مومنوں کے ساتھ لیکن لفظ قرانی چلے

اِک قیامت کا سماں ہے صبر کی تلقین بھی
ہیں مگر وہ اُس کے، واپس ظلِّ سبحانی چلے

اور جو آگے بڑھے تو دیکھتے ہیں یہ سماں
بس ملائک ہی ملائک بزمِ روحانی چلے

روشنی ہی روشنی، روشن ہوئی ہے جبیں
ہر شعاعِ نورِ یزداں مست طورانی چلے

اِک مکاں کے سامنے کیا خوب استقبال ہے
بس خدا حافظ کہا، خوش، حکمِ سلطانی چلے

ہم تو صفوتؔ رک گئے، ہے حکم یہ دربان کا
حور و غلماں ساتھ لے کر قیصر افغانیؔ چلے

○

ناشرینِ مغرب کے نام ایک خط [1]

رجس میں ملوّث ان کھردری زبانوں کا
خوب ہے یہ چٹخارا شرپسند باتوں کا

تم کو پاس ہے اتنا گالیوں کی حُرمت کا
قتل کر رہے ہو تم سب کے سب اُصولوں کا

کارٹون اور خاکے سوچ کر بنانا تم
حشر ہے سُنا تم نے بولَہَب کے ہاتھوں کا

خط کے ساتھ ناشر جی ایک اور ہے پیکٹ
اُس میں ایک مجموعہ رکھ دیا ہے نعتوں کا

ہے پریس کی آزادی عزّتِ محمدؐ میں
اب یہی مقدر ہے سب قلم دواتوں کا

تم ہمارے مرسلؐ کا مرتبہ نہیں سمجھے
بس پیام ہے اتنا اُن پہ مرنے والوں کا

آپ کو پتا تو ہیں سب ہی خامیاں اُس کی
ترجمان ہے صفوتؔ آپ کے غلاموں کا

○

حشر برپا ہے

(''مثنوی وقت'' کی رونمائی کے موقع پر لکھنؤ میں فی البدیہہ کہی گئی)

حشر برپا ہے کہ یہ حوصلہ افزائی ہے
لکھنؤ تجھ میں بھی اب میری پذیرائی ہے

شام لگتی ہے کہ لوٹ آئی ہو پھر شام اودھ
رونمائی وہی، رونق، وہی رَعنائی ہے

کھینچ لایا مجھے سامن [1] کی طرح بحرِ شعور
یادِ رفتہ میں اُڑاتی ہوئی پُروائی ہے

مثنوی یہ بھی حکایت رہے تا حشر الٰہ
آخر اس وقت کی تو نے ہی قسم کھائی ہے

عظمتِ ہند اگر ہے تو مسلمان ہی ہے
ورنہ یہ آپ کا بھگوان بھی ہر جائی ہے

خواب یہ ختم ہُوا جاتا ہے اُٹھیے صفوتؔ
نائٹ انگیل [2] کی مغرب سے صدا آئی ہے

○

[1] نبی کریمؐ پر کارٹون چھاپنے کے خلاف احتجاج

[1] سامن۔Salman مچھلی
[2] Nighingle

ملّی ترانہ

اُٹھے قوم سب جاں کی بازی لگا دیں
جوانانِ مِلّت کو غازی بنا دیں
غزالی و رومی و رازی بنادیں

نمونہ ہوں دِیں، دُنیوی زندگی کا
نکھاریں جہاں میں وقار آدمی کا
شعورِ سیاست زمانہ گری کا
ہو اِقراء کی صورت جنوں بوعلی کا
علم ہاتھ میں عِلم کی برتری کا
لغت سے مٹے لفظ ناخواندگی کا

مساجد میں یہ درس بھی اب پڑھا دیں
جوانانِ مِلّت کو غازی بنادیں
غزالی و رومی و رازی بنادیں

جو ہم شمعِ علم وہنر پھر جلائیں
جو اِسلام آباد سے لَو بڑھائیں
تو جاپان چین وعرب جگمگائیں
ہر اِک برّ اعظم پہ سکّہ جمائیں
چلیں جب اُجالوں کی تازہ ہوائیں
تو افلاک کی سرحدیں چھو کے آئیں

مفکّر نئی زندگی کو صدا دیں
جوانانِ مِلّت کوغازی بنا دیں
غزالی و رومی و رازی بنادیں

دیانت، ذہانت میں رشکِ جہاں ہوں
صداقت، امانت میں اِک کہکشاں ہوں
اُخوّت میں اِک دوسرے کی اماں ہوں
محبت، مروّت کی میٹھی زباں ہوں
کراچی سے خیبر تک ایک جاں ہوں
غلامِ شہنشاہِ کون ومکاں ہوں

جو کرنا ہے کل آج کر کے دکھادیں
جوانانِ مِلّت کو غازی بنا دیں
غزالی و رومی و رازی بنا دیں

○

رباعی

اِس علم میں تھوڑا سا اضافہ کردے
جس سمت مِرا رُخ ہو اُجالا کردے
اِک طِفل کی ڈکشن میں، دُعا ہے صفوتؔ
معصوم کی صورت بھی خدایا کردے

○

قطعہ

فیصلہ ہوگا مقامات کا آگے چل کر
راز کھُل جائیں گے سارے ذرا آگے چل کر
جیسے غالبؔ پہ لکھا کرتے ہیں شاعر صفوتؔ
ویسے ہی تجھ پہ لکھا جائے گا آگے چل کر

○

''رب زدنی علما''

''اصولِ بتدریج و مسلسل بہتری'' اور خیالِ ارتفاع وارتقاء

صفوت علی صفوت

سب سے پہلے میں اِس مضمون کو پڑھنے والوں سے معافی چاہتا ہوں کہ اس کا عنوان طویل اور مشکل ہے۔ یہاں اپنی قابلیت کا لوہا منوانا مقصود نہیں اور نہ ہی میں ایسے تکبر میں پڑنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے نبیؐ کی بات ہمیشہ یاد رہتی ہے کہ ''رب زدنی علما'' یعنی اے رب (میرے علم) علم کو جمع کر۔ جب نبیؐ یہ دعاء مانگتے ہوں تو میں کس حساب کتاب کی بات کروں۔ تاہم کسی بھی زبان کی لغت کا مطالعہ کر لیجیے، یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہر لفظ کے اپنے ایک منفرد معنی ہیں۔ اسی لیے قرآن کریم کا ترجمہ کرنے والے اس بات کا ''شکوہ'' کرتے ہیں کہ جس زبان میں بھی ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس زبان میں موجود تمام تر فصاحت و بلاغت کے باوجود عربی کے ہر لفظ کا ہر لحاظ سے موزوں متبادل لفظ نہیں ملتا۔ اسی لیے علماء کا خیال ہے کہ قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں۔ صرف مترجم کی بہترین کاوش ہے۔

لفظ ارتفاع کے معنی بلندی ضرور کیے جا سکتے ہیں لیکن اس لفظ کی ساخت میں بتدریج بلندی کا خیال نہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ہمالہ سطحِ سمندر تقریباً ۲۹ ہزار فٹ بلند ہے تو ہم یقینی طور پر ارتفاع (Elevation) کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں تاہم یہ مطلب نہیں نکال سکتے کہ یہ کوہستانی سلسلہ بتدریج سطحِ سمندر سے بلند ہونا ہوتا ہے۔ اسی طرح برصغیر کا براعظم افریقہ سے جدا ہونا اور پھر ایشیائی خطہ کو بتدریج ڈھکیلنے کے عمل سے یہ دنیا کی بلند ترین چوٹی کا ظہور پذیر ہونا اور اس عمل کو کروڑوں سال لگنا اس کے لیے کسی اور لفظ کا استعمال ضروری ہوگا۔ اسی طرح انسانی یا کسی بھی شے کی بتدریج نشوونما کے لیے لفظِ ارتقاء کا استعمال نزدیک ترین ہوگا۔ یعنی ڈارون (Darwin) کی تھوری یا نظریۂ ارتقاء (Evolution) کے بیان میں لفظِ ارتقاء کے استعمال سے یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ یہاں بتدریج کسی عمل کے آنے کی بات ہو رہی ہے جبکہ ارتفاع میں حتمی شکل واضح ہوتی ہے۔

اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ اُس اُصول کی بات کی جائے جس کے تحت ہر چیز اور ہر خیال یا تو بتدریج بہتر ہوتا چلا جاتا ہے یا پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یا تو ایک نئے خیال کا حصہ بن جاتا ہے یا پھر نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر رومن ہندسے I، II، X وغیرہ اب بھی ابواب کی گنتی یا گھڑیوں کے نمبروں میں استعمال ہوتے ہیں مگر ان ہندسوں کا استعمال الجبراء میں نہیں ہوتا۔ اُس کے لیے ضروری ہے کہ عربی ہندسے جن میں ''صفر'' بھی شامل ہے، 1,2,3,....10 استعمال کیے جائیں۔ یوں رومن ہندسے، عربی ہندسوں کا سب سیٹ (sub-set) بن کر ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ اور اگر انسانی دماغ بوجہ (Genetics) سائنسی ترقی میں تبدیل ہوتا ہے تو اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ ہم یہ عربی ہندسے اب سے دو ہزار سال بعد بھی استعمال کریں۔ یہ تو مثال تھی ایک غیر طبیعیاتی خیال کی۔ اسی طرح خالص طبیعیاتی اشیاء بھی مسلسل تبدیلی اور غیر بہتری کا شکار ہو کر نیست و نابود ہونے والی ہیں۔ ہمارا ستارہ (سورج) مسلسل اپنے ایندھن کی وجہ سے جل رہا ہے۔ مگر ایک وقت آنے والا ہے کہ یہ ایندھن ختم ہو جائے گا اور ہمارا ستارہ ایک ستارہ سے کبیر سرخ (Red Giant) کی شکل اختیار کر لے گا۔ اور ممکن ہے کہ آئندہ یہ شکل بھی تبدیل ہو جائے اور یہ کبیر سرخ سے تبدیل ہو کر ایک سفید مُنحنی (White Dwarf) ستارے کی شکل اختیار کرے اور ان تبدیلیوں میں زمین کو بھی ہڑپ کر جائے یا کم از کم ''سوا نیزے'' پر پہنچ جائے۔ گویا اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی ایسی چیز یا خیال نہیں جو اس اصول کے ماتحت گامزن نہ ہو۔

میں نے انگریزی میں اس اصول کو Principle of Continuous Improvement کا نام دیا ہے۔ اس کتاب کے آخر میں آپ کو انگریزی زبان میں ایک ضمیمہ (Appendix) ملے گا جس میں اس اصول کا سائنسی، حسابی اور الجبرائی لحاظ سے جائزہ بہت تفصیل سے لیا گیا ہے۔ اور ایک نئے کیلنڈر کا نظام مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس مثال میں وقت کی پیائش کا نظام چاند اور سورج کی بجائے انسانی گھڑی (Biological Clock) جو ہمارے جسم کا حصہ ہے، کے ذریعے کیا گیا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ فرصت کے اوقات میں اس مضمون کو غور سے پڑھیے اور اپنی رائے کا اظہار کیجیے۔

اب ایک انتہائی مشکل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ تمام قانونِ قدرت اور اصول جو اب تک ہم قانونِ مطلق سمجھتے آئے ہیں یا وہ اصول جن پر عمل لازم سمجھا جاتا ہے کیا ایسے قانون اور اصول خود بھی ''اصولِ بتدریج بہتری'' کے تحت مائل بہ سفر ہیں۔ کیا اگر ان میں بہتری نہ آئی تو وہ بھی نیست و نابود ہو سکتے ہیں۔ کیا یہ سوال کسی سائنسی تجربے کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اگر یہ سوال یقین کے ساتھ نفی میں دیا جا سکتا تو یہ سارا مضمون بے معنی ہوتا۔ کوئی بھی سائنسی تجربہ کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ آخر ہم کس چیز کی پیائش کرنا چاہتے ہیں۔ اس انتہائی مشکل سوال کی ایک آسان شق کو تجربہ گاہ میں رکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ انسان کے اندر پانچ حواس (Five Senses) ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہم اس کرۂ ارض کا حصہ ہیں۔ پیدا ہوتے ہیں۔ جوان ہوتے ہیں اور اگر کوئی بیماری نہ بھی ہو تو بھی جس آکسیجن پر انحصار کرتے ہوئے زندہ رہتے ہیں وہی ہمارے جسم کی رگوں کو زنگ آلود (Oxidize) کرتی رہتی ہے۔ اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ہم موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گویا اپنے وقت کی پیائش کے مطابق ایک خاص وقت گزرنے کے بعد جسمانی طور پر کرۂ ارض کی مٹی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ تاریخی طور پر ہم وقت کی پیائش سورج یا چاند کے ذریعے اٹامک کلاک (Atomic Clock) کو ایک

ذیلی حیثیت دیتے ہوئے کرتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ طریقۂ پیائش وقت بذاتِ خود ارتقاء کی راہ میں رکاوٹ ہو۔ کیا طریقۂ پیائش وقت کو بھی ''اصولِ بتدریج مسلسل بہتری'' کے ذریعے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا کرنے سے انسانی ارتقاء کا عمل تیز ہو جائے؟ یعنی کیا ہم وقت ساختِ پیائش کو ناپتے ہوئے ارتقاءِ انسانی کو بھی ناپ سکتے ہیں؟ اگر ہم ان تجربات کے ذریعے ارتقاء انسانی میں تبدیلی کو ماپنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو ایک لحاظ سے ایک محدود پیمانے پر یہ بات ثابت کر سکتے ہیں کہ ''اصولِ بتدریج و مسلسل بہتری'' اپنی جگہ درست ہے۔ اور کم از کم مزید تجربات اور ریسرچ کا مستحق ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم رات اور دن کو اُلٹ دیں یعنی رات کو جاگا کریں اور تمام کام کیا کریں اور دن بھر سویا کریں تو ممکن ہے کہ سو یا دو سو برس گزرنے کے بعد انسانی آنکھ کی بینائی میں نمایاں فرق پیدا ہو اور ہم اندھیرے میں آج کے مقابلے میں کہیں بہتر دیکھ سکیں اور اس تبدیلی کو باقاعدہ ماپ سکیں۔ بہتری کی جانب۔ یہ بات اور تجربات تفصیل سے انگریزی کے مضمون میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہاں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ قدرت نے انسان کے اندر ایک گھڑی بنائی ہے جس کا سائیکل (Cycle) چوبیس گھنٹے کے برابر نہیں ہے۔ اور یوں ہم مسلسل اس گھڑی کو درست کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس گھڑی کے مطابق چلنا شروع کریں تو ہمارے اندر بہت سی تبدیلیاں رونما ہونے کا امکان ہے۔ اجتہادی لحاظ سے یہ بات پوچھی جا سکتی ہے کہ آیا مذہب میں چاند اور سورج کے علاوہ وقت کی پیائش کی اجازت ہے تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے انگریزی کے اس مضمون میں تفصیل سے یہ بات قرآن اور سنت کے ذریعے ثابت کی ہے۔ گویا اس بات کو اجتہادی طور پر ثابت کیا گیا ہے۔ مثبت طریقے سے۔

اب ارتفاع اور ارتقاء کے مسئلے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ناسا (NASA) کے پراجیکٹ جس میں انسان کو مریخ تک پہنچانا اور متعلقہ تجربات شامل ہیں، کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔ یاد رہے کہ مریخ کا ایک دن زمینی دن سے تقریباً اڑتیس منٹ بڑا ہے۔ جبکہ اُس کا سال زمینی سال سے تقریباً دوگنا زیادہ ہے۔ گویا انسان اگر وہاں رہنا چاہے یا وہاں ایک مدت تک رہنے کے لیے ہنگامی ضرورت پیدا ہو جائے تو وقت کی پیائش اگرچہ سورج کے ذریعے کی جا سکتی ہے تاہم چاند کے مہینے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مریخ کے اپنے دو چاند ہیں جن کا مریخ کے گرد چکر زمینی چاند سے بالکل مختلف ہے۔ اور سورج سے وقت کی پیائش بے معنی ہے کیونکہ سطحِ مریخ پر زراعت ناممکن ہے۔ گویا وہ تمام معاملات جہاں سورج کی توانائی پر انحصار کا تعلق ہے، زمینی طریقے سے بالکل مختلف ہیں۔ تاہم وہ گھڑی (Biological Clock) جو ہمارے اندر نصب ہے وہ گھڑی اسی طرح ہمارے ساتھ ہے۔ گویا ہمیں اپنے وجود کی گھڑی اور اُس کے ''لا تبدیل یوم'' (Unperturbed Cycle) پر انحصار صحیح اجتہاد ہوگا۔ قدرت کی طرف سے دی گئی اسی گھڑی سے کھانے پینے، سونے جاگنے اور عبادات زندگی کا تعین کیا جائے گا اور یوں اصولِ بتدریج و مسلسل بہتری کی یہ ایک طویل سائنسی تجربے کی شکل ہوگی۔

جس سے یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ ہمیں ایک یونیورسل وقت جس کا تعلق انسان کے اندر رائج گھڑی سے ہے، قائم کرنا ہوگا۔ اور یہی ہمارا مستقبل ہے۔ اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک انتہائی اہم بات کرتا چلوں۔

وسعتِ علم کے معاملے میں مقدار اور بصیرت دونوں کا اضافہ ہوا ہے۔ جہاں تک مقدارِ علم (Quantity of Knowledge) کا تعلق ہے تو وہ آپ کے سامنے ہے اور خاص طور پر سائنسی علم اور اُس کی بنیاد میں، انسان کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل طریقۂ حیات ہے اور کسی دھڑے (Cult) کا نام نہیں تو علوم سائنس اور تحقیقات بھی ہمارے مذہب کا حصہ ہیں۔ سائنس تعریفی طور پر کبھی مکمل ہونے والی نہیں۔ لہٰذا سائنسی تحقیقات سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ اور سائنس اس اصول بتدریج و مسلسل بہتری کی پابند ہے۔ تحقیق کے دوران اگر ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جو ہمارے مذہبی عقیدے کو چیلنج کرتے ہیں تو ہمیں سچ تک پہنچنے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے۔ یاد رہے کہ اللہ کی ذات صرف اور صرف سچ ہے۔ اُس کی ذات سچائی ہے اور وہ خود جھوٹ بولنے سے عاری ہے۔ لہٰذا اسلامی نظریے سے ہم سائنس کے ''سچ'' سے خائف نہیں۔ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے مذہب کے اعتقاد کے لیے سائنس کی ضرورت نہیں۔ میں اُن کے اس عقیدے کو چیلنج نہیں کرتا۔ نہ ہی مذہب کو سائنس کے ذریعے ثابت کرنا ضروری ہے۔ تاہم وہ مذہب جو سائنسی تحقیق سے متصادم ہے اور سائنس سے لڑائی کرنے پر تلا ہوا ہے وہ اصولِ بتدریج و مسلسل بہتری کے تحت نیست و نابود ہو جائے گا۔ اسلام ایسا مذہب نہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنا عقیدہ درست کرنا ہوگا یا کم از کم اُس پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ یہاں کوئی ایمرجنسی نہیں اور آئندہ کئی نسلوں میں یہ بات مانی جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

چونکہ بات وسعتِ علم کی جانب چل نکلی ہے لہٰذا ایک خواہش کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔ کاش کہ میرے پاس ذرائع موجود ہوتے تو فوری طور سے اس پراجیکٹ پر ریسرچ شروع کرواتا۔ سائنسی اعتبار سے مسئلہ یہ ہے کہ مقدارِ علم میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں اُسی تناسب سے انسانی طبیعیاتی عمر میں اضافہ نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے اس بات پر آپ کو آمادہ کرنا ضروری ہے کہ ایسی ریسرچ کی جائے جس میں انسانی دماغ کسی مسئلے کو کم سے کم وقت میں سمجھنے کا اہل ہو سکے۔ یعنی اگر ایک معمول کے ذہن کے بچے کو جیومیٹری کے ایک مسئلے کو سمجھنے میں ایک گھنٹہ لگتا ہے تو اس ریسرچ کے ذریعے دماغی قوت کو یوں وسعت دی جائے گی کہ جیومیٹری کا وہی مسئلہ آدھ گھنٹہ یا اس سے بھی کم وقت میں سمجھا جا سکے گا۔ اور بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ ہماری بصارت، سماعت اور نیوران کی ساخت وغیرہ کو سائنسی طریقے پر بہتر سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ گویا کیا ہم استواری کے ساتھ ''اصول بتدریج و مسلسل بہتری'' پر عمل کرنے میں خود کو آمادہ کر سکتے ہیں؟ کیا انسانیت کی بقا اسی میں ہے؟ اگر ایسا ممکن ہو تو پھر ہم ایک تجربے کی بنیاد پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کسی عمر میں بھی، یہاں تک کہ بڑھاپے

کی شکل میں بھی ایک سبق کم سے کم وقت میں لینے کی جانب بڑھ سکتا ہے۔ جوں جوں علم کی مقدار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے دماغی کیفیت اور حسیت تبدیل ہوتی جاتی ہے اور نئے علم کو نہ صرف تیزی سے سمجھا جاسکتا ہے بلکہ اُسکی روشنی میں نئے علم کو بھی تخلیق کیا جاسکتا ہے۔ یوں وسعتِ علم، اس کو سمجھنا اور اس کو مزید وسعت دینا ایک طبعی عمر میں آسانی سے انجام دیا جاسکتا ہے۔

انگریزی میں دو الفاظ Idiot Savant ایک ایسے شخص کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں جو کہ یوں تو سوسائٹی میں فٹ ہوتا نہیں نظر آتا۔ اُسے ایک معذور کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر اس کا دماغ کچھ اس طرح سے کام کرتا ہے کہ کسی ایک خاص چیز میں ماہر نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ دو ہندسوں کو ضرب دینے میں ایک عام ذہن رکھنے والے انسان کے مقابلے کہیں زیادہ قدرت رکھتا ہے اور دو بڑے سے بڑے ہندسوں کو آناً فاناً ضرب دے کر جواب بتا سکتا ہے۔ میں خود اس بات کا شاہد ہوں۔ تو کیا اُصولِ بتدریج و مسلسل بہتری کے تحت دماغی نیوران یا بنیادی خلیوں (Stem Cell) کو مقدارِ علم کے بڑھتے ہوئے سمندر کے لیے تیار کیا جاسکتا ہے؟ اگر ایسا ممکن ہو تو انسان ایک نئے مقامِ علم اور ایک نئی ارتقائی منزل کو پہنچ سکتا ہے جہاں خود آگہی (Self awareness) ایک نئے اونچے جبل پر پہنچائی جاسکتی ہے۔

میں اس مضمون کے ذریعے یہ بات کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ''اصولِ بتدریج و مسلسل بہتری'' اور خیالِ ارتفاع و ارتقاء ہر چیز پر لاگو ہوتا ہے اور اگر کوئی ذات اس سے بالاتر ہے تو وہ صرف اللہ کی ذات ہی ہوسکتی ہے اور وہی ایک لا تبدیل ذات (Absolute Constant) ہے۔ باقی تمام تصورات، نوری و ناری چیزیں، مادّی اشیاء وغیرہ سب کی سب اسی اصول کے ذریعے چل رہی ہیں۔

سائنس کے اُصول بنائے اُسی کے ہیں
مریخ اور شہاب سجائے اُسی کے ہیں

لفظوں سے ماورا ہے جو گہرائی اُس کو چھان
خالق نے تجھ کو دی ہے جو سچائی اُس کو چھان

اک ہو بساطِ نو پہ نئی انجمن کا نور
بیعانۂ حیات تو پیمانۂ سرور

دستِ ہنر میں شوق کا پیمانہ چاہیے
آفاق پر نگاہ حکیمانہ چاہیے

ہر لفظ کا اُفق کے کناروں پہ ہاتھ ہو
صفوت تری غزل کا ستاروں پر ساتھ ہو

''کُن فیکون''

ہے ازل سے پہلے کا واقعہ جو میں آج نوکِ زباں کروں
ہے ابد کے بعد کی داستاں، جو ابد سے پہلے بیاں کروں

ابھی وقت پیدا نہیں ہوا، ابھی لفظِ کُن ہی کہا نہیں
ہیں تصورات اُلوہیت ابھی اور کچھ بھی بنا نہیں

نہ تو ابتداء نہ ہی انتہا نہ حدِّ نشیب و فراز ہے
نہ ہی ماپنے کو یہاں ہے کچھ نہ تو وقت ہی کا جواز ہے

نہ تو گردشِ مہ و سال ہے نہ قمر دَوَر میں سراج ہے
ابھی اک سکون و سکوت ہے ابھی وقت آج ہی آج ہے

نہ ہی انعکاس کی بات ہے، نہ ہی انعطاف کی بات ہے
ابھی نور قید ہے ذات میں، ابھی صرف رات ہی رات ہے

نہ حبیبؐ ہے نہ خلیلؑ ہے نہ جمالِ روحؑ و کلیمؑ ہے
ہے اگر تو ذات ہے صرف اک جو ذات سب سے عظیم ہے

وہ خودی کی آپ دلیل ہے کہ خودی میں اس کا وجود ہے
وہ خودی میں محو وہاں، جہاں، نہ حدود ہیں، نہ نمود ہے

وہ کمی کو دیکھ رہا ہے بس نہ ہی آئینہ و زجاج ہے
نہ کسی پہ حکم چلے ابھی، نہ ہی سلطنت، نہ ہی راج ہے

بہ خیال ایں بہ خیالِ آں کہ خیال سوچ کے درمیاں
لگے اس ''حقیقت کل'' میں بھی ہے مجاز مثل صبا رواں

یہ وجود وجہِ وجود ہے یہ سبق یہی وہ ستون ہے
یہی سب سے پہلا اصول ہے جہاں کُن وہاں فیکون ہے

○

(''مثنوی وقت'' کی پکار)

''اعلانِ حق''

عروب شاہد
(راولپنڈی)

صفوت علی صفوت اردو شاعری کا ایک غیر معروف نام ہے۔ موصوف جس طرح اپنی قلمی کاوشات میں نئے جہاں اور نئے زمان کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں کچھ اُسی طرح کی سوچ اور فکر اُن کی روزمرہ زندگی میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ رہا کرتی ہے۔ یعنی وہ زیادہ ہاؤ ہُو اور شور وشغف کے آدمی ہرگز نہیں ہیں۔ وہ ہر حال میں وقت کے ایک ایک لمحے کو کارآمد بنا کر اُس سے مفید تر نتائج حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اُن کی سائنسی فکر اردو شاعری بلخصوص اسلام اور پیغمبر اسلام نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰؐ کی نسبت سوچ اور فکر کے بہت سے نئے زاویوں کو وا کر رہی ہے۔ صفوت صاحب جس استقامت کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں اُس کی روشنی میں اُن کے مستقبل کی بابت کسی طرح کے ابہام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

صفوت علی صفوت کا خمیر خیر کی مٹی سے اُٹھا۔ لاہور میں علامہ اقبال کے سایہ دیوار میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ پاکیزہ ماحول میں ان کی شخصیت نے بال و پر نکالے، لہٰذا دشمنانِ اسلام کی سرزمین امریکہ میں رہتے ہوئے وہ فکر وعمل کے انتشار میں اپنی اصل پر قائم ودائم رہے جس کا اظہار بھی وہ اپنے اشعار کے وسیلے سے اکثر کرتے رہے۔ بش کے امریکہ میں رہتے ہوئے ان کی مجاہدانہ جسارتیں اور سرفروشانہ بے باکیاں ملاحظہ فرمائیں:

مری جانب سے جا کر آپ بش کے باپ سے کہہ دیں
کوئی اسلام کو مرہونِ منّت کر نہیں سکتا

ہو پھر سے شہنشاہی اپنی، بش جیسے ہمارے خادم ہوں
یہ بات بڑھے جیسے جیسے محمود و ایازی ہو جائیں

ڈاکٹر محبوب راہی

سیاست کا اُردو شاعری سے رشتہ کم سے کم ایک صدی پرانا ہے۔ کہیں رمز واستعارہ کے طور پر تو کہیں بیانیہ سطح پر اُردو شاعری نے عصری حیثیت کا لبادہ اوڑھ کر سیاست کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ فیضؔ ہوں یا ساحرؔ سیاست ان کے یہاں Subtle Personification کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سلسلے کے ایک اہم شاعر صفوت علی صفوتؔ ہیں۔ انھوں نے آج کی دنیا کے سب سے بڑے دہشت گرد ملک امریکہ اور اس کے مغرور وبد دماغ صدر جارج بش کی کارستانیوں کو غزل کا پیرہن عطا کیا ہے۔ دہشت گردی سے نپٹنے کے نام پر امریکہ نے افغانستان اور عراق میں جس جارحیت کا مظاہرہ کیا اس سے سبھی واقف ہیں لیکن حقیقت جب غزل کے آئینے میں اپنی صورت دیکھتی ہے تو اس کا اظہار یوں ہوتا ہے:

منسلک ہیں جنگوں سے فیل ہے نشاں جن کا
پھر نہ ہوں ابابیلیں، جھنڈا اک اڑاؤ میں
بت صدام شکنی پر میں حجت کر نہیں سکتا
حمایت بھی میں جنگ جارحیت کر نہیں سکتا
مری جانب سے جا کر آپ بش کے باپ سے کہہ دیں
کوئی اسلام کو مرہونِ منّت کر نہیں سکتا

ڈاکٹر معصوم شرقی

صفوت علی صفوتؔ کا شعری مجموعہ ان کے شعری اور ذہنی سفر کے ارتقاء کی ایک اہم کڑی ہے۔ ان کی غزل احساس اور فکر کا بہترین امتزاج ہے جس میں کلاسیکی شاعری کا احترام ہے۔ ہر شعر میں شاعر کی داخلی کیفیات، لطیف ونازک احساسات اور اس کی عملی صلاحیتوں کے ارتعاشات موجود ہیں۔ صفوت علی صفوتؔ کے سینے میں ایک حساس دل ہے جہاں لطافت جمال سے اس میں بالیدگی کے ساتھ مسرت کا تموج حرکت میں آتا ہے، ناپسندیدگی کا جذبہ نفرت کے حد پر رک نہیں جاتا بلکہ اصلاحی لائحہ عمل کی پرخلوص نشاندہی بھی کرتا ہے۔ وہ انسانیت کو جہاں انسانی قدروں سے گریز کرتے ہوئے پاتے ہیں تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تجربات ومشاہدات کو بڑے سلیقے اور بالکل نئے انداز سے شعری شکل دی ہے۔ بعض لفظیات وتراکیب انوکھے انداز کی ہیں جو نئے پن کا احساس دلاتی ہیں۔ لہجے میں سادگی بھی نظر آتی ہے اور تیکھا پن بھی مزہ دیتا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ صفوت علی صفوت نے تقلید سے گریز کرتے ہوئے اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے جو شاعری کے کینوس پر اپنے جاذب رنگوں کا احساس دلاتی ہے۔

ڈاکٹر فاروق شکیل

(صفوت کے یہاں) شعر کے دونوں مصرعوں کے مابین تعلق کا احساس، بحر کی موزونیت پر حاکمانہ نظر، الفاظ کا شاعرانہ دروبست اور نوک پلک درست، کارِ سخن قاری کو لطف دعوتِ مطالعہ کا سامان فراہم کرتے ہیں۔۔۔ کہیں کہیں نہایت باریک ولطیف زخم خوردہ جذبات کا انعکاس بھی ہے۔ بالفاظ دیگر ایک طرح کا ''Romantic Pathos''

ڈاکٹر سید امین اشرف

''صفوت علی صفوتؔ کی شاعری کو مروجہ طریقے سے نہ آپ پڑھ

سکتے ہیں اور نہ اس سے خاطر خواہ محظوظ ہو سکتے ہیں۔ ان کا تمام شعری منظر نامہ ایک ایسی قلبی اور داخلی واردات سے تعلق آمیز ہے جس میں عشق کی داستان تو ہے اور ان کی نگاہ اس کے اطراف کا جائزہ بھی لیتی ہے لیکن وہ اسی گرانیِ شب و روز سے کرب انگیز بھی ہے جہاں نظر کے طلسم معنی و مفہوم کے پردے میں دم دیدرہ جاتے ہیں۔ صفوتؔ کی شاعری کسی مانوس سطحِ زمین پر چلنے کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے شعر کو ایک آفاقی تہہ داری کے تحت دل داری کا بنانا ہی انہیں حقیقی خراجِ صداقت کا اظہار ہے، جس کے وہ حقدار بھی ہیں۔''

کرشن کمار طورؔ

''صفوت کی شاعری کو پڑھ کر ایک نئے ذائقے کا احساس ہوتا ہے جو دین ہے اس رویے کی جس نے انہیں پامال راستوں سے ہٹا کر اپنی راہ آپ نکالنے کی دعوت دی اور اسی وجہ سے ان کی شاعری میں کشادگی، تازہ کاری اور ایک خاص قسم کی کشمکش ہے۔ وسیع مشاہدات اور تجربات کے حوالے نے ان کے شعروں میں وہ تہہ داری اور رنگا رنگی پیدا کر دی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ صفوتؔ کی شاعری اجتہاد و جستجو کی شاعری ہے، ذات کی جستجو، کائنات کی جستجو، خالقِ کائنات کی جستجو، انسان کی جستجو، انسان کی نیرنگیوں کی جستجو، مظاہر قدرت کی جستجو۔۔۔ الفاظ و تراکیب اور اسلوب فن میں اجتہاد اور انحراف کی جلوہ آرائیاں نظر آتی ہیں جو اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ زندگی و شاعری کا ایک روشن رخ انحراف بھی ہے اور اچھی اور سچی شاعری کا سفر خطِ مستقیم میں نہیں ہوتا۔ راستے کے موڑ اور پیچ و خم سے سلامتی کے ساتھ گزر کر ہی کامیابی قدم چومتی ہے۔ ان کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مشرقی روایت کی جھلکیاں بھی ہیں اور آفاقی تناظر میں نئے چہروں کے عکس بھی۔''

علقمہ شبلی

صفوت علی صفوتؔ بے چین روح کے مالک ایسے سائنس داں شاعر ہیں جو خدائے ذوالجلال کے عطا کردہ علم کی روشنی میں ہر آنے والے دن کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھنے کی جستجو میں خود بھی مگن رہتے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کے شوق کو بھی مہمیز دینا نہیں بھولتے۔ اُن کا علمی، ادبی اور سائنسی سفر ایک نہ ایک روز نئے زمانوں اور نئے امکانات کو ضرور روشن تر کرنے کا باعث بنے گا۔

محسن احسان

''شاعری میں صرف موضوع یا محض خیال اہم نہیں ہوتا، اپنے موضوع کے ساتھ شاعر کی شخصی وابستگی اور اپنے خیال و فکر کے ساتھ اس کا بطنی انہماک ہی زیادہ مطلوب ہوتا ہے اور اس کے قاری کے لیے باعثِ تشفی بھی۔ صفوت علی صفوتؔ کے یہاں مذکورہ تقاضے پوار ہونے کا احساس جگہ جگہ ہوتا رہا۔ ان کے کلام میں خیالات و افکار، مشاہدات و تجربات کا حیرتناک تنوع ہے۔ ہیئت، زحاف و وزن اور پیرایۂ اظہار کی بھی رنگا رنگی ہے مگر جو وصف بطور خاص متوجہ کرتا ہے وہ شاعر کی اپنے قلم کے ساتھ دیانتدارانہ رشتگی ہے، انفرادی نظر اور رسائی ہے جو پورے کلام کو ارتکاز عطا کیے ہوئے ہے۔''

عبدالاحد سازؔ

میرے خیال میں شاعر صفوتؔ اپنے میلانِ طبع کی رُو سے غزل گو سے زیادہ نظم نگار ہیں۔ ایک بات جو سب سے اہم ہے وہ یہ کہ، کیا غزل (باعتبار ہیئت) اور کیا نظم، شاعر نے نئی نئی لفظیات اور اصطلاحات سے اُردو شاعری کا دامن مالا مال کیا ہے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ کہ ''اعلانِ حق بپیشِ سلطانِ جابر'' کی شاندار روایت کے جسمِ مُردہ میں جان پھونک دی ہے۔ غور فرمایئے کہ امریکہ میں رہ کر جارج بش کی حکومت میں اُس کے خلاف اشعار کا اشتہار کرنا کیسی جرأت کی بات ہے''۔

ناوکؔ حمزہ پوری

''صفوت علی صفوتؔ کو غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ وہ روایت کی صالح قدروں کے پاسدار و پرستار ہونے کے ساتھ ہی باعتبار موضوع اور لب و لہجہ خالص مابعد جدید شاعر ہیں، جن کی شاعری میں روحِ عصر انگڑائیاں لیتی ہیں۔ ان کی شاعری عصری زندگی کے تغیرات و تضادات، تجربات اور وقوع پذیر ہونے والے واقعات و مسائل کی ترجمان اور ان کی نمائندہ کہلانے کا استحقاق رکھتی ہے۔ صفوتؔ کی زبان سادہ تو ہے لیکن ان کے شعر سپاٹ ہونے کی اکتاہٹ اور یک رخی کے الزام سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے شعر تہہ داری، نادرہ کاری اور فنکاری کا نمونہ ہوتے ہیں۔ عام طور سے ان کے الفاظ لغت کے برعکس کچھ اور ہی تخلیقی معانی کے آفریدہ اور نا آفریدہ جہانوں سے آباد نظر آتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ صفوتؔ کی شاعری تجریدیت، تکثیریت، ابہامیت جیسے لوازمات سے مرتب ایسی شاعری ہے جو مہمل نہ ہو کر ترسیل کے تقاضوں پر کھری اُترتی ہے۔''

رفیق شاہین

''صفوتؔ کی غزلیات روایت میں رچی بسی ہوئی ہیں۔ شاعر نے اپنے دیدۂ بیدار سے زمانے کو دیکھا ہے اور عصری حقیقتوں کا اظہار کھلے دل سے کیا ہے۔ اپنے ملک سے سات سمندر پار رہتے ہوئے بھی مصنف کا اپنے شاعرانہ جذبے کو برقرار رکھنا قابل تعریف امر ہے۔ صفوتؔ کی شاعری میں اس کا ذاتی شعور کارفرما ہے اور اس کا جمالیاتی احساس شعر تازگی بخشتا نظر آتا ہے۔ صفوتؔ علی اس سے قبل انگریز میں Tiambic اور اُردو میں ''مثنوی وقت'' اور ''مثنوی رسولؐ'' جیسے سائنسی اور مذہبی نہج کے فن پاروں میں اچھی تخلیقی توانائی کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ ان کے مضامین کے مجموعے ''فکر فردا'' سے ان کے صاحبِ طرز انشاء پرداز ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔''

کلدیپ گوہرؔ

''سوادِ حور'' حمد، نعت، منقبت، ۱۰۵ غزلیات، ۱۰ نظموں، دو مثنوی، چند قطعات اور عزیزان کی شادیوں پر لکھے گئے سہروں پر مشتمل ہے۔ دیارِ مغرب

میں رہتے ہوئے بھی اردو شعر وادب سے گہرا شغف رکھنا اور مغربی تہذیب و تمدن سے اجتناب کرتے ہوئے مشرقی قدروں کی پاسداری کرنا شاعر کے ذہنی شعور اور انداز کو مترشح کرتا ہے۔ امریکی تہذیب وتمدن میں زندگی بسر کرتے ہوئے صفوتؔ کس کرب اور گھٹن سے دو چار ہیں اور کیسی کیسی ذہنی اذیتیں جھیلتے رہے ہیں، ان کا تخلیقی اظہار جا بجا ان کی شاعری میں ہوا ہے۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

صفوت علی صفوتؔ فنی اعتبار سے بقدر پختہ دستی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اسی معیار پر اظہار وڈکشن کی جانب توجہ دے رہے ہیں اور غزل کو اُسی تجربے سے گزارنے کا حوصلہ دکھاتے ہیں۔ شاید اسی لیے انہوں نے Mutual Language اور بے باکانہ طور سے غزل کے شعر کو تیز وطرار بنا کر منفرد اسلوب کا نمائندہ بنانے کی مؤثر کوشش کی ہے۔ ان کا اظہاری وطیرہ اور اسلوبی زاویہ اُن کے اعتماد، اجتہاد اور فن پر کامل یقین کا شاہد ہے۔ نئے ذائقے، نئے مخلوط لسانی اخلاقیات سے متعارف کرانے والے چند اشعار ملاحظہ ہوں

فنڈ ریزیوں، نعروں، ملینوں کے بھاؤ میں
ہو رہے ہیں پھر سے سودے صدر کے چناؤ میں
الفاظ میں جدت ہے ہر شخص جوالا ہے
اس نعت کے شاعر کا انداز نرالا ہے

قاضی رئیس

میں برادرم گلزار جاوید کا مشکور ہوں کہ اُنھوں نے نہ صرف چہارسو کے ذریعہ بلکہ صفوت صاحب کی تخلیق ''مثنوی رسولؐ'' سے سرفراز فرما کر مجھے ایک روشن فکر سائنس دان اور فلسفی شاعر سے متعارف کرا کر بہت سے نئے علوم اور نئے امکانات سے آگاہ فرمایا۔ میں وثوق سے صفوت علی صفوتؔ صاحب کے روشن ادبی اور سائنسی مستقبل کی خوشخبری آپ کو سنا سکتا ہوں۔

اکبر حمیدی

صفوت علی صفوتؔ کی شاعری کا جب ہم بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے یہاں شعور اور لاشعوری کا جو امتزاج ہے وہ بہت توانا ہے، بہت مربوط ہے۔ فکر وفن اور اسلوب ومعنی میں جو کشادگی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کا سماجی سروکار بھی سطحی نہیں ہے بلکہ تہہ دار ہے اور جس سے ان کی دردمندی عیاں ہوتی ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ صفوت علی صفوتؔ کی شاعری خواب اور حقیقت کے انضمام کی شاعری ہے۔ جس میں تہہ داری، بوقلمونی، کشادگی، سادگی، شائستگی ہے اور ایک ایسی کشش بھی جو سب کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ یہ خصوصیات ان کی غزلوں اور نظموں دونوں میں یکساں طور پر موجود ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق صدف

صفوت علی صفوتؔ کی شاعری میں علومِ جدیدہ کا عمیق مطالعہ، ذاتی تجربات ومشاہدات پر مبنی فنکارانہ بصیرت، جا بجا جذبات واحساسات کی رنگ آمیزی، پختہ شعور، داعیانہ مزاج، مذہبی اعتقادات کا پرخلوص احترام، حیاتِ انسانی کے بہتر مستقبل کی آرزومندی، ہجرت کا دُکھ، نئے معاشرے کی غلط روی پر بے لاگ تنقید لیکن نفع بخش محاسن کا کھل کر اعتراف۔ ان سب کا مجموعی تاثر ایک الگ قسم کے ذائقے سے متعارف کراتا ہے۔ شاعر جہاں عالمی سطح پر ہونے والی سیاسی، سماجی اور ادبی تبدیلیوں سے باخبر ہے، وہاں اپنے تخلیقی عمل کے بہتر نتائج سے بھی مطمئن ہے:

ہو چکی مثنوی وقت تمام
کوئی کر کے دکھائے ایسا کام

اور یہ شعر

کوئی تصویر ہی بنوا کے ہمیں دے جاؤ
چشمۂ علم سے اُٹھتے ہوئے فواروں کی

شکیل گوالیاری

صفوتؔ صاحب کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان کی نظر انسانی معاشرے کے شجر کی اہم شاخوں مثلاً گھر، دفتر، ملازمت، تجارت، سیاست، وزارت، وکالت، عدالت، درس وتدریس، صحافت، ادب وغیرہ سب پر ہے۔ صفوتؔ صاحب کی معلومات وسیع ہیں۔ وہ ایک ہی طرف کے ہو کر نہیں رہ گئے ہیں۔ ان کے یہاں کلاسیکل روایات کی پاسداری بھی ہے۔ حسن وعشق، رومان، تصوف، مہم جوئی، شوخی، طنز ومزاح بھی ان کی شاعری میں ہیں۔

اسرار اکبر آبادی

صفوت علی صفوتؔ امریکہ میں مقیم ایک ایسے شاعر کا نام ہے جس نے اپنی سادہ بیانی سے عوام کے دلوں میں اپنے لیے قابلِ احترام جگہ بنالی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی شاعری میں ترسیل کا کوئی المیہ نہیں ہے، نہ غیر مانوس الفاظ کے استعمال سے انھوں نے اپنی شاعری کو فلسفیانہ خیالات سے بوجھل بنایا۔ یہ کمال بہت مشکل سے پیدا ہوتا ہے، حالانکہ بہت زیادہ سادہ بیانی سے شاعری میں کبھی کبھی بڑا عیب پیدا ہو جاتا ہے لیکن صفوت علی صفوتؔ نے اپنی شاعرانہ مشق سے اس فن میں بڑی مہارت حاصل کر کے عوام تک پہنچانے میں ایک بڑا رول ادا کیا ہے۔ ان کے تازہ شعری مجموعے ''سوادِ حور'' میں جو شاعری ہے اس کو پڑھ کر میں یقین سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ آج کے اس دور میں جب عوام تو کیا پڑھا لکھا طبقہ بھی فارسی زدہ شاعری کو سمجھنے سے قاصر ہے، ایسے ماحول میں اس شاعری کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

سیفی سرونجی

''سوادِ حور'' پڑھتے ہوئے جو پہلا تاثر ذہن میں آیا وہ یہ ہے کہ بہت دنوں بعد کوئی ایسا مجموعۂ کلام ملا جو بڑا متنوع اور انوکھے ذائقے سے عبارت ہے۔ اس شاعری میں چونکا دینے والی صلاحیت اپنی پوری معنویت کے ساتھ موجود ہے۔ صفوت علی صفوتؔ قاری کو چونکاتے ضرور ہیں مگر اس کے بعد وہ اسے نئے

''چہارسُو''

رنگ و آہنگ اور کھلی کھلی سی فضا میں اپنے ساتھ لیے چلتے ہیں جہاں ایک عجیب سی سرشاری کا احساس ہوتا ہے۔اس نئے رنگ و آہنگ میں بہت کچھ سمٹ کر آ گیا ہے یعنی لفظیاتی اور کیفیاتی توسیع بھی اور سادگی و پرکاری بھی۔ یہاں یہ کہنے کی گنجائش نظر آتی ہے کہ صفوت بنیادی طور پر غزلوں کے شاعر ہیں۔ مجموعے کا غالب حصہ بھی غزلوں کو محیط ہے مگر ان کی نظموں کو پڑھتے ہوئے بھی ان کے منفرد لب و لہجے کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

عبیدالرحمٰن

نیویارک (امریکہ) میں مقیم جناب صفوت علی صفوت ایک صاحبِ طرز ادیب اور خوش فکر شاعر کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ دیارِ مغرب کا یہ ایک ایسا خطہ ہے جس کی اسلام دشمنی سے سبھی واقف ہیں۔ یہاں کے ناسازگار ماحول اور مخالف آندھیوں کے روبرو اپنے ایمان کی شمع جلائے رکھنا اور اپنی تحریروں سے بش جیسے آمر کو اس کی ناک کے نیچے ہدفِ ملامت بنانا حق گوئی، بے باکی اور مومنانہ فراست کی دلیل ہے اور یہ شعری مجموعہ ''سوادِ حور'' ان اوصاف کا بلیغ اشارہ ہے۔

اس سے قبل سائنس کے موضوع پر انگریزی کی کتاب Tiambic شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔اُردو مضامین کا ایک مجموعہ ''فکرِ فردا'' اور دو شعری مجموعے ''مثنوی وقت'' اور ''مثنویِ رسولؐ'' ان کی ادبی فتوحات کے ضامن ہیں۔زیرِ نظر مجموعہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ۷ تا ۲۰ صفحات تک حمد اور مناقب شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں تقریباً ۱۰۰ غزلیں اور تیسرے حصے میں متفرقات کے تحت مثنوی، آزاد اور پابند نظمیں اور کچھ قطعات و رباعیات ہیں۔

سعید رحمانی

''چہارسو'' میرے لئے متاعِ عزیز کا درجہ رکھتا ہے۔ ہر شمارے کے تمام مشمولات کا ایک سے زائد بار مطالعہ کرنے کے شوق میں اس کے مستقل قلمکار ایک طرح سے میرے لئے قریبی عزیز کا درجہ رکھتے ہیں۔ صفوت علی صفوت صاحب چونکہ روزِ اوّل سے ''چہارسو'' کے صفحات کو رونق بخشتے رہے ہیں اس لئے میرا اُن سے بطور قاری دو دہائیوں کا رشتہ ہے۔ اس طویل مطالعاتی رفاقت میں ہمیشہ میں نے صفوت صاحب کی تخلیقات میں روشن اُفق کو اُبھرتے اور سوچ کے نئے زاویوں کو نمایاں ہوتے دیکھا ہے۔ وہ شاعر، سائنس دان، فلسفی کے ساتھ کشادہ ذہن کے مالک ایسے تخلیق کار ہیں جو سوچ و فکر کے ہر زاویے اور ہر وسیلے کو نہ صرف خوش آمدید کہتے بلکہ خوش دلی سے اُس پر مکالمہ کر کے خود بھی کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور قاری کے لیے بھی نئی راہ تلاشنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

آصفہ نشاط ایک کونے میں بیٹھ کر چھپ چھپ کر محبوب کا خیالی پیکر نہیں تراشتی، جاگتی آنکھوں میں خواب نہیں سجاتی، وہ دنیا کو حقیقت کی نظروں سے دیکھتی ہے، وہ ایک ایسی باغی عورت ہے جو اَب مزید استحصال برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ عورت کو مردوں کے دل بہلانے کا کھلونا تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے، وہ مرد کے سہارے کے بغیر جینا جانتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی شاعری نے وقت کے ساتھ سفر کیا، بدلتے وقت اور سیاسی و سماجی تقاضوں کے ساتھ اس کے کلام میں بھی نہ صرف پختگی آتی گئی بلکہ اس نے ہر سماجی مسئلے کو موضوعِ سخن بنایا۔ اسی پس منظر میں اس کا اسلوب سب سے جدا، اس کی آواز سب سے الگ اور اس کا پیغام سب سے مختلف ہے اور یہی چیز آصفہ نشاط کو موجودہ شاعرات سے ممتاز کرتی ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم
(لاس اینجلس)

جو اِس طرح سے اُسے فیصلہ سنانا تھا
تو اس کے پیشِ نظر میں تھی یا زمانہ تھا

اُسے گمان کہ وعدہ نہیں کیا، اس نے
مجھے یقین کہ وعدہ اُسے نبھانا تھا

تھکن سے چور میں اتنی کہ جی کا حال اپنے
کہاں سنایا گیا اور کہاں سنانا تھا

میں اور ہی کسی امکاں کو لے کے ساتھ چلی
مری نظر میں تو نقشہ نہ تھا ، خزانہ تھا

میں رُک گئی تھی تو وہ بھی پلٹ گیا ہوتا
گنوا دیا، نہ گنواتا تو کیا بہانا تھا

(''سورج سے شکایت'' سے منتخبہ)

نجات

نعیم کوثر
(بھوپال، بھارت)

ڈاکٹر کاظم رضا نے ٹائلٹ میں مشکل سے اخبار کی دو چار سرخیاں پڑھی ہونگی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ برسوں سے ان کی عادت تھی۔ صبح اٹھتے ہی گرم گرم چائے پی۔ اخبار اٹھایا اور ٹائلٹ میں جا بیٹھے۔ انہیں بیگم رضا کے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ وہ ریسیور اٹھا چکی تھیں۔ اچانک ان کی گھبرائی آواز گونجی۔

''ہائے اللہ۔ کب کیسے!۔ میں ابھی آئی''! وہ بھاگتی ٹائلٹ کے پاس آئیں اور دروازہ پر زور سے ہتھیلی ماری۔

''ذرا جلدی نکل آئیں۔ گھنٹوں لگا دیتے ہیں'' ڈاکٹر رضا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے جلدی جلدی پانی سے تھپکیاں دیں۔ جیسے تیسے کمر بند باندھا اور ہڑ بڑا کر باہر آئے۔ آنکھیں انجانے خوف سے پھٹی پڑی تھیں۔ آواز حلق میں گھٹ سی گئی۔ بڑی مشکل سے پوچھ پائے کہ کس کا فون تھا۔ بیگم رضا کی آنکھیں نم تھیں۔

''پروفیسر ناصر کی ڈیتھ ہوگئی''! غمزدہ لہجہ میں بتایا۔ ٹائلٹ میں ہارٹ فیل ہو گیا۔ پندرہ منٹ پہلے کی بات ہے۔ فریش ہونے گئے تھے۔ دیر ہوئی تو بیوی بچوں نے آوازیں دیں۔ دروازہ بھڑ بھڑایا۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ ہوش اُڑ گئے اور گھبرا کے دروازہ توڑ دیا۔ سب ہی کے منہ سے دردناک چیخیں نکل پڑیں۔ پروفیسر ناصر اٹالین سیٹ سے نیچے گرے پڑے تھے۔ ڈاکٹر کو بلایا مگر اس نے انہیں مردہ قرار دیا۔ ڈاکٹر رضا خود ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ سر پکڑے صوفہ پر بیٹھ گئے۔ آنکھیں موند لیں۔ دھیمی آواز میں بیتی رات کا تذکرہ کرنے لگے۔ گھنٹہ بھر پروفیسر ناصر کے ڈرائنگ روم میں ماسٹر کمال الدین کے ساتھ گپ شپ چلی۔ ویٹرینری ہاسپٹل سے ریٹائرمنٹ کے بعد مہینہ بھر سے وہ پروفیسر ناصر کے گھر جا بیٹھتے تھے۔ پروفیسر ناصر یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ ماسٹر کمال الدین نے سوال ہی ایسا کیا تھا۔ کچھ پل کے لئے ڈاکٹر رضا کے چہرہ پر شام کا سا دھندلکا چھا گیا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔

''ناصر بھائی یہ منکر نکیر ہم سے قبر میں کونسی زبان میں سوال کریں گے''

پروفیسر ناصر عشاء کی نماز کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ بس اتنا بتا کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ دونوں فرشتے عربی میں سوال پوچھیں گے۔ بیگم رضا پہلے ہی سے غمزدہ تھیں۔ یہ سب سن کر ان کی پیشانی پر پسینہ کی بوندیں اُبھر آئیں۔ دوپٹہ جھلنے لگیں۔

''خدا کے لیے قبر اور منکر نکیر کا تذکرہ نہ کریں مجھے ہول اٹھنے لگتا ہے۔ دل بیٹھتا ہے''

اس دن سے ڈاکٹر رضا کے دل میں خوف نے گھر کر لیا۔ اتنے محتاط ہو گئے کہ ٹائلٹ میں اندر سے سٹکنی لگانا چھوڑ دیا۔ دروازہ بند کرتے اور اسٹیل کی بالٹی سٹا کے رکھ دیتے۔ راجدھانی کے صدر ویٹریزی ہاسپٹل میں تیس سال عزت اور دبدبہ سے گذارے۔ اعلیٰ افسران اور منتریوں میں خاصی پوچھ پرکھ رہی۔ عالیشان بنگلوں کے سبز لال پر چھوٹے بڑے ودیشی نسل کے کتے اٹھکھیلیاں کرتے نظر آتے۔ ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کے ڈاکٹر رضا نے انٹی ریبیز انجکشن نہ لگایا ہو۔ وقت ضرورت کسی نہ کسی معمولی ناسازی پر گولیاں نہ دی ہوں۔ صاحب اور میڈیم کی ''سٹ اور گو'' کی شفقت میں ڈوبی آواز پر اچھل کُود کرتے کُتے آنکھیں اور گردن جھکا پاؤں پھیلا کے بیٹھ جاتے۔ چھلانگ لگا کے منہ میں گیند جھپٹ لیتے۔ ایسا برسوں پہلے بھی ان بنگلوں میں ہوتا تھا۔ برطانوی انگلیاں پیانو پر دوڑتیں اور میڈیم کا چہیتا کتا ایرانی قالین سے چپک کر لیٹ جایا کرتا۔ سفید ڈریس اور صافہ میں ہندوستانی اردلی دن میں تین بار صاحب کے السیشین کو باہر سڑک پر گھمانے لے جاتا۔ تب اردلی سے زیادہ کتے کی شان اور تندرستی دیکھتے بنتی تھی۔ ان ولایتی آقاؤں کے کتوں کی نسل کے نام تک زبان میں لکنت پیدا کرتے تھے۔ ڈابرمین، لیبراڈور، السیشین، راٹ، سینٹ برنالڈ اور جانے کیا کیا۔ معلوم ہوتا شیکسپیئر کے ڈراموں کے کردار ہوں۔

کئی بنگلوں کے پچھواڑے سیمنٹ کی چادروں کے شیڈ میں جرسی گائے بھی جگالی کرتی دکھائی دیتی۔ یہ بھی صاحب کے کتوں جیسی سہولتوں کی حقدار ہوتی۔ ڈاکٹر رضا کی ڈیوٹی ہاسپٹل میں یوں تو عام شہری کی گائے، بھینس، بکرا بکری اور کتوں کے علاج معالجہ کے لئے تھی۔ لیکن تیس سال کی ملازمت کے دوران ایک دین بھی ایسا نہیں گذرا جب کسی آئی اے ایس، آئی پی ایس افسر کی میڈیم اور منتری کے پی۔ اے۔ کا فون نہ آیا ہو۔ فون بھی ارجنٹ اور ایسا ہی جیسا عام طور پر آپ ہم اپنے فیملی ڈاکٹر کو کیا کرتے ہیں۔

''ڈاکٹر صاحب جلدی آجایئے۔ ممی کو چکر آرہے ہیں''

''ڈاکٹر مکرجی۔ میں بول رہی ہوں مسز دھوپڑ۔ بڑا بیٹا رنجیت کل سے بخار میں تپ رہا ہے۔ میں کار بھیج رہی ہوں''

ڈاکٹر رضا کا فون سننے کا اسٹائل بھی منفرد تھا۔ گھنٹی بجتی فون اٹھاتے اور بات کرنے سے پہلے بڑی انکساری سے ''نمستے'' کہتے پھر پیغام کانوں میں اتارتے۔

''ڈاکٹر رجا'' بولنے والا نمستے کو گارڈ آف آنر کی تھاپ سمجھتا۔ ''میں مسز آچاریہ۔ ابھی آجاتے۔ وہ ہمارے باکسر نے مارننگ سے ابھی تک تین لوز موشن کر دیئے ہیں'' ڈاکٹر رضا کرسی چھوڑ دیتے۔ یہ تو چیف سیکرٹری کی بیگم کی کال تھی۔ اُن کے شوہر کا چہرہ دیکھ کر تو بڑے بڑے افسروں کی پلکیں ایسے جھپکتی ہیں جیسے طوفانی ہوا میں لالٹین کو لَو۔ منتری منڈل کی میٹنگ میں وزیر اعلیٰ کی کرسی کے

بغل میں چیف سیکرٹری کی کرسی ہوتی ہے۔شہر بھر جانتا تھا کہ ڈاکٹر رضا کے ہاتھ میں غضب کی شفا ہے۔ دودھ میں دو بار گولی گھول کر ڈال دیں۔انجکشن لگوالیں بیمار جانور شام تک بھلا چنگا ہو جاتا۔مگر شرط یہ کہ جانور دیسی نسل کا ہو۔یہی نہیں بنگلہ کی قیمتی گائے کی زچگی کے موقع پر بھی ڈاکٹر رضا کی طلبی اسی انداز میں ہوتی جب میڈیم کے دردزہ اٹھتے ہی لیڈی ڈاکٹر بُلائی جاتی ہے۔ریٹائرمنٹ سے پانچ سال پہلے موبائل فون کی وبا آئی اور ڈاکٹر رضا کی جان ذلیق میں آ گئی۔وہ آئی جی پولیس ماتھر کے لیبراڈور کا پیٹ تھپتھپا رہے ہوتے کہ رنگ ٹون آ جاتا۔دوسرا ہاتھ پاکٹ میں ڈال کر موبائل نکالتے اور نمستے کہتے۔کبھی شریواستو کمشنر کے ڈابرمین کو چھینکیں آنا اور ناک بہنا۔اُدھر دوسرے افسروں کے بنگلہ میں بھوک نہ لگنا، مزاج میں چڑچڑاپن، آنکھوں سے پانی بہنا اور بخار کی شکایتیں۔کہنے کو وہ ڈاکٹر تھے لیکن راجدھانی میں پوسٹنگ ہونا ڈاکٹر رضا کے لیے کالے پانی کی سزا سے کم نہ تھی۔وہ اس وقت اپنی ڈگری پر لعنت بھیجتے جب چیف سیکرٹری اور ڈائریکٹر جنرل پولیس کے کتا۔کتیا کے جسمانی ملاپ کو اپنی موجودگی میں تکمیل کو پہونچانا پڑتا۔

ڈاکٹر رضا لنچ میں گھر آتے۔ہاتھ دھوکر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے کہ پشو پالن منتری کی گائے کے نخرے نوالہ ہاتھ سے پلیٹ میں رکھوا دیتے۔

''ڈاکٹر صاحب۔منتری جی کی گائے ایک تھن کا دودھ اتارنے نہیں دیتی۔بچھڑا بھوکا رہ جاتا ہے''

منتری بھی کیسے ہوتے ہیں۔گھر کے لئے تینوں تھن نچوڑ لیئے۔اُن میں سے ہی بچھڑے کو پینے دیتے۔

ڈاکٹر رضا نے یہ سوچتے سوچتے کئی برس گذار دیئے کہ دیسی افسروں اور وزیروں پر ودیشی نسل کے جانور پالنے کا جنون کیوں سوار ہے۔سڑکوں پر بے شمار گائیں ہڈیوں کا ڈھانچہ لئے بھٹکتی ہیں۔کچرہ گھر میں منہ مارتی ہیں الم غلم کھاتی رہتی ہیں۔پلاسٹک کی تھیلیاں تک نگل جاتی ہیں۔ان کی دردناک حالت پر کوئی نگاہ نہیں ڈالتا۔اتنا ضرور ہے کہ کروشیا کی بُنی ٹوپی پہنے کوئی سبزی فروش کسی گائے پر لاٹھی برسا دے تو بھوک سے نڈھال کمزور اور لاغر چوپایہ ایک دم ''ماتا'' کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔نہ جانے کتنے افسر اور منتری آئے گئے۔کتے اور جرسی گائے بھی اوجھل ہو گئیں لیکن ڈاکٹر رضا اپنے کرتو پالن، لگن اور ہاتھ میں شفا کا دفینہ رکھنے کے باوجود بھی ڈپٹی ڈائریکٹر ویٹرینری سروسز کے عہدہ پر ترقی نہیں پا سکے۔پروفیسر ناصر کی موت کے بعد اُن کے دماغ میں کئی بار خیال آیا۔اور آرزو نے بھی بے چین کیا کہ کاش قبر میں منکر نکیر اُن سے پہلا سوال یہ پوچھیں۔

''کیوں ڈاکٹر کاظم رضا اتنی جھک ماری۔ناپاک جانوروں کی خدمت کی، پھر بھی تجھے پروموشن کیوں نہیں ملا؟ وہ مایوسی سے اس خیال کو جھٹک دیتے کہ سوال تو عربی زبان میں ہوگا۔وہ جواب کیسے دے پائیں گے۔اپنے دل میں چنگاری کی طرح سالہا سال سے چٹکتی شکایت کیسے بیان کریں گے۔ویسے بھی وہ سمجھتے تھے کہ جن کے کتوں اور گایوں کے دکھ درد کی زباں سمجھنے کے لئے پانچ سال ویٹرینری کالج میں جوتے گھسے مگر اُن کا درد جاننے کا افسر اور منتری کے پاس گیان تھا نہ نیت تھی۔بہرحال اگر موقع ملا وہ منکر نکیر سے ان کے سوال کے جواب میں کہہ دیں گے کہ فرق اُن کی زبان کا ایسا ہی ہے جیسا چتا سے اٹھتے شعلوں کی چرچراہٹ اور قبر میں گرتی بے آواز دو مٹھی مٹّی میں ہوتا ہے۔

ان بندھوا مصروفیات کے رہتے ڈاکٹر رضا کے پاس وقت ہی نہیں بچتا تھا کہ وہ پتن بھائی بکر قصاب کے بکرے، نرائن کھٹیک کی بھیڑیں، چھوٹی ڈیریوں کی گائے بھینس اور دوسرے لوگوں کے پالتو کتا کتیوں کی نت نئی بیماریوں کی طرف توجہ دے سکیں۔انٹی ریبیز کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ہاسپٹل کے اسٹور میں جتنے سال بھر کے لئے سپلائر سے لیے جاتے وہ تمام کے تمام بنگلوں کی نذر ہو جاتے۔دیگر لوگوں کی ضروریات پر وہ بازار سے خریدنے کا مشورہ دیتے اور پرچہ لکھ دیتے۔جتنا شکایت کرتی کہ انسانوں کے استعمال کی نقلی دوائیں ملتی رہتی ہیں اور اب جانوروں کے لیے بھی ڈپلی کیٹ دوائیں مارکیٹ میں آ گئی ہیں۔حالت ایسی ہی ہے کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ڈاکٹر رضا ریٹائر ہو کر جس آخری شام ہاسپٹل کی سیڑھیوں سے اترے۔ہار پھولوں سے لدے ہوئے انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ناموری اور عزت کا تاج سر پر تھا۔پروفیسر ناصر اور ماسٹر کمال الدین نے صلاح دی اور زور بھی ڈالا کہ وہ پرائیویٹ پریکٹس کریں۔حویلی نما مکان ہے۔بڑے آنگن کے دو حصے کر دیں تاکہ دوسری طرف بیمار جانوروں کی جانچ کے لئے شیڈ بن جائے۔ایک ہی بیٹا ہے جو امریکہ میں آٹو موبائل انجینئر ہے۔وہ واپس بھی لوٹا تب بھی مکانیت میں کمی نہیں آئیگی۔ڈاکٹر رضا نے کلینک کھول ہی لیا۔چند مہینوں میں حال ایسا ہو گیا جیسا عام طور سے شہر میں کسی ماہر اور معروف ڈاکٹر کے یہاں دیکھا جاتا ہے۔مریضوں کو ریسیپشن کاؤنٹر سے ٹوکن دیئے جاتے ہیں اور اسی کے مطابق اپنا نمبر آنے پر مریض کو ڈاکٹر کے چیمبر میں داخلہ ملتا ہے۔

لوگ رسّی تھامے شیڈ کے نیچے بکریاں، گائیں اور بھینس لیے کھڑے رہتے۔کچھ کے ہاتھ میں کتوں کی زنجیر ہوتی۔ڈاکٹر رضا کا کمپاؤنڈر ٹوکن کا نمبر پکارتا۔''ایک نمبر کس کا ہے'' جیسے عدالت میں آواز دیتا ہو ''موتی لال حاضر ہو''۔بھینس کو گھسیٹتا اس کا مالک قریب کو لاتا۔ڈاکٹر رضا تکلیف پوچھتے۔پیٹ پر بند مٹھی سے تھپکیاں دیتے۔منہ کھلواتے۔دانت دیکھتے۔چاروں تھن پر انگلیاں پھیرتے۔پھر کمپاؤنڈر سے پرچی لیکر دوائیں لکھ دیتے اور ترکیب استعمال سمجھاتے۔''بخار ہے۔اتر جائے گا۔انجکشن صبح شام لگوانا''

ڈاکٹر رضا کی مقبولیت سروس میں رہتے چاروں سمت چھائی ہوئی تھی۔اب ان کے کلینک کی دھوم مچ گئی۔شہرت اور ڈیمانڈ اتنی بڑھ گئی کہ موبائل کی رنگ سننے پر انہوں نے نمستے کہنا چھوڑ دیا۔صرف اپنا لینڈ لائن نمبر بتا دیتے کہ اس پر بات کریں۔فون ان کا کمپاؤنڈر اٹھاتا بنگلہ نمبر نوٹ کرتا، فیس اور ڈاکٹر رضا کے پہونچنے کا ٹائم بتا دیتا۔جانوروں کا سرکاری ہاسپٹل اب بھی موجود تھا۔

مگر ہاتھ میں غضب کی شفا رکھنے والے ڈاکٹر رضا موجود نہیں تھے۔ ان کی خاکساری سے لہکتی ''نمستے'' غائب تھی۔ بڑے اور شاہی افراد کے ہاتھوں پر سرسوں جمانے کی بیگار سے انہیں نجات مل گئی تھی۔ اب کنسلٹیشن فیس سنتے ہی میڈ میں کتے اور گائے کی تکلیف بیان کر کے کہتیں کہ مناسب دوا فون پر لکھوا دیں۔ لیکن کمپاؤنڈر بے رخی سے جانور کو کلینک پر لانے کی صلاح دیکر فون بند کر دیتا۔ ڈاکٹر رضا کی سوچ بالکل الگ تھی۔ پولیس ادھیکاریوں، کلکٹر اور کمشنر کے بنگلہ سے طلبی پر فوراً کان دھرتے اور بنا دیر کے وہاں پہنچ جاتے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ باعزت طریقہ سے سانس لینے کے لیے ان افسروں کی خوشنودی اتنی ہی ضروری ہوتی ہے جتنی آکسیجن۔۔۔!

پروفیسر ناصر کی ناگہانی موت کا غم ڈاکٹر رضا کے اوپر پھانسی کے پھندے جیسا جھولتا رہا کہ گردن سے دور رہتے ہوئے بھی موت کو دعوت دیتا ہے۔ جب تک جاگتے کسی نہ کسی پل اداسی گھیر لیتی۔ اس دن بھی وہ سب کچھ بھول کر گم سم کلینک سے اٹھے اور ماسٹر کمال الدین کے گھر کا رخ کیا۔ چائے کی چسکیاں لیتے پروفیسر ناصر سے برسوں کے یارانہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ باتوں کے خاتمے پر یاد آئی تو بس منکر نکیر کی۔ کہنے لگے عربی کے پروفیسر تھے بخوبی فرفر ہر سوال کا جواب دیدیا ہوگا۔ خدا کرے کامیاب رہے ہوں۔

''یہ امتحان تو لازمی ہے۔ ہم تم اور سب کو اس کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس سے نجات کا سوچنا کفر ہے''

ڈاکٹر رضا نے وحشت زدہ سے تھکے تھکے گھر میں قدم رکھا اور بیگم رضا اُن کا زرد چہرہ، خشک ہونٹ اور بکھرے بال دیکھ گھبرا گئیں۔

''خدا خیر کرے۔ آج بھی ہر دن جیسا حال بنا رکھا ہے''

وہ منہ لٹکائے صوفہ پر بیٹھے اور کچھ بولتے مگر بیگم نے ٹوک دیا ''دیکھئے جی موت تو برحق ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ ناصر بھائی کو بھول جائیں''

پسینہ پونچھتے ہوئے ڈاکٹر رضا نے کمزور آواز میں کہا۔

''ناصر بھائی کی جن حالات میں موت ہوئی سوچتا ہوں کہ کیسے عجب اور غیر یقینی سے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ سے سر پکڑتے بولتے گئے۔ کوئی بیماری نہیں تھی۔ تندرست اور بے فکر بس کبھی نزلہ زکام ہو گیا۔ ایک دن بھی پلنگ نہیں پکڑا۔ بتایئے بھلا آخری ہچکی لی تو وہ بھی ٹائلٹ میں۔ کلمہ تک پڑھنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ بیتی رات منکر نکیر کی تفصیل بتا رہے تھے۔ بیگم رضا کو اس سے پہلے بھی اس تذکرہ پر وحشت ہوئی تھی۔ خوف سے دل بیٹھنے لگا تھا۔ آج بھی کانپ اٹھیں۔

''میں کہتی ہوں مجھ پر رحم کریں۔ پھر کبھی قبر کے سوال جواب کا ذکر نہ کریں۔ میرا دم گھٹتا ہے''

ڈاکٹر رضا خدا ترس اور رحم دل انسان تھے۔ دھن دولت کی لالچ قطعی نہ تھی۔ حالانکہ وہ روزہ نماز کے سختی سے پابند نہیں تھے۔ لیکن فجر اور مغرب کی نماز پابندی سے پڑھتے۔ دن بھر جانوروں کے امراض کا معائنہ کرتے۔ تب ناپاکی کی چھینٹے ان کی مذہبی سرگرمی پر کاہلی اور اُچاہٹ پن کا بوجھ بن جاتے اتوار کو وہ کلینک بند رکھتے۔ لیکن اس اتوار کو محلّہ کی مسجد کے قریب رہنے والی شگن کاکی اپنی بیمار گائے کو لیے آدھمکی۔ پچھتر ۷۵ سال کی بوڑھی شگن ڈاکٹر رضا کی پرانی مریضہ تھی۔ گائے کیا تھی بڑھیا کی بیٹی تھی۔ چمن لال پنساری شگن کو بیاہ کر لایا تو اس کی خاندانی گائے ایک سال کی بچھڑی تھی۔ بچھڑی جوان ہوئی تو اُس کی ماں پندرھویں بار جنی لیکن بچہ پیٹ میں الٹ گیا۔ اور وہ مر گئی۔ موجودہ گائے مرنے والی کی بچھڑی تھی۔ ہر سال ایک بچھڑی وہ شومندر میں دان کر دیا کرتی تھی۔ جس دن ڈاکٹر رضا ڈاکٹر ہوئے اس دن سے شگن اپنی گائے کو معمولی سے معمولی تکلیف پر انہیں کے پاس لانے لگی۔ پرائیویٹ کلینک شروع کیا تب بھی اس کا سلسلہ یونہی جاری رہا۔ فیس کے نام پر وہ ساڑھی کے پلو میں بیس روپے کا نوٹ باندھ لاتی۔ گانٹھ کھولتی اس سے پہلے ہی ڈاکٹر رضا اسے ٹوک دیتے۔

''رہنے دے رہنے دے شگن بائی۔ میری طرف سے اسے کھلی چُنی کھلا دینا''

نوکر نے اندر آ کر شگن بائی کا بتایا۔ بیگم رضا مسکرائیں اور بولیں ''لیجیے۔ آ گئی آپ کی مرید۔ سمجھ میں نہیں آتا وہ گائے کو ہاسپٹل میں کیوں نہیں لے جاتی؟''

''ایسا نہ کہو بیگم۔ پڑوسی اور محلّہ دار کا ایک دوسرے پر پورا حق ہوتا ہے''

باہر جاتے جاتے وہ کہتے رہے کہ ہمارا ہی کیا سب کے مذہب ایسا ہی سبق پڑھاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اب ایسے سبق بچے سے پڑھے جاتے ہیں۔ شگن بائی نے ایک ہاتھ سے ماتھا پیٹا اور لجاجت سے کہنے لگی کہ گیا بھن ہے۔ دو دن سے پیٹ بھر کے دانہ نہیں کھا رہی۔ تین بار سے بچھڑا دے رہی ہے۔ ایسی دوا دیدیں کہ اب کی بار بچھڑی ہو جائے۔ ڈاکٹر رضا نے زوردار قہقہہ لگایا۔ گائے کے پیٹ پر ہاتھ پھیرا دو تین بار تھپکی دی۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد شگن بائی سے پوچھا۔

''بچھڑی کی بڑی چاہت ہے؟''

''ہاں ڈاکٹر جی۔ اب یہ بوڑھی ہو چلی ہے۔ دودھ بھی کم ہو گیا۔''

ڈاکٹر رضا گائے کی جانچ کرنے میں مشغول تو تھے لیکن شگن بائی سے باتیں بھی کرتے جاتے۔ لڑکیوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دیتے ہیں۔ لڑکوں کا جنون ہر گھر میں پھیلا ہوا ہے۔ سماج کا آخر کیا ہوگا۔ انسان کی نسل آگے کیسے چلے گی۔

''اور تمہیں، بچھڑی کی چاہت ہے شگن بائی''!

شگن بائی نے گائے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی۔

''بیل چھوٹے کسان کے کھیت اور پیٹ کے رکھوالے ہوتے ہیں ڈاکٹر جی۔ یہ گائے ہماری ماں ہے''۔ اس کا کہنا تھا کہ ماں نہ صرف گھر کی مضبوط بنیاد ہے بلکہ اس کی گود میں آنے والے دن پلتے ہیں۔ شگن بائی کی گائے کے کُھر

باقی صفحہ ۸۲ پر ملاحظہ فرمایئے

دامِ آگہی

ڈاکٹر سید سعید نقوی
(نیویارک)

تیزی سے پیچھے کی سمت بھاگتے درختوں کا درمیانی فاصلہ بڑھنے لگا، ٹرین کی رفتار آہستہ ہوتے ہوتے اب تھمنے کو تھی۔ پہیوں کی پٹری پر گرفت مضبوط ہوگئی اور ایک سیٹی کے ساتھ ٹرین رک گئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا مگر صبح کے دھندلکے میں اسٹیشن کا نام صاف پڑھا نہ جا سکا۔ کیا یہی میرا آخری اسٹیشن ہے، کیا میری منزل آ گئی۔ میں عجیب تذبذب میں تھا اتروں کہ نہیں اتروں۔ اگر ہمیں اسٹیشن آنے سے پہلے معلوم ہو جائے کہ یہی ہمارا آخری اسٹیشن ہے تو آدمی اپنا زادِ راہ سمیٹ لے اور اترنے کا انتظام کرے۔ سفر میں کتنی بار ٹرین آہستہ ہوتی ہے اور پانی لینے، دم بھرنے یا ہمسفر لینے کو سواری رکتی ہے مگر اترتا تو آدمی اپنے اسٹیشن پر ہی ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ پورے پیٹ کی گندمی رنگ کی حاملہ سامنے آ گئی۔ چہرے پر مسکان سجائے جیسے مجھ پر ہنس رہی ہو۔ مجھے ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہی ہے کہ اتر جاؤ یہی تمھارا اسٹیشن ہے۔ مگر مجھے پتہ ہے وہ جھوٹ بول رہی ہے، مجھے وقت سے پہلے اتار دینا چاہتی ہے۔ دشمن کی سچی بات بھی جھوٹی لگتی ہے، اگر یہ واقعی میرا اسٹیشن ہوتا بھی تو بھی شاید میں نہ اترتا۔ کوئی فیصلہ ہو نہ پایا تھا کہ ٹرین ایک جھٹکے سے پھر چل پڑی، وہ حاملہ عورت ایسی غائب ہوئی جیسے ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ ٹرین کے جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ یہ خواب مجھے اب ایک سال سے متواتر تنگ کر رہا ہے، گھر واپس آ گیا ہوں مگر اس سے جان نہیں چھوٹی۔ ذہن بیدار ہوا تو تقریباً سال بھر پیچھے چلا گیا:

پہلا ریڈار چوکی سے کوئی آدھے میل کے فاصلے پر تھا، پھر دوسرا کوئی پانچ سو گز کے فاصلے پر۔ نیلے رنگ کی یہ پرانی سی ٹیوٹا بہت تیزی سے چوکی کی طرف آ رہی تھی۔ ڈیوڈ نے آدھے میل کے ریڈار پر اس کی رفتار دیکھی تو چلا کر مجھے باخبر کیا۔ قصبے سے شہر کی سمت کئی سڑکیں آتی تھیں، یہ سب سے چھوٹی سڑک تھی اور شاذ و نادر ہی استعمال ہوتی تھی۔ نیم پختہ مٹی کی یہ سڑک کثرت آمد و رفت سے شاید خود ہی بن گئی تھی۔ دھول اور مٹی اتنی کہ گرد کا ایک بگولہ کار کے ساتھ ساتھ رقص کرتا آگے بڑھ رہا تھا لیکن کار سے آگے نہیں نکل پاتا تھا۔ دور دور تک میدانی زمین تھی اور کسی شے کا مستور رہنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ اسی لئے صرف میں اور ڈیوڈ ہی اس پر معمور تھے۔ چوکی کے قریب آنے سے پہلے غالباً اس کی رفتار آہستہ ہوگئی تھی۔ کم از کم ڈیوڈ نے بعد میں مجھے یہی بتایا۔ شاید اس نے چیخ کر مجھے کہا تھا کہ اب کار آہستہ ہو رہی ہے مگر میری سماعت پر طاقت کا پہرہ بیٹھا ہوا تھا۔ کار چوکی کے نزدیک ہوئی تو میں چوکی سے باہر آ کر خودکار مشین گن اس کی سمت میں تان کر کھڑا تھا۔ دونوں پاؤں کے درمیان تقریباً دو فٹ کا فاصلہ، آنکھ شست پر اور انگلی لبلبی پر۔ خون میری کنپٹیوں میں رگوں سے باہر آیا چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے میں نے کار کو رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ آپ کو میری بات ماننی چاہئے، میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔ مجھے لگا جیسے کار کے ڈرائیور نے حکم ماننے میں چند ساعتوں کی تاخیر کی ہو، یہ گندمی رنگ کے جاہل اور نافرمان لوگ بات سمجھتے کیوں نہیں۔ اس شبہ میں کہ گاڑی رک نہیں رہی اور میرے لئے خطرے کا باعث بن سکتی ہے، لبلبے پر دبی انگلی حرکت میں آ گئی۔ فضا میں مشین گن کی آواز سے سلامتی کا سناٹا ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ آہوں اور سسکیوں نے لے لی۔ بارود کی بو نے انصاف اور رواداری کے حواس مختل کر دیئے۔ ایک ادھیڑ شکل کا انسانی ڈھیر کار سے نکل کر کچی سڑک پر لڑھک گیا۔ پچھلا دروازہ کھلا اس میں سے ایک پورے پیٹ کی حاملہ بلند آواز سے نوحہ کرتی اور اپنا سینہ کوٹتی برآمد ہوئی اور کار کی اگلی مسافر نشست والے دروازے کی جانب لپکی۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ اس میں سے کوئی ہتھیار نکالے گی، ابھی میں نے اپنی مشین گن بلند کی ہی تھی کہ ڈیوڈ نے 'شٹ' کہہ کر میری مشین گن کا رخ نیچے کر دیا۔ عورت نے مسافر نشست کا دروازہ کھولا تو اس کے منہ سے ایک طویل چیخ نکلی جو گھٹ کر ایک ناقابلِ بیان فریاد میں بدل گئی۔ کار میں سے ایک لڑکا لڑھک کر سڑک پر گرنا ہی چاہتا تھا کہ عورت دھب سے زمین پر بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ لڑکے کی عمر کوئی بارہ سال کے قریب رہی ہوگی۔ اس منہ کے اور ناک سے خون جاری تھا اور وہ کسی قسم کی مدد سے بے گانہ ہو چکا تھا۔

'یہ تم نے کیا کیا جم؟' ڈیوڈ کی آنکھوں میں وحشت تھی؟

'کیا کیا' مجھے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی سنائی دی۔ 'اس سے پہلے کہ یہ دہشت گرد ہمیں مار سکتے، میں نے اس کا سدِ باب کر دیا'

'لیکن تو ایک حاملہ عورت غالباً اپنے خاندان کے ساتھ اپنے ڈاکٹر کے پاس جا رہی تھی۔ اور اس لڑکے کا کیا قصور تھا؟'

'احمقانہ باتیں مت کرو۔ اگر ان کی نیت صاف تھی تو رک کیوں نہیں رہے تھے؟'

'رک تو رہے تھے، میں نے تمھیں چیخ کر بتایا بھی تھا کہ کار آہستہ ہو رہی ہے، اور یہ بارہ سالہ لڑکا' سنپولیا ہے یہ بھی۔ میں نے اچھا کیا ابھی سے اس کا سر کچل دیا'۔

'اب کیا کریں، انکوئری ہوئی تو دونوں پھنسیں گے۔ میں اس کار کے پیچھے جا کر دو چار فائر تمھاری سمت میں کروں گا جس سے لگے کہ گاڑی ہم لوگوں پر فائر کر رہی تھی'۔

'لیکن اس کی کیا ضرورت ہے، ہمارا فرض ہے یہاں قانون نافذ

کریں اگر کوئی اس سے روگردانی کرے تو اس کو قرار واقعی سزا دیں'

'ہاں لیکن اگر روگردانی کرے تو ناں' یہ کہہ کر ڈیوڈ کار کے پیچھے چلا گیا اور چوکی کی سمت دو فائر کیئے۔ پھر بھاگتا ہوا آیا اور اس حاملہ عارت کا وزن ہلکا کرنا چاہا۔ اس عورت نے حقارت سے ہماری جانب دیکھ کر زمین پر تھوک دیا اور لڑکے کا سر گود میں رکھے بیٹھی رہی۔ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں ہاتھ سے پیٹ پکڑ کر زمین پر لیٹ گئی۔ مکر کر رہی ہے یقیناً۔ بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، جیسے ہی میں اس کے قریب جاؤں گا یہ شاید خودکش حملہ کر دے۔ ابھی میں اس ادھیڑ بن میں ہی تھا ڈیوڈ مجھے دھکا دے کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

'جم فوراً جا کر ایمبولنس کے لئے وائرلیس کرو، مجھے بچے کا سر نظر آ رہا ہے'۔ مجھے تذبذب میں دیکھ کر گویا بے بسی سے بولا

'اگر ان سب کو مار دیا تو جمہوریت کس کو سکھائیں گے'۔

جتنی دیر میں ایمبولنس پہنچتی قدرت نے مزید انتظار سے انکار کر دیا۔ ایک نومولود زندگی نے اپنی آمد کا اعلان کیا تو ڈیوڈ نے مجھے اس کی ناف کاٹنے پر مجبور کیا۔ ہر نئی زندگی دنیا میں اپنی آمد کا اعلان رو کر کیوں کرتی ہے، کبھی ہنستے گاتے کیوں نہیں آتی۔ ایمبولنس آ کر اسے لے گئی، مجھے اور ڈیوڈ کو شام میں سارجنٹ میجر کے پاس اپنے بیان قلم بند کرانے کی ہدایت مل گئی۔

'میری سمجھ میں نہیں آتا تم ان لوگوں سے کس چیز کا انتقام لے رہے ہو' ڈیوڈ نے ایمبولنس جانے کے بعد مجھے گھیر لیا۔

'انتقام کس چیز کا لینا ہے، کوئی تمھارے گھر پتھر پھینکے تو تم اس کا جواب دو گے یا نہیں؟'

'ضرور دوں گا لیکن یہ خیال ضرور رکھوں گا کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی نہ پس جائے'

'دشمن کا دوست بھی دشمن ہی ہوتا ہے' میں نے ہنس کر جواب دیا۔

'تمھاری سوچ میں طاقت زہر گھول رہی ہے' ڈیوڈ نہ جانے کس کی حمایت کر رہا تھا

'طاقت سے لہجے نہیں بدلا کرتے۔ ہم یہاں اپنے ملک سے اتنی دور ان جانوروں کو جمہوریت اور تہذیب سکھا رہے ہیں، انہیں تو ہمارا شکر گذار ہونا چاہیئے'

'طاقت اور دولت دونوں سے لہجے بدل جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی بھی ایک کا نشہ ہو اور گفتگو میں نہیں جھلکے اس کے لئے بہت ظرف بہت وسعت درکار ہوتی ہے۔ اور جہاں تک ان کے جانور ہونے کا تعلق ہے تو جانور بھی بہت سی قسموں کے ہوتے ہیں۔ کچھ وہ جو پالتو ہوتے ہیں، دوسرے وہ جنگل میں راج کرتے ہیں اور جنہیں سدھایا نہیں جا سکتا۔ ایک قسم وہ ہے جو کانچ کی دکان میں توڑ پھوڑ مچا دے تو ایک وہ جن کی دلچسپ حرکتوں سے ہم اپنے بچوں کا دل بہلاتے ہیں۔ جنگل میں راج کرنے والوں کو سدھانے کی کوشش خطرناک بھی ہو سکتی ہے' ڈیوڈ کا لہجہ معنی خیز تھا، مجھے لگتا تھا اس نے بات غیر مکمل چھوڑ دی ہے۔

'ڈیوڈ تم آخر کس کی طرفداری کر رہے ہو' مجھ سے رہا نہیں گیا۔

'تمھاری طرف نہیں ہوتا تو ٹیوٹا کی سمت سے فائرنگ کر کے تمھارے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتا' وہ طنزیہ لہجے میں بولا اس کی بات نے مجھے ایک لمحے کے لئے لاجواب سا کر دیا، پھر اچانک مجھے خیال آیا تو میں نے پوچھا 'میرے جرم پر، میں نے کیا جرم کیا ہے؟

'اس بارہ سالہ لڑکے اور اس کے باپ کی ہلاکت کو کس کھاتے میں ڈالو گے جم؟'

'اگر وہ وقت پر کار روک لیتے تو میں کیوں اپنی گولیاں برباد کرتا'۔

ڈیوڈ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ ہماری شفٹ ختم ہونے کا وقت آ رہا تھا۔ کمپنی ہیڈ کوارٹر کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ عموماً گشت پر جانے والی ٹولیاں اٹھارہ سے بیس جوانوں کی ہوتیں، بڑی چوکیوں پر پانچ سے چھ فوجیوں کی ضرورت ہوتی۔ یہ چوکی کیوں کہ چھوٹی تھی اس لئے یہاں صرف دو ہی جوانوں کی ضرورت تھی۔ بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد سائمن اور جیسن مجھے اور ڈیوڈ کو فارغ کر دیتے۔ ڈیوڈ ایسے منہ بنائے پھرتا رہا جیسے کوئی بہت بڑا حادثہ ہو گیا ہو۔ یہ کوئی پہلی بار تو نہیں ہوا تھا۔ ظاہر ہے جنگ میں جانیں نہیں جائیں گی تو اور کیا ہوگا۔ پھر شاید اس نے دیکھا ہی نہیں ایک سنپولئے کے مرنے سے پہلے ہی ایک اور وہیں سڑک پر پیدا ہو گیا تھا، قدرت کہاں تک حساب برابر کرے گی۔

شام میں ہم دونوں کا بیان لیا گیا۔ میں نے شکر کا سانس لیا جب ڈیوڈ نے بھی وہی بیان دیا جو میں نے دیا تھا۔

ٹرین اب پھر آہستہ تو ہو رہی تھی مگر لگتا تھا رکے گی نہیں۔ کھڑکی سے باہر اکا دکا گھر نظر آ رہے تھے، جن میں چراغ جل اٹھے تھے۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چھوٹے اسٹیشن پر گاڑی بہت تھوڑی ہی دیر رکتی ہے۔ مگر دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ پھر میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔ پورے دنوں سے، لگتا تھا اس کا پیٹ کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔ ہونٹوں پر وہی تاؤ دلانے والی مسکراہٹ۔ انگوٹھے کے اشارے سے دروازے کی طرف اشارہ ہے کہ اتر جاؤ۔ مگر ٹرین بجائے رکنے کے اب دوبارہ تیز ہو گئی، میں نے طنزیہ اس کی جانب مڑ کر دیکھا مگر وہ اب کہاں تھی۔

دوسرے دن ہم دونوں کی ڈیوٹی گشت پر تھی۔ بازار میں جانے والی گشتی پارٹی میں آج نو جوان شامل تھے۔ دو، دو کی ٹولیوں میں آگے پیچھے دائیں بائیں۔ بازار کھل چکا تھا۔ یہ علاقہ فتح ہوئے اب تقریباً آٹھ ماہ ہو چکے تھے اور ہماری کمپنی کا ایک دستہ روز گشت کرتا تھا لیکن پھر بھی وہ لوگ ہمارے عادی نہیں ہوئے تھے۔ اب بھی ہمارے داخل ہوتے ہی بازار کا ماحول تناؤ کا شکار ہو جاتا۔ لوگ کام کاج چھوڑ کر دکانوں کے سامنے آ کھڑے ہوتے۔ بازار کا بھاؤ تاؤ رک جاتا۔ مقامی لوگ اب بھی ہم سے بیماری کی طرح بچتے تھے۔ بازار میں ڈیوڈ

بلاوجہ لوگوں سے گھلنے ملنے کی کوشش کرتا۔ اس سے بول اس سے ہنس۔ بلاوجہ کی چھیڑ چھاڑ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان سے فاصلہ کیوں نہیں رکھتا۔

'ڈیوڈ تم ان لوگوں سے بلاوجہ اتنا گھلنا ملنا کیوں چاہتے ہو'

'بھئی ان کے دل و دماغ جیتیں گے تب ہی کوئی تبدیلی لاسکیں گے۔ زبردستی کی لائی تبدیلی تو عارضی ہوگی' ڈیوڈ ہمیشہ کا فلاسفر تھا نہ جانے فوج میں کہاں سے گھس آیا تھا۔

'لیکن ہمیں دل و دماغ جیتنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ فاتح اور مفتوح میں کچھ تو فاصلہ ہونا چاہیئے۔ انہیں خود سمجھ میں نہیں آتا ہم جو انہیں سمجھا رہے ہیں ان ہی کے بھلے کے لئے ہے۔ بالکل گنوار لوگ ہیں۔ دیکھا ہے کیسے سڑپ سڑپ آواز نکال کر طشتری میں چائے پیتے ہیں؟'

'تو طشتری میں چائے پینے میں کیا حرج ہے، ہوسکتا ہے یہی چائے پینے کا صحیح طریقہ ہو۔ بھئی چائے جلدی ٹھنڈی ہوجاتی ہے، منہ نہیں جلتا۔ آخر ہم بھی تو چائے دانی میں چائے نہیں پیتے، اسے پیالی میں نکال کر پیتے ہیں، یہ پیالی میں نہیں پیتے اسے طشتری میں نکال کر پیتے ہیں' ڈیوڈ کی ایسی بے تکی منطق ہوا کرتی تھی۔

گشت کے دوران ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور اچانک ہمارے سامنے سے راستہ کاٹ کر گذر گیا، ابھی یہ فیصلہ کر ہی رہے تھے کہ اس خطرے کی نوعیت کیا ہے کہ ایک اور سر پھرا اس کا تعاقب کرتے سامنے سے دوڑا۔ جیکب نے بندوق سیدھی کر کے چلاّ کے کہا رکو، ورنہ گولی مار دوں گا۔ پیچھے بھاگنے والا بچہ ٹھٹھک کر رکا، جیسے اسے سمجھ ہی نہیں آیا ہو کہ اپنے دوست کے پیچھے بھاگنے میں حرج ہی کیا ہے۔ بچوں کو ایک دو منزلہ عمارت میں غائب ہوتے دیکھا تو ڈیوڈ نے بندوق کا نشانہ تان لیا، فائر کرنا ہی چاہتا تھا کہ کپتان نے آرڈر دے کر اسے روک لیا۔ اس قسم کی چالبازی اکثر خطرے کا سائرن ہوتی ہے۔ سپاہیوں کو اپنے تعاقب میں الجھا کر بھاگتے اور پھر کسی ویران یا سنسان جگہ باقی پارٹی سے علیحدہ رہ جانے والے سپاہیوں کو اپنی بقا کی جنگ کرنی پڑتی۔ کپتان کے اشارے پر سپاہیوں نے مورچے بنالئے، پھر کپتان کے حکم پر میں اور ڈیوڈ ان کے تعاقب میں سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ لینڈنگ پر وہ دونوں بچے ایک عورت کے عقب میں چھپ رہے تھے۔ عورت خاصی ہراساں نظر آرہی تھی۔ مرغی کی طرح دونوں بچوں کو اپنے پروں میں سنبھال کسی بھی ممکنہ صورتِ احوال سے نبٹنے کو لئے تیار۔ پانی کی ایک دھار بچے کی نیکر کو گیلا کر کے پیر سے ہوتی، اس کے جوتے سے بہہ کر فرش کو گیلا کر رہی تھی۔ ڈیوڈ نے مجھے کور دینے کا اشارہ دیا اور سامنے والے فلیٹ کے دروازے کو ٹھوکر سے کھولا۔ نیچے بازار میں اب سناٹے کا راج تھا حالانکہ لوگوں کی تعداد اب یقیناً پہلے سے زیادہ ہوگئی تھی۔

ڈیوڈ نے عورت کو ایک طرف دھکا دیا کہ سیڑھی پر راستہ صاف ہو سکے تو وہ فلیٹ کی تلاشی لے سکے۔ عورت بچے کی حفاظت کے لئے کچھ ایسے بے ڈھنگے پن سے کھڑی تھی کہ اپنا توازن نہ سنبھال سکی۔ بچہ جو عورت کی گھیر دار شلوار پیچھے سے تھامے تھا، بروقت خود کو علیحدہ نہ کر سکا اور سیڑھیوں پر لڑھکنے لگا۔ اس کا سر ایک دیوار کو ٹکرایا اور اس کی گردن عجیب غیر فطری سے انداز میں ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ ڈیوڈ بہت دور اندیش تھا، اس نے فوراً نیچے وائی ٹا کی پر بات کر کے کیپٹن سے کمک طلب کر لی۔ بچے پر دھیان دینے کا اب وقت نہیں تھا، سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ فلیٹ کی تلاشی لے کر عمارت کو محفوظ کیا جائے۔ ڈیوڈ ایک اور سپاہی کے ساتھ فلیٹ میں داخل ہوا تو وہاں صرف ماتمی سناٹا تھا۔ پہلا بچہ ہاتھ میں ٹینس کی گیند لئے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سپاہیوں کو دیکھ کر اس نے ہاتھ بڑھا کے ٹینس کی گیند ان کی طرف پھینکنا چاہی تو ڈیوڈ نے چیخ کر سب کو زمین پر لیٹنے کا اشارہ کیا اور بندوق بچے کی سمت تان لی۔ اپنے دوسرے بچے کو سیڑھیوں پر چھوڑ کر وہ عورت لپک کر فلیٹ میں داخل ہوئی اور گیند بچے کے ہاتھ سے نکال اپنے ہاتھوں میں پکڑی اور سر سے اوپر بلند کر کے کھڑی ہوگئی۔ ڈیوڈ کی درخواست پر نیچے سے ایک بم کو ناکارہ بنانے والا ماہر آیا۔ وہ گیند واقعی صرف گیند ہی نکلی۔ سپاہیوں نے وقت کے زیاں پر بچے کو گھورا اور ایک کے پیچھے ایک اتر گئے۔ سیڑھیوں پر گرا بچہ اب کسی مدد سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ چلو ایک سنپولیا اور گیا۔

یہ شاید کوئی بڑا جنکشن تھا۔ کافی لوگ اتر اور چڑھ رہے تھے۔ شاید یہی میری منزل ہے۔ میں تیزی سے دروازے کی سمت بڑھا مگر اندر آنے والے مسافروں کے ریلے نے واپس اندر دھکیل دیا۔ 'مجھے یہاں اترنا ہے میں نے چیخ کر کہا مگر لگتا تھا سب مسافر جیسے بہرے ہوگئے ہوں یا میں انہیں نظر ہی نہیں آرہا ہوں۔ ان سب آنے والے مسافروں کے اوپر وہ ایسے تیر رہی تھی جیسے کوئی بادل اپنے پانی کے بوجھ کے باوجود ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سبب کرتا ٹرین پھر چل پڑی اور وہ حاملہ بھی نہ جانے کہاں اڑ گئی۔ میں تھک کر بنچ پر کیا بیٹھا میرا ذہن پھر ماضی میں بھٹکنے لگا؛

گھر سے دور صحرا میں رات کا وقت بہت دشوار ہوتا تھا۔ دن بھر میں کچھ سوچنے کا موقع ملتا تو شاید دن بھی طویل ہو جاتے۔ لیکن دن بھر تو فوجی مشغولیات میں آناً فاناً گذر جاتا، رات کاٹنی مشکل ہو جاتی۔ دن کا تپتا آرحیلہ صحرا رات میں ٹھنڈا ہو جاتا تو چاروں سمت سناٹے کا راج دل میں اتھل پتھل مچا دیتا۔ میں نے سرہانے سے لوسی کی تصویر نکالی اور ہونٹوں سے لگالی۔ ابھی ہماری شادی کو چار ہی سال ہوئے تھے۔ میری پہلی بیوی سے ایک لڑکا تھا جو تقریباً بارہ سال کا تھا۔ پہلی بیوی کینسر سے کیا مری کہ لڑکے کی ذمہ داری بھی میرے کاندھوں پر آن پڑی۔ لوسی سے ملاقات ہوئی تو لگا قدرت نے یہ ملاقات کسی مقصد سے ہی کروائی ہے۔ لوسی کے اپنے پہلے شوہر سے دو بچے تھے۔ یوں چار سال میں اب ہم تین بچوں کے والدین تھے۔ لوسی کی یاد کیا آئی میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے خفت سے دائیں بائیں دیکھا اور کمبل منہ کے اوپر کر لیا۔ سپاہی رویا نہیں کرتے۔ اور وہ بھی فاتح سپاہی۔ کیا ہم کبھی یہ جنگ جیت بھی سکیں گے۔ اس قسم کے سوالات ہمیں اپنے خیال و خواب میں کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔

فتح تو ہمارا مقدر ہے۔ ہم ایک بہتر تہذیب، بہتر مذہب اور بہت زیادہ بہتر فوجی طاقت کے حامل تھے۔ کیا لوسی اب سوگئی ہوگی۔ میرے اپنے شہر میں اس وقت شام کے چار بج رہے ہیں۔ ہفتے میں تین فون کالوں کی اجازت تھی۔ ایک کال میں پرسوں اتوار کو کر چکا تھا، اب دونوں کالیں بچا کر رکھ رہا تھا، غالباً جمعہ اور اتوار کو کروں گا۔ اتوار کو چرچ سے آکر لوسی سے بات ہوتی تو وہ سب کا مختصر احوال بھی بتا دیتی۔ میں خود تو شاذونادر ہی چرچ جاتا تھا لیکن اب یہاں صحرا میں گھر سے دور خیال آتا کہ کتنا وقت ضائع کیا ہے میں نے۔ واپس جا کر باقاعدگی سے چرچ جاؤں گا۔ لوسی اب کیا کر رہی ہوگی۔ ہمارے سامنے والے گھر میں جان اکیلا رہتا ہے۔ اس نے کبھی شادی کی ہی نہیں۔ کہتا ہے جب اس کے بغیر کام چل رہا ہے تو یہ جنجال کیوں پالوں۔ لوسی ہے بہت خوبصورت اور تھوڑی سی فلرٹ بھی۔ پب میں وہ خود ہی میری طرف متوجہ ہوئی تھی اور اس ہی نے مجھ سے ڈانس کی فرمائش بھی کی تھی۔ میں اسے پہلی رات ہی گھر لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن میں یہ سب کیوں سوچ رہا ہوں، اب تو لوسی بہت خوش ہے میرے ساتھ۔ اس وقت تو تنہا تھی، اب وہ تنہا نہیں ہے، اب یقیناً اس میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ نہیں لوسی غالباً اس وقت بچوں کو باغ میں لے گئی ہوگی۔ میرے بیٹے کو بیس بال کا بہت شوق ہے وہ بیس بال کے کھیل میں گیا ہوگا۔ لوسی میرے ساتھ بہت خوش ہے، لیکن مجھے یہاں آئے بھی تو آٹھ مہینے گذر چکے ہیں۔ میں نے آتے وقت جان سے کیوں کہا تھا کہ وہ لوسی کا خیال رکھے؟

آج کا دن کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ آج پھر ایک چوکی پر پوسٹنگ ہے۔ آج میرے ساتھ ڈیوڈ تعینات ہے۔ میری ڈیوڈ سے زیادہ بنتی ہے۔ وہ بھی مقامیوں کو ان کے مقام پر رکھنا پسند کرتا ہے۔ ہم دونوں آج تک یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ قبائلی بدو ہمارے شکر گذار کیوں نہیں۔ انہیں تو ہمارا بہت مشکور ہونا چاہیئے کہ ہم انہیں کمپیوٹر دور میں لے جائیں گے۔ یہ احمق سمجھتے ہیں ہم ان کی معدنی دولت کے لئے یہاں آئے ہیں۔ وہ خود اتنے پیچھے ہیں کہ اس سے استفادہ کر بھی نہیں سکتے تھے، پھر اگر یہ معدنیات نکال بھی لی جائیں تو اس سے مقامی لوگوں کو ہی تو روزگار ملے گا۔ ان کی ترقی اور بہتری کے لئے یہ سارے اقدامات ہیں۔ اور یہ اپنی پہلی فرصت میں ہمیں نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں جیسے ہم کوئی بیرونی حملہ آور ہیں کہ جس نے ان کی زمینوں پر قبضہ کر کے ان کو بے دخل کر دیا ہو۔

پچھلے چند دنوں کے واقعات سے فضا کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ ایک باہمی خوف سے امن قائم ہے۔ ہم نے جنگجو قبائلیوں کو عبرتناک سزائیں دے کر جتا دیا ہے کہ ہم یہاں کھیلنے نہیں آئے اور سرکشی برداشت نہیں کی جائے گی۔ لیکن سرکشی ان کی سرشت میں شامل ہے۔ اپنے آگے کسی کو گردانتے ہی نہیں، صرف وقت کی بات ہے یہ پھر جمع ہو کر اپنی سی کوشش کریں گے۔ چوکسی اور بے رحمی سے ہی ان سے نبٹا جا سکتا ہے۔ نہ معلوم کیوں مجھے ہمیشہ یہاں چوکی کی ڈیوٹی پر بھیج دیتے ہیں۔ ہر آنے والی گاڑی سے خطرہ ہوتا ہے کہ چلتا پھرتا میزائل ہی نہ ہو۔ وہ کپتان ہے بھی تو بہت متعصب۔ ایک تو کمبخت جنوب کا ہے اور پھر ہے بھی یہودی۔ میرے خیال میں یہ عیسائیوں سے پرخاش رکھتا ہے۔ جم بھی یہودی ہے اسے اکثر کیوں ہیڈ کوارٹر میں ہی ڈیوٹی ملتی ہے۔ میں یقیناً واپس جا کر کمانڈنٹ کو ایک مراسلہ بھیجوں گا، وہ شمال کا ہے اور پروٹسٹنٹ بھی، وہ سمجھے گا میری بات کو۔

آج کا دن بھی روز جیسا ہی ہے۔ حالتِ جنگ میں ہر روز ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ خواہ یہ جنگ ایک طرفہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہم اپنے خود ساختہ خطرات سے ہوشیار، خوفزدہ، تنہا، مقامی آبادی کو سرنگوں کرنے کا عزم لئے روز صبح اٹھتے اور رات گئے اپنے زخم اور دشمن کی لاشیں گن کر اطمینان سے سو جاتے۔ یہی روزمرہ کا معمول رہا۔ خود اپنی طاقت اور فراست سے آگاہی ہے ادھر دشمن تقریباً غاروں کے زمانے کے ہتھیاروں سے لیس ہے۔ لیکن ڈر اس کے ہتھیاروں سے نہیں بلکہ اس کے جذبوں سے ہے۔ اسی طاقت کے زعم اور جذبوں کے خوف کی ملی جلی کیفیت میں پھر گشت کی تیاری ہے۔ آج کی گشت نسبتاً آسان ہونی چاہیئے۔ یہ علاقہ اتنا گنجان نہیں اور پچھلے کئی دنوں سے اس علاقے سے اچھی رپورٹیں آ رہی تھیں۔ لگتا ہے لوگوں نے مطیع ہو کر اب سرگرانی چھوڑ دی تھی۔ سارا ملک اسی عقلمندانہ رویئے کو اختیار کرے تو کتنا اچھا ہو۔ میں واپس جا سکوں لوسی اور اپنے بیٹے تھامس کے پاس۔ آج کل ان کی یاد کچھ زیادہ ہی تنگ کر رہی ہے۔ نہ معلوم یہ لوسی کی یاد ہے یا میری محبت کی بے یقینی۔ میں واپس جاؤں گا تو وہ یقیناً میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ گشت پارٹی گیارہ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ چار، تین چار کی فارمیشن میں۔ میں درمیان میں تین کی قطار میں تھا۔ ہم نسبتاً مطمئن تھے لیکن پھر بھی پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے بڑھتے رہے۔ دائیں ہاتھ کی ایک دو منزلہ عمارت سے ایک عورت پیٹ پکڑے باہر آئی۔ سب کی بندوقیں تن گئیں، عورت درد کی شدت سے کراہ رہی تھی۔ 'یہ پورے دنوں سے ہے، وقت ہو گیا ہے' اس کے پیچھے ایک نسبتاً بڑی عمر کی عورت نے کہا۔ غالباً اس کی ماں ہوگی۔

'جم تم دیکھو، باقی لوگ اپنی جگہ پر رہیں لیکن کور کریں' سارجنٹ نے ہدایت کی۔

میں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن ایک تو سارجنٹ کا حکم ٹالنا ممکن نہیں تھا، دوسرے سب کو میرے ماضی میں نرس ٹریننگ کا علم تھا۔ عورت اب درد کی شدت سے وہیں سڑک کے کنارے لیٹ چکی تھی۔ بڑی عمر کی عورت بھی وہیں پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی اور حاملہ عورت کا سر گود میں رکھ کر رونے لگی۔ میری ہچکچاہٹ دیکھ کر سارجنٹ نے پھر آواز دی۔ 'جم کس بات کا انتظار ہے؟'

آس پاس کی عمارتوں سے کچھ سر باہر جھانکنے لگے تھے۔ یہ بات یقینی تھی کہ کئی لوگ پردے کے عقب سے ہمارا ردِعمل دیکھ رہے تھے۔ اس بات نے سارجنٹ پر دباؤ بڑھا دیا تھا کہ وہ کوئی عملی قدم اٹھائے۔ اب مزید تاخیر سے میرے ساتھیوں کو پتہ چل جاتا کہ میں کتنا خوفزدہ ہوں۔ میں نے اپنی خودکار بندوق اپنے ساتھی کو پکڑائی اور اس عورت کے نزدیک گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس

کے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔جس لمحے مجھے احساس ہوا کہ اس عورت کی شکل دیکھی بھالی ہے،اس عورت سے کتنا ملتی ہے جو اس دن چیک پوسٹ پر ملی تھی،اسی لمحے میرے داہنے ہاتھ کو پتہ چل گیا کہ اس کے پیٹ کا ابھار مصنوعی ہے۔اس کے انتقام کی رفتار میری حفاظتی پسپائی سے زیادہ تیز نکلی۔اس کا جسم ایک دھماکے سے پھٹ گیا، مجھے لگا میرے دماغ میں کسی نے ہتھوڑا دے مارا ہو، آنکھوں کے سامنے ایک سفید پردہ آ گیا پھر میں ہر احساس سے بے گانہ ہو گیا۔میری آنکھ فیلڈ ہسپتال میں کھلی۔سارا جسم پٹیوں میں بندھا ہوا تھا۔جسم کے ہر انچ پر لگتا تھا کوئی ہتھوڑے مار رہا ہو۔پپوٹوں کی دراز سے کچھ ہیولے سے نظر آئے اور بس۔

'جم کو ہوش آ گیا ہے' آواز کچھ مانوس سی تھی لیکن کس کی تھی یہ میں اندازہ نہیں کر سکا۔

'بھئی اب تو معجزوں پر یقین کرنا پڑے گا' ایک سفید کوٹ میں ملبوس شخص نے مجھ پر جھک کر اپنا اسٹیتھسکوپ میرے سینے پر رکھ دیا۔

'ڈاکٹر' میرے حواس تیزی سے واپس آ رہے تھے۔میں نے ہاتھ اٹھا کر اس سے مصافحہ کرنے کی کوشش کی تو بھک سے فیوز اڑ گیا۔داہنا ہاتھ محسوس تو ہو رہا تھا مگر وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔کہنی سے نیچے جہاں کبھی ،میرا ہاتھ تھا وہاں صرف ایک خلا تھی۔فوراً تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔مگر ڈاکٹر میری ذہنی کیفیت کو بھانپ گیا۔

'معاف کرنا جم، تمھارا بچ جانا ایک معجزہ ہے، تمھیں یاد ہے تمھارے ساتھ کیا ہوا تھا؟'

میرے ذہن میں ایک حاملہ عورت کی شبیہہ اتر آئی۔وہ شاید مجھ پر ہنس رہی تھی۔دل تو چاہا ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے سے یہ ہنسی اڑانے والی مسکراہٹ چھین لوں، مگر جتنی تیزی سے اس کی تصویر بنی تھی اتنی ہی تیزی سے غائب بھی ہو گئی۔'وہ ایک حاملہ عورت۔۔۔'

'ہاں وہ کتیا حاملہ نہیں تھی' ڈاکٹر کا لہجہ زہر آلود تھا۔'اس نے اپنے آپ کو اڑا کے تمھیں مار ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر نا کام رہی، مجھے افسوس ہے کہ ہمیں تمھارا داہنا ہاتھ اور داہنا پیر کاٹنا پڑا، مگر تم کو بچانے میں کامیاب ہو گئے'۔

'آجکل تو ایسے مصنوعی اعضا نکل آئے ہیں کہ تم بہت جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ گے۔میرا مطلب ہے بیساکھی کے سہارے چل سکو گے' اس کی پیشہ ورانہ ذمہ داری نے اسے واپس حقیقت کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔تمھارے معدے کا آپریشن کر کے وہاں ایک نالی لگا دی ہے جس کے سہارے تمھاری خوراک چلتی رہے گی۔مجھے ڈر ہے کہ یہ پیشاب کی نلکی بھی فی الحال ایک دو سال رہے گی پھر دوبارہ صورتِ احوال کا جائزہ لیں گے'۔اسے ساری تفصیل بتانے کی اتنی جلدی کیا تھی۔

'تم تو کہہ رہے تھے تم نے مجھے بچا لیا؟' میرا دماغ پوری طور پر کام کر رہا تھا۔

'ہاں، ہمیں امید تو نہیں تھی' ڈاکٹر کا دماغ شاید پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا۔

اس رات وہ پہلی بار مجھے خواب میں نظر آئی تھی۔میں ٹرین میں واپس گھر کی طرف رواں دواں تھا، اپنی معذوری سے بے خبر۔یونفارم پہنے، ہولڈال اٹھائے خوش خوش ٹرین میں جا بیٹھا ہوں میں نے اپنے حصے کی ڈیوٹی جو پوری کر لی ہے۔لوسی سے ملنے کا اشتیاق، وطن کی بو باس۔ایسے میں وہ دونوں ہاتھ پھیلائے اس تیزی سے میری سمت آئی تھی کہ میں ڈر کے پیچھے ہو گیا۔مجھے ڈرتا دیکھ کر وہ ہنس پڑی، میری سامنے والی برتھ پر بیٹھ کر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتی رہی۔نہ جانے میں اس سے کیوں اتنا خوفزدہ ہوا تھا کہ چیخ کر اٹھ بیٹھا۔نرس دوڑتی ہوئی آئی اور میں سمجھا اس نے شاید کہا تھا Post Traumatic Stress پھر بازو میں ایک انجکشن کی چبھن یاد ہے۔

اس کے بعد کی کہانی ایک معذور و مفلوج کی کہانی ہے۔نرسوں نے میرا بہت خیال رکھا۔دن میں تین وقت میرے معدے کی نالی میں مائع خوراک انڈیل دی جاتی۔کھانا تو سامنے تھا مگر میرا منہ اس کی لذت کو ترستا تھا۔مجھے دو فزیوتھیراپسٹ اٹھا کر وہیل چیئر میں بٹھا دیتے، جیسے آپ کسی بھاری بوری کو ادھر سے ادھر منتقل کر دیں۔ڈاکٹر کی امید کے برخلاف جہاں سے پیر کٹا تھا وہاں زخم میں پس پڑ گئی تھی اور میں مصنوعی پیر نہیں لگوا سکا۔نہ معلوم کیوں مجھے ہر لحظہ یہی لگتا کہ حاملہ میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ایک دفعہ میں نے اسے وہیل چیئر سے جھپٹ کر پکڑنا چاہا تو وہ غائب ہو گئی اور میں منہ کے بل زمین پر گرا۔ڈاکٹر نے البتہ مجھے ڈپریشن کی دوائیں شروع کروا دیں، اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔فیلڈ ہسپتال کے علاج سے اتنا ہوا کہ میری حالت 'نازک' سے 'خطرناک' پھر 'اطمینان بخش' ہو گئی۔

'اب تمھیں واپس بھیجا جا رہا ہے۔باقی کا علاج گھر کے پاس فوجیوں کے ہسپتال میں ہوتا رہے گا' ڈاکٹر نے اپنے تئیں مجھے خوش خبری دی۔لوسی کو میری حالت کے بارے میں اطلاع پہلے ہی دی جا چکی تھی۔کیا ساری زندگی لوسی مجھے وہیل چیئر پر سنبھال پائے گی۔وہ تو صفائی ستھرائی کی اتنی عادی ہے، ذرا سی بُو اسے ناگوار گذرتی ہے، میرے مستقل پیشاب کی نالی سے کیسے سمجھوتا کرے گی۔وہ حاملہ عورت پھر مجھے چڑانے آ گئی۔کاش میں اسے مار سکتا۔کیسے ہوتے ہیں یہ لوگ، اپنی جان کی پرواہ بھی نہیں۔کوئی مہذب آدمی بھلا کیسے خودکش بمبار بن سکتا ہے۔یہ کیوں اپنا اچھا برا نہیں پہچانتے۔ہم انہیں جمہوریت دیں گے، بہتر تہذیب اور تمدن دیں گے۔انہیں نہ جانے خودمختاری اور آزادی کی ایسی کیا مار ہے کہ اس کے لئے اپنے آپ کو اڑا دیں۔

ائیر پورٹ پر لوسی میری منتظر تھی۔مجھے وہیل چیئر پر آتے دیکھا تو بھاگ کر پاس آ گئی۔

'آ گیا میرا بہادر شوہر۔مجھے تم پر کتنا فخر ہے جم، تم جیسے سپاہیوں کی

قربانی سے ہی ہماری آزادی برقرار ہے'، اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی، آنکھوں میں آنسو۔ پھر بھی مجھے لگا وہ یہ جملے میرے لئے نہیں اپنی تسلی کے لئے بول رہی ہے۔ 'میرے جسم سے آتی پیشاب کی بو کے باوجود وہ میرے جسم سے لپٹ گئی۔ میرا منہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بے تحاشہ چومنے لگی۔ 'ذرا فکر مت کرو میں نے گھر پر سب انتظام کر لیا ہے، تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی'۔ اس نے میرا ہاتھ دبایا۔ میرے سارے خدشات دور ہو گئے۔ مجھے لوسی پر پیار بھی آیا اور فخر بھی محسوس ہوا۔ اس نے اپنا آپ میرے لئے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ اگلے کئی روز مجھے نہ ٹرین کا سفر ملا نہ ہی وہ حاملہ مجھے پریشان کرنے آئی۔ زندگی بیساکھیوں کے سہارے پہر چل پڑی۔ ایک اپاہج کی زندگی، کھانے، پینے، رفع حاجت کے لئے کسی کی محتاج زندگی۔ مجھے لگا جیسے گزرتے دنوں کے ساتھ لوسی کی تندہی میں کمی آ رہی ہے۔

'جم تمھاری پیشاب کی نالی بدلنے کا وقت ہو گیا ہے' اس نے نلکی مجھے پکڑا دی۔ اس سے پہلے ہمیشہ نلکی لوسی نے خود بدلی تھی نلکی بدلتے وقت مذاق بھی کرتی، ایک بار تو اس نے سہلانا شروع کیا مگر میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بات بدل دی۔

'نلکی بدل لو تو مجھے آواز دیدینا' شاید مصروف ہوگی میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ اس رات وہ حاملہ پھر آدھمکی۔ گندمی رنگ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، جن میں اداسی گھلی ہوئی تھی۔ میں اس سے نگاہیں ملا نہیں پاتا تھا۔ اس بار ٹرین اسٹیشن پر رکی تو وہ باقاعدہ مجھے کھینچنے لگی کہ گویا ٹرین سے نیچے کھینچ لے گی۔ وہ تو میری چیخوں کی آواز سن کر لوسی نے مجھے اٹھا دیا ورنہ آج شاید کچھ ہو جاتا۔

میرے پیر کے زخم میں ابھی تک پس پڑی ہوئی تھی۔ ہر تیسرے روز پٹی تبدیل کی جاتی۔ آج تیسرا روز تھا۔ شروع شروع میں ایک نرس آ کر گھر پر پٹی بدل جاتی پھر اس نے لوسی کو سکھا دیا کہ زخم پر پٹی کیسے بدلی جائے گی۔ حکومت ایک اپاہج پر اب مزید اخراجات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ 'میں آ رہی ہوں گرم پانی لے کر جم، پٹی بدلوانے کے لئے تیار ہو جاؤ' مجھے لوسی کی آواز سنائی دی۔ مجھے کیا تیاری کرنی تھی بس ذہنی طور پر اس درد کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گیا جو پٹی بدلنے سے ہوتی تھی۔ لوسی کا شاید مقصد بھی یہی تھا۔ وہ پانی کا تسلہ، قینچی، پٹی اور مرہم لے کر آئی تو میں اسے دیکھ کر پہلے تو بھونچکا رہ گیا پھر ہنس پڑا، اس نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔

'یہ تم نے کیا حلیہ بنایا ہوا ہے' میں نے پوچھا

'وہ دراصل، جم' اس کی آواز میں ہچکچاہٹ تھی۔ 'دراصل زخم سے بہت بدبو آتی ہے' اس نے بالآخر جملہ پورا کیا۔ میری آنکھوں میں آنسو سے بے خبر وہ پٹی بدلنے میں مصروف ہو گئی۔ درد کی شدت سے میری تو چیخیں ہی نکل گئیں۔ 'بس ذرا صبر ابھی تمھیں درد کا انجکشن دیدوں گی' اس نے مجھے پچکارا۔ پٹی بدل کر اس نیک بخت نے واقعی مجھے انجکشن لگا دیا۔ میں درد کے اندھیرے سے نکل کر خواب کی وادی میں کیا گھسا کہ ٹرین کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ ٹرین پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی، میں نے قریبی ڈنڈا پکڑ لیا کہ گر نہ پڑوں۔ 'یہ بیت الخلا کے نزدیک کیوں بیٹھے ہو، یہاں سیٹ خالی ہے یہاں آ جاؤ' کسی نے آواز دی۔ بیت الخلا کی بُو میں میری بُو دب جائے گی، اب میں اسے کیا بتاتا 'بس یہیں ٹھیک ہوں' بس اتنا ہی کہہ سکا۔ وہ حاملہ آج نہیں دیکھی۔ میں نے چاروں طرف مڑ مڑ کر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تو اچانک لوسی سامنے آ گئی۔

'جم تمھارا اسٹیشن آ گیا ہے' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر پیار سے مجھے سمجھایا۔

'واقعی، لیکن میرے خیال میں تو ابھی بہت دور ہے، یہ اسٹیشن تو میرا نہیں'، اس سے پہلے کہ میں اس سے مزید الجھتا وہ غائب ہو چکی تھی۔ پٹی والا پیر شاید مسہری کے پائے سے ٹکرایا کہ درد کی شدت سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اپنی پتلون سے بیلٹ کھینچی اور پنکھے سے باندھ کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کرنے لگا کہ انسانی وزن سے کہیں ٹوٹ تو نہیں جائے گی۔ میرا اسٹیشن آ گیا تھا۔

۔ غزل ۔

محبت کو جس سے بڑھایا نہ جائے
وہ میلہ تو ہرگز دِکھایا نہ جائے

وہی کیا وہ چلنے کی حسرت ہماری
قدم تک بھی اب جو اُٹھایا نہ جائے

ہمیشہ مناظر وہی سامنے ہوں
کہ جن سے نظر کو چُرایا نہ جائے

بجز عشق کے کون بہتر جیا ہے؟
یہ اِک دہر کو کیوں بتایا نہ جائے؟

کہ بنجر سا جیسے یہ ہر عکس ہو وہ
تصوّر کو تو ایسا پایا نہ جائے

○

رب نواز مائل

(کوئٹہ)

روح کا کرب

دیپک بدکی
(دہلی، بھارت)

انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کی بہت بڑی افسر تھی وہ۔ نام تھا شوانگی میہن۔ جب اس نے سول سروسز کا امتحان پاس کیا تھا بہت کم لڑکیاں پاس ہوتی تھیں اور جو پاس ہوتی تھیں ان میں کہیں نہ کہیں مردوں سے پنجہ لڑانے کی خفیہ خواہش ضرور نظر آتی تھی۔ خلش، جنون اور سبقت لے جانے کی للک۔ اس نے بھی ایسے ہی خواب پالے تھے۔ یہ بات الگ کہ اکلوتی اولاد ہونے کے باعث والدین نے اسے بیٹی بیٹے دونوں کا پیار دیا تھا۔ مقامی کانونٹ میں تعلیم دلوائی تھی۔ اس کی ہر بات مانی تھی اور اس کی ہر خواہش پوری کی تھی مگر انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اس طرح وہ اپنی بیٹی کے اندر خود بینی اور خود سری کا بیج بو رہے ہیں۔

پروبیشن کے دنوں میں اس کی دوستی انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس کے پروبیشنر وکاس شرما سے ہوئی۔ خوش باش، دل پھینک اور لاابالی۔ وہ کھانے پینے اور گانے بجانے کا رسیا تھا۔ دونوں دیر رات تک ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی مصوری کی سڑکوں پر گھومتے اور اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈتے۔ ہفتے کے دن وہ وہسپرنگ ونڈوز میں پوپ میوزک اور شراب کا لطف اٹھاتے۔ مدہوشی کے انہی لمحات میں شوانگی نے اپنی زندگی کی کتاب وکاس کے سامنے اس امید کے ساتھ کھول دی کہ وہ اس کی محبت کی قدر کرے گا مگر وکاس ایسے گھر کا فرد تھا جہاں ہر چیز دولت کی ترازو میں تولی جاتی تھی۔ وہ شوانگی کی دریا دلی کا فائدہ اٹھا کر اپنا ٹائم پاس کر رہا تھا۔ تربیت پا کر جب دونوں گھر لوٹے وکاس والدین کی مرضی کے مطابق ریاستی وزیرِ خزانہ کے گھر بینڈ باجا برات لے کر جا پہنچا جبکہ شوانگی انتظار کرتی رہ گئی۔

شوانگی کی زندگی کا یہ پہلا زلزلہ تھا جس کے جھٹکے وہ عمر بھر محسوس کرتی رہی۔ شاید ان جھٹکوں کی شدّت کم ہو جاتی اگر اس کو کوئی اچھا جیون ساتھی مل جاتا لیکن اس کو نہ کوئی اپنے رتبے سے بڑا اور نہ ہی کوئی ہم پلہ لڑکا مل پایا۔ مجبور ہو کر اس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

شوانگی نے اس صدمے سے خود کو نکالنے کی ہزار ہا کوشش کی لیکن نکل نہیں پائی۔ اسے یہ دنیا خود غرض، مطلبی اور دولت پرست لگنے لگی۔ وہ رات بھر ناولیں پڑھتی یا پھر ریڈیو پر مغربی سنگیت کے ساتھ اکیلے ہی تھرکتی پھر بھی وقت تھا کہ کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ سگریٹ اور شراب کا سہارا بھی اب اسے کم پڑنے لگا۔

جب زندگی سے امید کافور ہو جاتی ہے تو آدمی چستی، چالاکی اور جامہ زیبی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ عجیب سا آلکس اس کو جکڑ لیتا ہے یہاں تک کہ کوئی کام کرنے کو جی نہیں کرتا۔ شوانگی کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ کہتے ہیں آلسی سدا روگی۔ شوانگی ضرورت سے زیادہ موٹی ہونے لگی۔ اس کے بدن پر جگہ جگہ گوشت اور چربی نمایاں ہونے لگے اور اسی کے ساتھ اس کی کام کرنے کی اِچّھا بھی کم ہوتی رہی۔ زندگی کے سارے منصب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اب تو زندگی کا نصب العین محض صبح سے شام اور شام سے صبح کرنا رہ گیا تھا۔

بہرحال زندگی تو بسر کرنا تھی۔ وقتی دوست ملتے رہے لیکن شراب پی کر سب اپنے گھر لوٹ جاتے اور شوانگی اپنے فلیٹ کی دیواروں سے باتیں کرتی رہ جاتی۔ ان دوستوں میں ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو اسے پیار کے دو شبد کہہ دیتا یا پھر اس کو اپناتا۔ زندگی اتنی کٹھور ہو جائے گی اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ پہلے تو ماں باپ کا سایہ سر پر تھا لیکن اب وہ بھی نہ رہا۔

ایک روز بڑے بابو سے یوں ہی بات چیت ہو رہی تھی۔ شوانگی اپنے من کی بے چینی کو چھپا نہ سکی۔ بڑے بابو نے آفس کے ایک سابقہ ملازم کے بارے میں بتا کر شوانگی کو حیرت میں ڈال دیا۔

''میڈم آپ کو معلوم ہے ہمارے آفس میں ایک کچول مزدور تھا سدانند۔ بڑا ہی شریف، نیک اور روحانی قسم کا آدمی تھا۔ ان دنوں بڑے صاحب نے اس کی حالت پر ترس کھا کر اسے محکمے میں عارضی طور پر لگایا۔ چار پانچ سال کام کیا اور پھر ایک دن غائب ہو گیا۔ سپریم کورٹ نے انہی دنوں کچول ایمپلائیز کو مستقل کرنے کے آرڈر دیے سو ہم اس کو ڈھونڈنے لگے۔ پتہ چلا کہ اس نے ساری دنیا تیاگ دی ہے اور سرگاؤں میں اپنا ایک آشرم بنایا ہے۔ اسے ڈھونڈنے گئے تو وہاں کا منظر ہی نرالا دیکھا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں سوامی سدانند کے درشن کرنے چلے آ رہے تھے۔ رات دن بھجن کیرتن چل رہا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ سوامی جی نے کئی لوگوں کی مشکلیں آسان کر دیں یہاں تک کہ کئی مریضوں کو صحتیاب بھی کر دیا۔ دفتر میں کوئی اس بات پر یقین ہی نہیں کر سکا۔ ہم تو اس کو بیوقوف اور سر پھرا سمجھتے تھے۔''

''ایسا ہی ہوتا ہے بڑے بابو۔ اس جلد نما قبا کے نیچے کیا کچھ چھپا ہے کسی کو نہیں معلوم۔ ہم سب مکھوٹے پہن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اصلیت تو اوپر والا ہی جانتا ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ ایسے لوگوں میں عجیب سی روحانی طاقت پوشیدہ ہوتی ہے۔''

اس روز کے بعد شوانگی کے من میں سوامی سدانند کو دیکھنے کی شدید آرزو پیدا ہو گئی مگر ساتھ ہی ایک الجھن نے بھی اپنا سر ابھارا۔ دل کہتا تھا کہ جا کر سوامی جی کے درشن کر لوں لیکن دماغ مان نہیں رہا تھا۔

''ایک ادنیٰ سے ملازم کے پاس اپنا سر جھکاؤں۔ یہ کیسے ممکن ہے!'' عقل نے ٹہوکا دیا۔

''وہ اب تمہارا ملازم نہیں رہا۔ اس نے ساری دنیا تیاگ دی ہے۔ وہ تو بھگوان کا سروپ ہے۔'' عشق نے رہنمائی کی۔

''لوگ کیا کہیں گے۔ اتنی بڑی افسر اور اتنے چھوٹے سے ملازم کے پاس سر جھکانے کے لیے چلی گئی۔'' عقل نے پھر تنبیہ کی۔

''لوگوں کا کیا ہے۔ وہ تو کہتے ہی رہتے ہیں۔ انہوں نے بھگوان رام کو بھی نہیں چھوڑا۔ بھگوان کے گھر میں اونچ نیچ کوئی معنی نہیں رکھتی۔'' عشق پھر چراغِ راہ بن گیا۔

اسی تذبذب میں وہ ایک دن کھادی کی ساڑی میں ملبوس سرگاؤں پہنچ گئی۔ آج اس کو اپنا آپ نہ جانے کیوں ہلکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید دنیا کے بندھنوں سے آزاد ہونے کے لیے یہ اس کا پہلا قدم تھا۔

کیسے کیسے بندھنوں میں جکڑی تھی وہ! اتنی پڑھی لکھی اور ذہین افسر مگر ان چھوٹے چھوٹے بندھنوں سے خود کو چھڑا نہیں پا رہی تھی۔ اکیلی جان! معقول تنخواہ! اب تو اس نے ایک بڑا سا گھر بھی خرید لیا تھا جس میں رہنے سے وہ ڈر رہی تھی۔ عدم تحفظ کا احساس! اسی لیے اسے کرایے پر اٹھا دیا تھا اور خود ایک فلیٹ میں منتقل ہو چکی تھی۔ مکان سے جو کرایہ وصول ہوتا تھا وہ فلیٹ کے کرائے سے دوگنا تھا۔ اس میں بھی مالی فائدہ! سرکاری دورے پر چلی جاتی تو ہمیشہ اس بات کی کوشاں رہتی کہ میزبان اس کا بل ادا کرے۔ دیگر افسروں کی طرح ٹی اے بل کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی۔ جو اخراجات کبھی ہوتے بھی نہ تھے انہیں بھی اپنے ٹی اے بل میں دکھا دیتی۔ کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے خرچوں پر کیئر ٹیکر سے لڑ بیٹھتی۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ روپے پیسے کے معاملے میں اتنی بخیلی کیوں کرتی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ کنجوس تھی۔ کنجوس ہوتی تو کیا سگریٹ اور شراب پر اس طرح دولت لٹا دیتی۔ بس کچھ عادت سی پڑی تھی جس سے چھٹکارا نہیں مل رہا تھا۔ جب تک دم ہے تب تک غم ہے۔

خیر اب آشرم میں اس کا آنا جانا معمول بن گیا۔ سوامی جی کو اس کے بارے میں کہیں سے معلومات فراہم ہو چکی تھیں۔ وہ شوانگی کی خاطر خواہ عزت کرتا تھا اور اس کو زندگی کی حقیقت سے سمجھوتا کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شوانگی کی زندگی یوں ہی ضائع ہو۔ شوانگی بھی آشرم کے ماحول کے ساتھ گھل مل گئی۔ شکروار کی شام کو آفس بند ہونے کے بعد بلا ناغہ آشرم پہنچ جاتی اور پھر اتوار کی شام گھر لوٹ جاتی۔ اس دوران آشرم کے رکھ رکھاؤ میں وہ بھرپور حصہ لیتی۔

چند سالوں کے بعد شوانگی ریٹائر ہو گئی۔ وہ نوکری سے سبکدوش کیا ہوئی کہ آفس سے جیسے روح ہی چلی گئی۔ وہ چہچہانا، وہ ٹہا کے لگا کر ملازموں سے باتیں کرنا، بات بات پر پارٹیاں اور پھر گانا بجانا۔ جب وہ چلی گئی تو آفس میں ایک خلاء سا چھوڑ گئی اور پھر آشرم کے کاموں میں منہمک ہو گئی۔

اس کے لیے جیون کا رہسیہ ابھی تک نہیں کھلا تھا۔ وہ اپنے دل و دماغ پر جتنا زور ڈالتی اتنا ہی مایوس ہو جاتی۔ سوامی جی نے بھی حتی الامکان کوشش کی کہ شوانگی کسی بھی طرح سنبھل جائے مگر اس کے من میں پیدا ہوئی آشنکائیں مٹنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔

کچھ وقفے کے بعد شوانگی آشرم ہی میں منتقل ہو گئی۔ رات کو جب وہ اپنے کمرے میں اکیلی ہوتی تو سوچ کے سمندر میں ڈوب جاتی۔ چپکے سے اپنا بریف کیس کھولتی اور سارے پاس بکس، سیونگ سرٹیفکیٹس، شیئرس، بانڈس اور مکان کے کاغذات کھول کر بیٹھ جاتی۔ اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان سب چیزوں کا کیا کرے۔ آخر کار اس نے ایک دن اپنے وکیل کو بلایا اور اسے کہنے لگی۔

''نارنگ جی، مجھے اپنی وصیت کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے میڈم، جیسے آپ فرمائیں گی ویسا ہی ہوگا۔''

شوانگی نے نارنگ کے سامنے سارے کاغذات نکال کر رکھ دیے اور اسے پوچھا۔

''کیا آپ ان کا مارکیٹ پرائس بتا سکتے ہیں؟''

''میں تو وکیل ہوں۔ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ ہاں اندازہ لگا سکتا ہوں۔''

''اندازے سے ہی بتائیے۔''

نارنگ نے سبھی کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر کیلکولیٹر پر کچھ حساب کرنے لگا اور اس کے بعد گویا ہوا۔ ''یہی کوئی ایک کروڑ کی جائیداد ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔ اس کا وصیت نامہ بنا لیجیے۔''

''کس کے نام؟'' نارنگ نے سوال کیا۔

''سوامی سدانند ٹرسٹ کے نام۔ اس میں یہ تحریر ہونا چاہیے کہ جب میں مر جاؤں گی تو یہ ساری جائیداد ٹرسٹ کی جائیداد بن جائے گی۔ اس کام میں جو بھی خرچہ لگتا ہے وہ مجھ سے لیجیے اور رجسٹریشن کے بعد وصیت نامے کی کاپی سوامی جی کو بھی بھیج دیجیے۔''

وکیل اس کو دیکھتا رہ گیا۔ آج شوانگی کے چہرے پر سکون اور انبساط نظر آ رہا تھا۔ اس رات وہ ایسے سوئی جیسے زندگی میں کبھی نہ سو پائی تھی۔

بقیہ: **حقیقتِ منتظر**

زمیں نظارہِ فلک میں محو تھی۔۔
وہ اک آنکھ جو نم بھی تھی اور خشک بھی۔۔۔اب جیسے آسمانوں میں ایک لکیر تلاشتی تھی۔۔
انگشتِ شہادت آسماں سے ہوتی ہوئی زمیں رُخ ہو گئی۔۔
گردشِ حیات رُک گئی۔۔۔
اور
سال تھم گئے۔

احساس کا میل

رومانہ رومی
(کراچی)

وہ لوگ کچھ دنوں پہلے ہی وطن لوٹے تھے اور ہمارے پڑوس میں مکان خرید کر آباد ہوئے تھے۔ آج سے تقریباً دس سال پہلے شادی کے بعد اُس کے شوہر کو ایک فارن کمپنی میں جاب کی آفر ہوئی تو وہ لوگ باہر سیٹل ہو گئے۔ کمپنی سے معاہدہ تو صرف تین سال کا تھا مگر یہ معاہدہ بڑھتا گیا اور وہ لوگ مستقل وہیں آباد ہو گئے۔ اور پھر وہاں انہیں ہر طرح کا آرام بھی میسر تھا کیوں کہ وہاں کوالٹی آف لائف کے علاوہ اسٹینڈر آف لائف بھی تھا۔ بچے بھی اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ امن، چین اور سکون جس کی تمنا ہر شخص کو ہوتی ہے وہ سب انہیں میسر تھے اسی لئے انہیں واپس آنے کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ مگر اچانک کمپنی کے بند ہونے پر انہیں وطن واپس لوٹنا پڑا۔ اسی وجہ سے اُن لوگوں کو ایڈجسٹ ہونے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ خاتونِ خانہ کا نام سلمٰی تھا اور اُسے ہر بات میں فارن کی مثال دینے کی جیسے عادت تھی۔ میں اور وہ اکثر شاپنگ کرنے ساتھ جایا کرتے تھے۔ مارکیٹ میں سبزی خریدنے سے لے کر گوشت خریدنے تک وہ مسلسل ایک ہی جملہ دہراتی تھی ''فارن میں تو سبزی ایسی ہوتی ہے وہاں تو گوشت ایسے ملتا ہے اُف یہاں تو اتنی بدبُو ہے اور اس قدر گندگی، فارن میں تو مارکیٹ اتنی صاف سُتھری ہوتی ہے کہ فرش میں چہرہ نظر آتا ہے'' اور اگر ہم کبھی گروسری کی دکان پر رُک جاتے تو وہ پھر سے شروع ہو جاتی ''ارے یہ دیکھو ناپ تول میں کتنی بے ایمانی کر رہا ہے فارن میں تو ہر چیز صاف سُتھری اور بالکل صحیح وزن سے ملتی ہے اور وہ بھی خاص اور یہاں تو توبہ توبہ ایک تو ملاوٹ اُس پر قیمت اور پھر مرے پر سو درّے کہ وزن بھی کم'' میں اُس کی باتیں سُن کر مُسکرا دیتی تو وہ حیرانی سے میری شکل دیکھتی اور کہتی ارے اس میں مُسکرانے کی کیا بات ہے میں جھوٹ تھوڑی بول رہی ہوں ہاں مگر تمہیں کیا پتہ اگر تم وہاں رہتی تو پتہ چلتا نا اور بات آئی گئی ہو جاتی۔ اُس کے اور میرے گھر میں کام کرنے والی ماسی بھی ایک ہی تھی۔ ایک دن باتوں باتوں میں وہ بولی ''دیکھو نا ابھی تو کوئی نوکری نہیں اِن کے پاس اس لئے گھر کا خرچ سوچ سمجھ کر چلانا پڑ رہا ہے اور پھر ہر ہفتہ ڈرائی کلین میں اتنے کپڑے جاتے ہیں کہ اچھا خاصا بل بن جاتا ہے'' تب میں نے اُسے دھوبی کا مشورہ دیا کیوں کہ میرے گھر بھی ہر ہفتہ دھوبی ہی آتا تھا جسے میں پردے، بیڈ شیٹ، تولئے اور تمام کلف والے کپڑے دھونے کو دیتی تھی اُس نے میری بات کو سراہا اور پھر میرے ہی دھوبی کو کپڑے دینے شروع کر دیئے۔ میں بھی اس شہر میں اکیلی ہی رہتی تھی کیوں کہ میرا میکہ اور سُسرال دونوں ہی دوسرے شہر میں تھے میں دراصل اپنے شوہر کی وجہ سے یہاں تھی کہ ایک دن اچانک میرے سُسرال سے فون آیا کہ میری ساس کی طبیعت ٹھیک نہیں میں اور میرے شوہر پریشان ہو کر فوراً وہاں کے لئے روانہ ہو گئے۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ میرے جانے کے بعد جو دھوبی میرے گھر آتا تھا اُس کی بیوی کی طبیعت شدید خراب ہو گئی اور ڈاکٹروں نے اسے فوراً آپریشن کا مشورہ دیا لہٰذا اُسے پیسوں کی ضرورت پڑی اور وہ دوڑتا دوڑتا میرے گھر آیا مگر میرے گھر کو تالہ لگا دیکھ کہ وہ سلمٰی کے گھر پہنچا اور میرے بارے میں دریافت کیا اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ سلمٰی نے اُسے میری ساس کے بارے میں بتایا لیکن میری واپسی کے بارے میں اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ سلمٰی نے جب اُس کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو اُس نے ساری بات سلمٰی سے کہہ دی اور ڈرتے ڈرتے سلمٰی سے کچھ روپے اُدھار مانگے اور کہا کہ وہ اسے آہستہ آہستہ حساب میں برابر کرواتا جائے گا مگر سلمٰی نے اُسے بے رُخی سے منع کر دیا اور دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔ یہ تمام باتیں اُس نے مجھے میرے گھر واپس آنے پر بتائی۔ میں آج تقریباً پندرہ دن بعد گھر لوٹی تھی مجھے بہت افسوس ہوا اور میں نے سلمٰی سے کہا کہ تم اُسے پیسے دے دیتیں میں واپس آ کر تمہیں رقم دے دیتی پتہ نہیں اُس غریب کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ وہ بہت نیک اور شریف آدمی ہے اور کئی برسوں سے ہمارے گھر کام کر رہا ہے مگر آج تک اُس نے کبھی ایک روپے کا بھی ہیر پھیر نہیں کیا۔ اُس پر سلمٰی نے کہا۔

''ارے رہنے دو یہ سب دکھاوے کی باتیں ہیں۔ سب غریب لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں شکل سے بھولے اور دل کے کالے مجھے تو ان چھوٹے لوگوں پر ذرا بھی اعتبار نہیں پتہ نہیں کب کیا کر جائیں اب دیکھو نا کب سے کپڑے لے کر گیا ہے پلٹ کر ہی نہیں آیا مجھے تو اپنے کپڑوں کی فکر ہو رہی ہے۔''

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر بیل ہوئی۔ دیکھا تو دھوبی ہی تھا میں نے اُسے اندر بلایا اور پوچھا۔

''اب تمہاری بیوی کی طبیعت کیسی ہے؟'' اُس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

''بی بی جی وہ تو مجھے زندگی کے دُکھ اُٹھانے کے لئے اکیلا چھوڑ گئی''۔

میں نے اُسے پانی پلایا اور صبر کی تلقین کرنے لگی اتنے میں سلمٰی بھی برآمدے میں آ چکی تھی اور یہ سب سن کر شاید اُسے بھی افسوس ہوا تھا۔ مگر اب پچھتاوے سے کیا حاصل جب ''چڑیاں چگ گئی کھیت'' اُس نے میرے کپڑوں کا گٹھا میری طرف بڑھایا اُس وقت اُس کی نظر سلمٰی پر پڑی تو وہ بولا۔

''سلام بی بی جی! میں ابھی آپ ہی کے گھر جا رہا تھا اچھا ہوا آپ مل گئیں''۔

باقی صفحہ ۹۳ پر ملاحظہ فرمائیے

''اعجازِ زمانہ''

مشکور حسین یاد

(لاہور)

اُس کے نام سے نازِ زمانہ ہم تک پہنچا
ایک سے ایک اعزازِ زمانہ ہم تک پہنچا

معجزہ معجزہ ہم نے اُس کو چھُو کر دیکھا
اُس کا بدن اعجازِ زمانہ ہم تک پہنچا

اُس کو دیکھ کے ہم نے سب سے عشق کیا
اک اک سرافرازِ زمانہ ہم تک پہنچا

کونسے اسم کا طلسم نہیں تھا اُس کا جسم
انعامِ اندازِ زمانہ ہم تک پہنچا

سانس سانس پر ہم نے سُنی آوازِ دوست
سانس سانس پر سازِ زمانہ ہم تک پہنچا

کونسی آنکھ ہے جس نے ہم سے بات نہیں کی
عمزۂ ہر غمّازِ زمانہ ہم تک پہنچا

سمجھ گئے ہم یادؔ کہ وہ رستے میں ہے
رہ رہ کر جب رازِ زمانہ ہم تک پہنچا

○

مظفر حنفی

(دہلی، بھارت)

مداروں کی حفاظت میں انہیں پرواز کرنے دے
مجھے کچھ دیر اپنی گُمرہی پر ناز کرنے دے

جلا کر رشتۂ جاں کو، اُڑا کر گرد وحشت کی
چراغاں میں بگولے کو سفر آغاز کرنے دے

تجھے پھر سمتِ ممنوعہ بلاتی ہے۔ خدا حافظ
مجھے بھی جستجو کا ساتواں در باز کرنے دے

اگر یہ مصلحت کی برف گلنے میں نہیں آتی
تو پیدا حرفِ حق سے شعلۂ آواز کرنے دے

اجازت ہو تو میں بھی سر جھکا دوں روک لُوں نیزہ
کبھی نرغے میں اپنی حیثیت ممتاز کرنے دے

کئی بقراط شاعر پر تکلف شعر کہتے ہیں
مظفرؔ کو غزل میں دعوتِ شیراز کرنے دے

○

منظر ایوّبی
(کراچی)

بنوں کس کے لئے دربان جاناں
نہیں جب گھر میں کچھ سامان جانان

لگا کر پھر کوئی بہتان جاناں
کرو ہو قتل کا سامان جاناں

ضروری ہے جہاں پہچان جاناں
وہاں تو مت بنو انجان جاناں

نہ شہرت ہے نہ کوئی شان جاناں
کریں قربان کس پر جان جاناں

تماشہ دیکھئے، خاموش رہیئے
یہی ہے وقت کا فرمان جاناں

نہ کرنا ذکر مہنگائی کا ورنہ
نکل جائے گی میری جان جاناں

کوئی تو چاند چہرہ دل میں اترے
یہ گھر کب تک رہے ویران جاناں

گھروں میں وحشتیں ناچیں گے ہرسو
نہ ہوں گے تم سے جب مہمان جاناں

○

حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

اک مرگِ باشرف کی تمنا میں ہم جیئے!
تہمت کے جتنے داغ تھے دل پر وہ سب لیئے

جو قرضِ جاں تھا وہ بھی ادا کر دیا گیا
ہاتھوں سے کتنی بار خود اپنے کفن سیئے

روشن کرے گی راہِ وفا جس قدر رہے
بجھنے نہ پائیں گے کبھی جلتے ہوئے دیئے

کیا دیں جواب اس کے سوالوں کا سچ یہ ہے
بیٹھے ہوئے ہیں دیر سے ہم سر کو خم کیئے

صحرائے تشنگی میں گزاری تمام عمر!
ہم نے کبھی نہ ساغرِ آب بقا پیئے

کارِ ہنر تو کوئی بھی ہم سے نہ ہو سکا
بے فائدہ سے کام تھے ہم نے وہی کیئے

حرفِ سخن برتنے کا ڈھب آ گیا حسنؔ
الفاظ تھے وہی پہ معانی نئے دیئے

○

ڈاکٹر شباب للت
(شملہ، بھارت)

دل بھٹکتا رہے اُسی کے موڑ پر
تم ملے تھے جس گلی کے موڑ پر
خوبصورت حادثہ اک ہوگیا
کل اچانک زندگی کے موڑ پر
دو دلوں کی کشتیاں ٹکرا گئیں
ایک طوفانی ندی کے موڑ پر
آتے آتے ایک دن آ ہی گئے
میرے دشمن دوستی کے موڑ پر
آپ بچھڑے تو ہماری زندگی
مُڑ گئی آوارگی کے موڑ پر
بولنا میں نے سکھایا تھا جنہیں
مجھ کو لائے خامشی کے موڑ پر
جھوٹ کی خندق میں کیسے جا گرا؟
جو کھڑا تھا راستی کے موڑ پر
زندگی کیا ہے؟ بس اک اندھی گلی
ہم نے جانا اس گلی کے موڑ پر
آج کتنے نوجواں کے روزگار
آ گئے دہشت گردی کے موڑ پر
کون لے آیا میری تہذیب کو
کھینچ کر بے پردگی کے موڑ پر
کھا گیا سیلاب پوری فصل کو
ہے کسان اب خودکشی کے موڑ پر
جس میں رشتے ہونگے بے معنی شباب
ہم کھڑے ہیں اُس صدی کے موڑ پر

○

عبدالرحمٰن عبد
(نیویارک)

کِدھر کا پیار، محبت کسے، وفا کیسی
یہ میں نے مانگ لی کیا سوچ کر دعا کیسی

خراب تر ہوا جاتا ہے اس سے حال مرا
نہ جانے چارہ گر لائے ہیں یہ دوا کیسی

نہ پوچھ ہم پہ تری جستجو میں کیا گزری
کہ ہم نے ٹھوکریں کھائی ہیں جا بجا کیسی

جلے مکان ہیں لاشیں ہیں ہُو کا عالم ہے
عیاں ہے ظلم کی تصویر جا بجا کیسی

یہ جس غریب پہ ترچھی پڑی گیا جاں سے
نظر میں ڈال دی قدرت نے یہ ادا کیسی

جسے بھی دیکھیئے سوچے ہے فائیدہ اپنا
چلی ہے آجکل دنیا میں یہ ہوا کیسی

ہر ایک شخص کی گویا یہ آپ بیتی ہے
یہ بات عبدؔ نے کہہ دی ہے برملا کیسی

○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

صداؤں کو اڑانیں دے گیا ہے
کوئی گونگا اذانیں دے گیا ہے

یہاں اب احتجاجی شورشیں ہیں
ستم اِن کو زبانیں دے گیا ہے

وہ یوں دشمن کے پہرے پر بٹھا کر
ہمیں خالی کمانیں دے گیا ہے

وہ حاکم لے گیا سارے تماشے
ہمیں بس داستانیں دے گیا ہے

گیا پگڑی میں ڈالے بادشاہی
وطن کو جھوٹی شانیں دے گیا ہے

کوئی چیتا چلا آیا تھا ثاقبؔ
شکاری کو مچانیں دے گیا ہے

○

تشنہ بریلوی
(کراچی)

کاروانِ زندگی اب عرصۂ محشر میں ہے
نامۂ اعمالِ انساں میری چشمِ تر میں ہے

ایک چنگاری ابھی تک میرے خاکستر میں ہے
زلزلہ جس سے بپا دربارِ اسکندر میں ہے

زلف میں شب کا بسیرا رُخ پہ رقصاں صبحِ نو
حُسن کا سارا ہی جادو اُس پری پیکر میں ہے

میکدہ میرے لئے اب بن گیا ہے کائنات
گردشِ ادراک کا پرتو گردشِ ساغر میں ہے

اب اکیلے ہی مجھے لڑنا ہے دشمن فوج سے
ویسے رُستم سا ''روئیں تن'' بھی مرے لشکر میں ہے

کیوں ازل سے پتھروں کو یدِ قبا ہے آدمی؟
کیا کرشمہ یا الٰہی بازوئے آذر میں ہے

رات بھر رکھتی ہے مجھکو بیقرار و مضطرب
سِلوٹ اک نادیدہ ایسی بھی مرے بستر میں ہے

راہ میں لوٹے گئے یا لُٹ گئے منزل پہ ہم!
کیا اخوّت کیا مروّت رہزن و رہبر میں ہے

○

غالب عرفان
(کراچی)

رگِ شعور کا اُلجھا سِرا نہیں ملتا
مرے وجود کا کچھ سلسلہ نہیں ملتا

خدا کی کھوج میں نکلو تو زندگی ناراض
جو زندگی کو مناؤ خدا نہیں ملتا

میں آئینے کے مقابل ہوں اپنے پیروں پر
مگر یہ کیا ہے کہ چہرہ مرا نہیں ملتا

میں ذہن ودل کے تصادم میں ٹوٹ جاتا ہوں
عمل سے فکر کا جب رابطہ نہیں ملتا

صدا نہ دو کہ یہ دیوار ودر کا جنگل ہے
یہاں کسی کو کوئی ہمنوا نہیں ملتا

سکھا رہا ہوں دھڑکنا میں پتھروں کو مگر
یہ جانتا ہوں کہ اس کا صِلہ نہیں ملتا

لگن کی بات ہے عرفانؔ گھر سے نکلو تو
تلاش کرنے پہ کس کا پتہ نہیں ملتا!

○

انوار فیروز
(راولپنڈی)

دورِ ظلمت بھلا نہیں سکتے
ہم کبھی مات کھا نہیں سکتے

دوست اپنے ہیں غمزدہ جب تک
گیت خوشیوں کے گا نہیں سکتے

جن کے سینے ہوں عزم سے خالی
کوئی طوفاں اٹھا نہیں سکتے

ہم کو دشمن سے سخت نفرت ہے
ہم یہ نفرت چھپا نہیں سکتے

اشک جب تک نہ آئیں آنکھوں میں
آتشِ غم بجھا نہیں سکتے

ہم نے پلکوں پہ ان کو روک لیا
یوں ہی گوہر لُٹا نہیں سکتے

ہم پہ انوارؔ جو ستم ٹوٹے
وہ کسی کو بتا نہیں سکتے

○

پروفیسر صدیق شاہد
(شیخوپورہ)

رنجش وقہر کی ماتھے پہ شکن باقی ہے
اب کہا ں تاب وتحمل کا چلن باقی ہے

مہر ومہتاب چمکتے ہیں اجالے کے لئے
اور ستم توڑنے کو چرخِ کہن باقی ہے

اتنا بھی رحم نہیں اچھا ستم دیدوں پر
جان باقی ہے، مری جاں ابھی تن باقی ہے

سرفروشوں کے قدم اٹھتے نہیں ہیں، ورنہ
جان دینے کو ابھی دارو رسن باقی ہے

جھکتی جاتی ہے ستم گاری سے شاخ تن بھی
اور سہارے کو دلاسے کا سخن باقی ہے

محو ہوتا نہیں میں لوح جہاں سے شاہدؔ
زندہ رکھنے کو مجھے میرا چمن باقی ہے!

○

یوگیندر بہل تشنہ
(دہلی، بھارت)

عشق کا بُھوت ہے شائد سوار
ہوگیا تُو مریضِ اِنتظار
جھلملائے آنکھوں میں تصویرِ یار
اِنتظار کا ہے اپنا خمار
حُسن کے ناز و ادا سے ہوشیار
عشق بن جائے نا جی کا آزار
ترک کر دیں تم نے حد بندیاں
حُسن ہے سو جان سے تم پہ نثار
لمحہ لمحہ جینے کی لذّت نہ پوچھ
عشق تو بس عشق ہے نا پُوچھ یار
اُس کی آنکھوں سے ہے نیندیں لے اُڑا
کر گیا تمکو بھی واقفِ انتظار
ایک اکساہٹ پہ تڑپ جائے دل
آٹھوں پہر چاہے دل وصلِ یار
ڈوب کر دیکھ تو ذرا عشق میں
چودہ طبق ہونگے تم پہ آشکار
سچ تو یہ ہے آگ کا دریا ہے عشق
ڈوب کر مرجانا ہے دل فگار
یاد رکھ اُسکو نہیں حاصل دوام
بُھوت جسکا ہے ترے دل پہ سوار
عشق کر رب سے جسکو ہے ثبات
رحمتیں برسیں گی ہر لیل و نہار
بے قراری دے تجھے عشقِ بُتاں
عشقِ مولا سے تو پائے ہے قرار
تشنہؔ ہے تو ڈھونڈ ایسا میکدہ
ساقیِ کوثر سے پیئیں بے اختیار

ڈاکٹر مسرور احمد زئی

(حیدرآباد، سندھ)

لہر غم کی یہاں تھمی کیا ہے
حرفِ آزار میں کمی کیا ہے

ہے بظاہر تو ایک اطمینان
پھر یہ اندر ہماہمی کیا ہے

کیا فرشتے بہک نہیں جاتے
مجھ سا کمزور آدمی کیا ہے

بے بصر پوچھتا رہا مجھ سے
شام کی زلفِ شبنمی کیا ہے

منتخب کیوں نہیں کیا جاتا؟
میری تکمیل میں کمی کیا ہے

مات کب ہوگئی نہیں معلوم
اپنی بازی یہاں جمی کیا ہے

گر تو مسرورؔ ہے تو پھر
آنکھ میں یہ ترے نمی کیا ہے

○

شوکت فہمی

(یو۔ایس۔اے)

ہمارا ضبط کسی دن پگھل بھی سکتا ہے
دھیان رکھنا یہ لہجہ بدل بھی سکتا ہے

وہ ایک تیر جو رکھا ہوا ہے ترکش میں
کبھی کمان میں آیا تو چل بھی سکتا ہے

یوں بے زبان سمجھنا نہیں چٹانوں کو
سکوتِ سنگ سے چشمہ ابل بھی سکتا ہے

یہ ہم نے بت تو تراشا نہیں کہ حد میں رہے
یہ ایک پیڑ ہے جو پھول پھل بھی سکتا ہے

گمان تک نہیں موقع پرست لوگوں کو
کہ ان کے ہاتھ سے موقع نکل بھی سکتا ہے

ذرا سی بات کی ان کو سمجھ نہیں آئی
چمک رہا ہے جو سورج وہ ڈھل بھی سکتا ہے

اگر وہ اپنی انا سے نکل سکے فہمی
تو کوئی بیچ کا رستہ نکل بھی سکتا ہے

○

حقیقتِ منتظر

زہرہ جبین
(کینیڈا)

'خداوندا!' عباد کی آنکھوں نے آسماں کی وسعتوں کا جائزہ لیا، 'جب تُجھے ہماری ضرورت ہی نہیں ہے تو پھر تُو نے یہ دنیا کیوں بسائی۔۔۔تری کروبیاں کے لئے گر فرشتے کافی تھے تو اِس بہک جانے والے انساں کی تخلیق کیوں کی'۔۔۔اُس نے اِک عالمِ شکستگی میں آنکھیں موند لیں۔۔۔لمحوں نے سفرِ تخیل سُرعت سے طے کیا تو وہ حقیقتِ منتظر ہی تھی جو لباسِ مجاز میں سامنے آن کھڑی ہوئی۔۔۔

'تم کہ انساں۔۔۔اشرف المخلوقات۔۔۔عقل سے عہد و پیماں کے باوجود گلا ہی کرتے پائے جاتے ہو۔۔۔محبت کا آبِ زمزم تمہارے دل میں رواں ہے۔۔۔کیا تم نے کبھی عشق کی بلندیوں کو چھو کر۔۔۔اِک نرم رو ہوا کے جھونکے کی آڑ میں وجود اور تخلیق کار کے درمیان اُس خزانے کو تلاش کرنے کی سعی کی جو ازل سے جوہری کا منتظر ہے'۔۔

'خزانہ۔۔'عباد کی آنکھیں کُھلیں اور وہ سبک خرام مست ہواؤں کے خرابوں میں جیسے گُم ہو گیا

'ہاں۔۔۔خزانہ۔۔۔'حقیقت اُس کے سینے پر آ بیٹھی

'ہونہہ'عباد نے ایک گہری سانس لی

'ہاں ۔۔ وہ خزانہ ایک راز ہے۔۔۔جسے گر تم جان لو تو ایک خواہش۔۔اک ادھوری تمنا کو تکمیل کا راستہ مل جائے'

'کیسے۔۔۔کیسے۔۔۔میں کیسے جان لوں ۔۔ کیونکر جان لوں ۔۔۔'عباد کا ہاتھ سینے پر سے رینگتا ہوا عین دل پر جا رُکا۔

'یہی تو بتانا میرا وصف ہے'۔۔

'کیا کہتے ہیں اُسے۔۔۔'عباد کی سرگوشی نے حقیقت مہمیز کیا

'عباد یہ وجدان و ادراک کے سلسلے ہیں'۔۔۔حقیقت روکھی سی تھی

'تو پھر بتاؤ نا'عباد کے لب نرم پڑ گئے

'یہ دیکھو۔۔'حقیقت کا لبادہ ذرا اُونچا ہوا۔۔۔'میں نے تمہارے لئے ایک آئینہ بنایا ہے۔۔۔جو اُس دل کی طرح خوبصورت ہے جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی نہ صرف دھڑکنا جان لیتا ہے بلکہ باقاعدہ دھڑکتا بھی ہے۔۔۔'

'میں۔۔۔میرا دل'۔۔۔عباد نیم غنودہ سا تھا۔۔

'جب پہلی بار دھڑکا تھا۔۔۔ماں کے شکم میں'۔۔۔حقیقت بڑی حسین تھی۔۔۔رخساروں کی دمک کے سامنے ستارے بے نشاں تھے۔۔اور آنکھوں میں شرارت کی گلابی وائن (Wine) کا خمار بن پئے ہی تھا۔۔

'تو۔۔۔تو۔۔'عباد ڈوبتا جاتا تھا۔۔۔

'یہ شیشہ۔۔۔یہ آئینہ...تمہارا چہرہ'۔۔۔حقیقت کی مسکان پھولوں جیسی تھی۔

'میرا چہرہ۔۔'عباد کی اُنگلیاں اپنے چہرے کو تلاشنے لگیں۔۔'یہ تو۔۔یہ تو میری ماں کا چہرہ ہے۔۔۔ہاں اے حقیقت۔۔۔یہ میری ماں ہی کا چہرہ ہے۔۔۔جو۔۔جو میرے جیسا ہے۔۔۔ہاں میں اُس جیسا ہی ہوں۔۔۔ماں ۔۔۔ماں'۔۔۔وہ لمحہ بھر ہمک سا گیا۔۔۔لبوں کے خشک کناروں پر ماں کے دودھ کی مٹھاس سی اتر آئی۔

'اور یہ آئینہ۔۔۔تمہارا چہرہ۔۔۔تمہارا اپنا دل ہے'۔۔۔حقیقت کی مدہوشی آسمانوں اور زمیں کے درمیاں جیسے معلق تھی۔

'میرا دل!' عباد نے بات اُچک لی ۔۔میرا دل تو سدا ہی پیاسا رہا۔۔۔بنجارے کی طرح صحرا صحرا بھٹکتا ہی رہا'

'دل ایک بنجارہ ہی تو ہے'۔۔۔حقیقت کا بیاں طلسم خیز تھا۔

'یہ میرا دل بنجارہ۔۔پیاسا۔۔پیاسا۔۔ایک بوند۔۔صرف اک بوند آب کو تلاشتا ہی رہا۔۔قریہ قریہ۔۔نگر نگر۔۔یہ دل بنجارہ اُس حقیقت کے پیچھے دوڑتا ہی رہا جو کبھی اُس کی تھی اور کبھی اُس کی نہ بھی تھی۔۔۔اس دل میں ہزاروں بھید چھپے تھے۔۔ہزاروں خواہشیں پنہاں تھیں اور لاکھوں وسوسے ٹیس دیتے تھے۔۔کروڑوں آرزوئیں اب بھی جواں ہیں۔۔۔ہاں وہ آرزوئیں دلِ بنجارہ کو تادمِ مرگ جواں رکھتی ہیں۔۔۔وہ۔۔وہ۔۔۔میں ہوں۔۔اک دل بنجارے کو اپنے وجود میں پنہاں رکھے۔۔۔خوب سے خوب تر کی جستجو میں محو رہتا ہوں۔۔میرا وجود۔۔۔مجھے اُس کی تلاش میں آج تک لئے پھرتا ہے۔۔۔تہجدِ محبت میں اشراقِ الفت کی طلب، تلاش یا بیقراری و اضطراب۔۔۔آہ۔۔'عباد کی بے قرار آنکھیں خمارِ یاد کی بدمستی سے بوجھل تھیں اور وین اُسی لمحہ حقیقت نے اُس کے دل پہ دباؤ سا ڈالا۔۔۔

'یہ آئینہ۔۔۔تمہارا چہرہ۔۔۔تمہارا دل ہے۔۔اور۔۔۔اور ایک اندھیر پچھواڑا'۔۔

'اندھیر پچھواڑا۔۔۔ہاہاہا۔۔۔'وہ ہنس دیا۔'کیا یہ میری پیٹھ ہے' وہ پھر ہنسا اور بے اختیار ہنستا ہی چلا گیا۔۔۔

'شی۔۔'حقیقت نے جیسے اُس کے لبوں کو چھو لیا۔۔۔ایک بجلی کی لہر سی عباد کے تن میں سرائیت کر گئی

وہ سحر زدہ رہ گیا۔۔۔کئی رنگ اُس کے چہرے کی جلد میں سرائیت کر گئے۔۔۔وہ حقیقت کے رنگوں میں ڈوب سا گیا۔

'کیسی بات ہے یہ۔۔۔اندھیرے۔۔اندھیروں کے ساتھ ساتھ

چلتے ہیں۔۔خواب۔۔خواب بن کر ڈراتے ہیں۔۔۔یہ کیا ہے۔۔یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔۔میں نہیں جانتا۔۔۔اوہ شاید میں جاننا ہی نہیں چاہتا۔'جیسے اُس نے رُک رُک کر۔۔۔تھم تھم کر۔۔۔ایک غیر محسوس سے احتجاج کی ناکام سی کوشش کی۔

'پھر یہ آئینہ دیکھو۔۔۔تمہارا چہرہ۔۔۔تمہارا دل۔۔۔ایک اندھیر پچھواڑا۔۔۔اور۔۔۔اور ایک مکمل دنیا۔۔۔اک عالمِ تحیر۔۔۔سحر طاری کرنے والی حقیقت بڑی ہی نرالی تھی۔

'اوہ یار۔۔۔'عباد بن جل کی مچھلی کی مانند تڑپ سا گیا۔۔'دنیا اور اُس کا پیار کتنا اجنبی ہوتا ہے۔۔ہاں۔۔اے میری حسین اور دلنواز حقیقت۔۔دنیا اور اُس کا پیار ہمیشہ اجنبی اجنبی سا ہی ہوتا ہے۔۔یہ وہ گھٹا ہے جو نہ کھل کر برستی ہے اور ہی چھائی رہتی ہے۔۔جب تک ایک رخ سے آشنائی ہوتی ہے دوسرا رُخ اجنبی ہو جاتا ہے۔۔'عباد تڑپ رہا تھا۔۔'خداوندا'۔۔۔سُرخ لب سوکھ رہے تھے۔۔دایاں ہاتھ سینے پر بے قرار تھا۔۔آنکھیں نیم غنودہ سی تھیں۔۔سانسیں اونچی نیچی ہو رہی تھیں۔۔۔'یہ حقیقت کیوں جگا دیتی ہے۔۔مست خوابوں سے۔۔۔خواہشوں اور اُن کی تکمیل سے۔۔۔آرزوؤں سے۔۔'عباد ایک بچے کی طرح ہمک رہا تھا۔۔'وہ میری ماں۔۔میرا چہرہ۔۔وہ میرا دل۔۔ایک بنجارہ۔۔۔وہ میری پُشت۔۔۔ایک داستانِ منافقت۔۔۔اور۔۔اور یہ دنیا۔۔۔آہ۔۔۔یہ دنیا تو میرے اپنے اندر بپا ہے۔۔۔رنگینیاں۔۔قہقہے۔۔دریا۔۔سمندر۔۔۔کنارے۔۔۔آسماں۔۔بادل۔۔ہوائیں۔۔۔پھول اور کلیاں۔۔میرا دل۔۔میری دنیا۔۔۔میری نامکمل دنیا۔۔'

عباد۔۔عباد۔۔اب وقت آ گیا ہے۔۔۔سنو!۔۔اٹھو۔۔۔تم یہ آئینہ۔۔خود کیوں نہیں تلاش کرتے۔۔بلکہ سوچو کہ کیا تم نے اُس آئینے کو پانے کی کوشش کی جو آج میں نے تمہیں دیا ہے۔۔'

حقیقت کی حسین آنکھوں کا سُرور عباد کے دل میں تھا اور قطرہ قطرہ ہوتا، مچلتا ہوا بے قرار سا نور یا دل۔۔گھڑی کی سوئی کے ساتھ ساتھ دھک دھک ،دھک دھک کرتا تھا۔۔

'میں اپنے ہی دائرے میں جیسے اُلجھ گیا ہوں اور اپنے ہی آئینے سے بچھڑ گیا ہوں۔'

نہیں۔۔ایسا نہیں ہے۔۔میں جو تمہیں یہ آئینہ دے رہی ہوں۔۔یہی اصل حقیقت ہے۔۔ہاں۔۔آئینہ۔۔بارش میں بھیگی چکنی مٹی اور گھاس سے نکلی ہوئی ایک خمیدہ تیلی۔۔جب تم گیلی، چکنی مٹی کے گولے میں اِس تیلی کو ٹکاؤ گے اور تعمیر کی جانب پہلا قدم بڑھاؤ گے۔۔تو وہ مکمل آئینہ اُبھر کر تمہارے اپنے سامنے آئے گا۔'

'چکنی مٹی۔۔۔آہ۔۔۔بارش کے مقدس پانی سے گوندھی ہوئی چکنی مٹی۔۔۔اور اُس کی جنت مثال خوشبو آج بھی وجود میں مہکتی ہے'۔۔۔وہ رُک گیا۔۔صرف ایک ان دیکھے لمحہ کو جانچنے شاید۔۔فضا میں ایک گہری سانس کی مدہم سی آواز اُبھری۔۔'ہوں'۔۔۔عرش نے گواہی دی اُس ایک ننھے سے لمحہ سے وصال کی۔۔۔'وہ میری روح۔۔اُس کے مدھ بھرے نین۔۔وہ بارشوں کے بعد چپکے چپکے لمبی سی گلی کے نکڑ پر ملنا۔۔۔اُس کا چکنی مٹی سے اپنی سختی کو لیپنا۔۔۔پھر وہیں بیٹھے بیٹھے اُسی چکنی مٹی سے چھوٹا سا چولہا بنانا۔۔کیا کچھ نہیں تھا اُس لمحہ میں۔۔علم کے وجدان کی جستجو۔۔اور گھر کی آرزو۔۔۔وہ ننھا سا چولہا اور وہ تختی۔۔اوہ۔۔خداوندا۔۔میں وہ دن کہاں چھوڑ آیا۔۔۔وہ فیض کے دن یا وجدان میں لکھی گئی رباعی۔۔میری سماعتیں وہ بازگشت ڈھونڈتی ہیں۔۔جس میں سبز چوڑیوں کی کھنک تھی۔۔۔یا پھر۔۔۔مغربی لباس میں پنہاں مرمریں وجود کی قیامت خیزیاں اور نیلی آنکھوں والی کی گلابی مسکراہٹ۔۔۔'

'تو کب تک دور رہو گے اپنے آئینے سے۔۔۔'حقیقت پھر سامنے آن کھڑی ہوئی۔۔۔'اب وقت آ گیا ہے جب سایہ خود بہ خود چھوٹا پڑ جاتا ہے۔۔۔آسماں کے کنارے بھی رنگ بدلنے لگتے ہیں۔۔۔اور آئینے میں عکس بھی دھندلا جاتا ہے'وہ تڑپ گیا۔۔وجود میں جیسے زلزلے سے اُٹھنے لگے۔۔۔آہ۔۔۔اے حقیقت! کیوں مجھے ایک دنیا سے دوسری دنیا میں لے آتی ہو۔۔۔تمہاری حقیقت میری سانسوں کو بوجھل کر دیتی ہے۔۔۔مجھے کھو جانے دو اُس چکنی مٹی کی باس میں۔۔وہ میری محبوب۔۔وہ میرے وجود کی مٹی۔۔۔اور اُس کی خوشبو۔۔۔'وہ ٹھہر گیا۔۔۔مدن لمحوں کے بعد فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا جو خاصا غیر محسوس سا تھا۔

'تو پھر جلدی کرو۔۔۔اس سے قبل کہ رنگ دھواں بن جائیں۔۔یہ آئینہ لو۔۔اور۔۔اپنا چہرہ۔۔دل۔۔پشت اور دنیا کو تلاش کرو۔۔۔مرجھائی کلیاں۔۔شباب رنگت۔۔۔پختہ کار آنکھیں، حاصل شدہ، گمشدہ اور آنے والے خواب دیکھ سکو۔۔۔'حقیقت مچل رہی تھی عباد کی تڑپ قابلِ دید تھی۔۔'خداوندا۔۔'چہرے کی رنگت زرد اور لب سوکھ کر کانٹا ہو رہے تھے۔۔۔دایاں ہاتھ سینے کی بائیں جانب دائرے کی صورت گردش کناں تھا۔۔آنکھیں نیم غنودہ تھیں اور سانسوں میں معمولی ہلچل سی تھی۔۔۔'یہ حقیقت کیوں جگا دیتی ہے۔۔مست خوابوں سے۔۔۔خواہشوں سے۔۔۔آرزوں سے۔۔۔'اُس کا باطن ایک بچے کی طرح مچل رہا تھا۔۔۔'سنو! سنو۔۔۔میں اپنے ہی آئینے کے روبرو ہوں۔۔۔یہ آئینہ میرا اپنا چہرہ ہے۔۔۔وہ میری ماں۔۔۔میری مرحوم ماں۔۔میرا چہرہ۔۔میرا دل۔۔میری دنیا'۔۔۔عباد کی آواز منہ سے نہیں بلکہ اُس کے سینے سے آ رہی تھی جہاں دل بیٹھا چرکے لگا رہا تھا۔۔

گرمیوں کی ڈھلتی ہوئی شام، رات کے گہرے آنچل کا سہارا پکڑ رہی تھی۔لان چیئر پر ٹکے عباد نے آنکھیں کھولیں اور جہانِ تحیر سے لوٹ آیا ۔۔اُس نے سر اُٹھا کر آسماں کی جانب دیکھا۔۔جہاں ستاروں نے اپنی اپنی جگہ لینی شروع کر دی تھی۔۔تب اُس نے ایک آخری بار پھر محسوس کیا جیسے۔۔۔وجود مکمل طور پر منجمد نہ تھا اور نہ ہی بے حس تھا۔۔۔ایک سرسراتا ہوا احساس تھا یا وہ آخری زندگی کے یخ ترین لمحہ کا وار تھا کہ جیسے برف گزیدہ فال میں روح نے عرش کی جانب سفر کیا اور وجود منجمد ہو گیا ہو۔۔۔

علامتوں سے شہادتوں تک حقیقتیں ہمیشہ منتظر رہتی ہیں۔۔۔

باقی صفحہ ۶۴ پر ملاحظہ فرمائیے

قصہ البم کا

نثار احمد صدیقی
(گیا، انڈیا)

جوں ہی ٹرین کھلی۔

میں ٹرین کی مخالف سمت میں دوڑنے لگا۔ ہر طرف پھیلی ہوئی دور دور تک ریل کی پٹریاں تھیں۔ اور ہر طرف پر ہول سناٹا۔ خاموش چپ چاپ بہتی ہوئی ہوائیں۔ جن میں نہ جانے کتنے چتاؤں کے جلنے کی بو شامل تھی اور نہ جانے کتنے غم کے ماروں کی آہیں اور نہ جانے کتنے ہوس پرستوں کی ہوس پرستی کا لمس، میں ان سب کو پرے ڈھکیلتا ہوا آگے بڑھا اور مڑ کر نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

اسے میری نفرت اور پاگل پن پر ہنسی آ گئی۔

مجھے بھی غصہ آ گیا اور جب میں نے اسے پکڑنے کے لیے قدم بڑھایا تو وہ میری گرفت سے بہت دور جا چکا تھا۔ مگر دور سے بھی اس کے قہقہے کی آواز بڑی صاف سنائی دے رہی تھی، مجھے اپنی بے بسی پر بڑا ترس آیا۔ اسی درمیان میں نے پھر ایک جست لگائی اور اپنی رفتار کو اور تیز کر دیا۔ اور میں بہت جلد اپنے گھر کے جانب مڑنے والے چوراہے پر جہاں ایک بہت بڑا پیپل کا درخت شاید صدیوں سے زمانے اور انسانوں کے عروج و زوال کو اپنے دامن میں چھپائے کھڑا مسکراتا رہا ہے۔ پہنچ گیا۔ اور ٹھیک اُسی کے زیر سایہ پڑا بھیک مانگا جس کے ہاتھ پیر کٹے ہیں۔ ان پر ڈھیر ساری مکھیاں بھنبھناتی رہی ہیں۔ جسے وہ اپنے کٹے ہاتھوں کو بار بار زمین پر پٹک کر اڑانے کی ناکام کوشش کرتا رہا ہے۔ اسے میں مسلسل کئی سالوں سے اسی طرح دیکھتا آ رہا ہوں یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ یہ بھی ایک سوال ہے؟ مگر کس کو اتنی فرصت ہے کہ ان سوالوں کے بیچ وخم میں الجھے، البتہ میں نے کبھی کبھی رات میں ایک بوڑھی عورت کو کھانا کھلاتے دیکھا ہے جو شکل وشباہت سے ستم زدہ معلوم پڑتی ہے۔ اس سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ کون جانے! کون دریافت کرے۔

میں وہاں سے پلٹا اس لئے کہ مجھ کو یک بیک محسوس ہوا کہ میرے پاؤں میں بھاری زنجیریں بندھ گئیں ہیں۔ اور جب ان زنجیروں کو روندتا ہوا آگے کی طرف بڑھا تو دیکھا بہت سارے لوگ ایک سمت بھاگے جا رہے ہیں۔۔۔۔ میں بھی ان کے ساتھ دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے جب تھکاوٹ کا احساس ہوا تو مڑ کر دیکھا کہ لوگ دوڑ ہی رہے ہیں یا صرف میں اتنی دور تک دوڑتا چلا آیا ہوں، تب مجھے غلطی کا احساس ہوا اور پھر میں خوف سے کانپنے لگا۔ نہ جانے سب کے سب کہاں رُک گئے تھے۔ صرف میں اکیلا اتنی دور تک چلا آیا تھا۔ لیکن یہاں میرا گھر تو نہیں تھا۔ میں کسی غلط جگہ پر آ گیا تھا۔ میں وہاں سے پلٹ پڑا اور راستے میں پڑے ایک پتھر سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا۔ میں اپنے زخمی جسم اور داغ دار روح کو سمیٹے اپنے مکان والی گلی کے موڑ پر پہنچا تو ہر طرف بکھرے ہوئے عجیب اور ہیبت ناک سناٹوں نے میرا استقبال کیا۔ میں سہم گیا۔ اور چپکے سے اپنے مکان میں داخل ہو گیا۔ آج پہلی مرتبہ مجھے اپنے گھر میں اجنبیت کا شدید احساس ہوا، بام ودر سب اجنبی۔ اجنبی.....! اگرچہ سورج اپنے مقام سے کچھ نیچے ہی کھسک آیا تھا۔ مگر میرا گھر ایک گہری تاریکی میں دم توڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے میں یہ بھی بھول گیا کہ میں کس لئے یہاں آیا ہوں؟

چپ چاپ بڑی دیر تک آنگن میں کھڑا اپنے متحرک جسم سے آشنا مگر اب غیر آشنا ماحول کو دیکھتا رہا۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد بھی جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو واپس جانے کو مڑا، ٹھیک اُسی وقت میرے سر پر ایک چھپکلی گری۔ اور پھر میرے سر پر سے ہوتی ہوئی زمین پر رینگنے لگی، مجھے بڑے گھناؤنے پن کا احساس ہوا.....اور تب مجھے یک بہ یک یاد آ گیا کہ میں یہاں صرف ایک البم کے لیے آیا تھا۔ البم جس میں میرے پرکھوں سے لیکر آج تک کی کہانی ہے۔ میں دھیرے دھیرے چلتا اس کمرے کی طرف بڑھا جس میں البم رکھا تھا۔ وہ البم اب میرے خاندان کا واحد اثاثہ ہے۔ بقیہ تمام اثاثے کو چھوڑ کر میں آگے جا ہی چکا ہوں۔ یہ میرے دادا جان کی تصویر ہے۔ مگر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اس لئے کہ اس پر خون کا ایک تازہ دھبہ نمایاں تھا۔ میں تمام تصویروں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے ورق الٹتا چلا گیا۔ تمام تصویروں پر بے شمار سے خون کے دھبے اور جابہ جا خون کی چھینٹیں موجود تھیں۔ اس طرح اس البم کی تمام تصویروں کے داغدار ہو جانے پر مجھے بہت افسوس ہوا۔ اس لئے کہ اس البم کو میں نے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ لاکھ حالات بدلے، بھوکے مرے مگر البم کی تصویروں کو سنوارنے اور سجانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، مجھے یاد ہے کہ میں نے جامی کو صرف اس لئے پیٹا تھا کہ اس نے میرے ''پرکھوں'' کی تصویروں پر ہلکا سا کالک کا دھبہ لگانے کی بھول کی تھی۔ مگر آج یہ کس ظالم نے میرے زندگی بھر کی امانت کو اس طرح ملیامیٹ کر دیا ہے۔ مگر میں تو جانتا ہوں کہ اس البم کا دشمن کون ہے؟ اور کس نے ان تصویروں کو داغدار بنایا ہے۔ مگر مین کر بھی کیا سکتا ہوں۔ یہ ایک بے بسی ہے۔ جو سمندر میں رہنے کی سزا ہے؟ اس لئے کہ چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو بڑی مچھلیوں کا لقمہ بننا ہی پڑتا ہے۔ اور پھر میرے سوچ کا دائرہ تنگ ہونے لگا ہے اور سورج اپنی جگہ پر واپس چلا جاتا ہے۔ اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ کیوں نا میں اپنے اس البم کو جسے اب تک زمانے کے مختلف دھبوں سے بچاتا آیا ہوں ان تمام لوگوں پر پھینک دوں جن کے سروں پر البم کی چھپکلی

باقی صفحہ ۹۳ پر ملاحظہ فرمائیے

''آندھی میں رکھا دیا''

رینو بہل
(چندی گڑھ، بھارت)

صبح سے شام تک ٹھیکیدار کا انتظار کرتے کرتے منگل تھک سا گیا تھا۔ آج اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ اُس نے بزرگوں کا کہا کیوں نہیں مانا۔ وہ اپنی بیوی رام رتی اور منّے کو کسی بیگانے کے کہنے پر کیوں اپنے ساتھ شہر لے آیا۔ جب سے وہ انہیں اپنے ساتھ لایا تھا پریشانی اور الجھنوں میں گرفتار ہو کر رہ گیا تھا۔ یوپی کے سلطان پور گاؤں کا سیدھا سادا نوجوان یہ نہ سمجھ سکا کہ شہر کے لوگ کتنے مطلب پرست ہوتے ہیں، مطلب نکل جانے پر پہچانتے بھی نہیں۔ گاؤں جانے سے پہلے ورما صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اپنی بیوی اور بچے کو لے کر آئے تو وہ اُسے کوٹھی کے احاطے میں رہائش کے لئے کوٹھری دے دیں گے وہ صبح وشام سائیکل رکشہ چلایا کرے اور اُس کی بیوی مسز ورما اور اُن کے بچوں کا کام کر دیا کرے گی۔ وہ ایک مہینے بعد آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ گھر والوں نے اُس کے فیصلے کی سخت مخالفت کی اُن کا کہنا تھا کہ گاؤں میں تو چھت بھی اپنی ہے، چاہے کچی ہی سہی زمین کا تھوڑا سا ٹکڑا بھی اپنا ہے اور پھر زمیندار کے کھیتوں میں کام بھی مل جاتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح دو وقت کی روٹی تو نصیب ہو جاتی ہے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے علاوہ اور کوئی خاص ضرورت بھی نہیں لیکن منگل کو تو گاؤں کی زندگی پسند ہی نہ تھی۔ پہلی بار جب وہ اپنی نئی نویلی دُلہن کو چھوڑ کر شہر آیا تھا تو اُس کا شہر میں بالکل دل نہ لگا ہر وقت رام رتی کا چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا۔ رام رتی تھی بھی بہت خوبصورت، سانولی سلونی، بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں اور نازک سرخ ہونٹ، وہ صورت سے ہی نہیں سیرت میں بھی خوبصورت تھی۔ منگل اُسے بے حد پیار کرتا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ کبھی اُسے کھیتوں پر کام نہ کرنے دیتا اگر کوئی دو منٹ بھی اُس کی طرف غور سے دیکھ لیتا تو اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی پھر دوسروں کا غصہ رام رتی پر نکالتا۔

''تجھ سے کتنی بار کہا کہ گھونگھٹ گرا کر رکھا کر، لیکن تیرے اوپر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ دیکھا نہیں دیوراج تجھے کس طرح گھور رہا تھا میرا بس چلتا تو اُس کی آنکھیں نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔'' منگل کا چہرہ غصّے سے تمتمانے لگتا اور رام رتی سر جھکائے چُپ چاپ سنتی رہتی۔ دل ہی دل میں خوش بھی ہوتی کہ اس کا شوہر اُسے کتنا چاہتا ہے لیکن دوسرے ہی پل وہ ڈر جاتی کہ کہیں وہ اُس کی خاطر کبھی کسی سے جھگڑا مول نہ لے لے۔

ایک روز رام رتی منگل کے غصّے سے بے حد ڈر گئی۔ زمیندار کھیتوں کا دورہ کر رہا تھا کہ اُس کی نظر رام رتی پر پڑ گئی۔ کام میں مست اُس کو گھونگھٹ کا بھی خیال نہ رہا اور نہ اُسے یہ پتہ چلا کہ کوئی اُسے گھور رہا ہے لیکن منگل نے زمیندار کی چوری پکڑ لی۔ منگل نے اُسی وقت کام چھوڑ دیا اور رام رتی کا کام بھی چھڑا کر اُس کا بازو زور سے پکڑا اور غصّے میں گھسیٹتا ہوا گھر لے آیا۔ سب لوگ حیرت سے اُس کی اس حرکت کو دیکھ رہے تھے۔ گھر میں گھستے ہی اُس نے رام رتی کے گال پر زوردار دو تھپڑ رسید کئے اور اُسے روتا چھوڑ کر گھر سے نکل گیا۔ جب تک وہ گھر نہیں لوٹا، رام رتی سہمی سہمی بیٹھی رہی۔ منگل نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ اب وہ گاؤں میں نہیں رہے گا۔ شہر جائے گا وہیں اپنی روزی روٹی کمائے گا اور پھر اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جائے گا۔ یوں بھی رام رتی کے پاؤں بھاری تھے اس حالت میں اُس کا گاؤں میں ہی رہنا مناسب تھا۔ جلد ہی ٹھکانہ تلاش کر کے لوٹنے کا وعدہ کر کے منگل روتی ہوئی بیوی کو چھوڑ کر شہر چلا گیا لیکن جاتے جاتے بھی سب کو ہدایت کر گیا کہ وہ اسے کبھی زمیندار کے کھیتوں پر نہیں بھیجیں گے۔

شہر میں کام تلاش کرنا اُس نے جتنا آسان سمجھا تھا، اُتنا تھا نہیں۔ کچھ روز دھکے کھانے کے بعد اُسے کسی بزرگ کے ذریعے سائیکل رکشہ چلانے کا کام مل گیا پھر دُکانوں کے سامنے ایک ٹین شیڈ میں جہاں رات کو رکشہ والے اپنا ڈیرہ جمایا کرتے تھے، منگل کو بھی سر چھپانے کی جگہ مل گئی۔ ٹین شیڈ میں ہی ہر شخص اپنا اپنا چولہا جلا کر اپنی آمدنی کے مطابق اپنا کھانا تیار کرتا۔ رام رتی کو ایسے ماحول میں لانا ممکن نہ تھا۔ منگل پاس ہی کی کوٹھی میں رہنے والے ورما صاحب کے بچوں کو روز اسکول چھوڑنے جاتا تھا۔ کبھی اُن کا اوپر کا کام بھی کر دیا کرتا۔ ایک روز ورما صاحب نے اُسے صلاح دی کہ وہ اپنی بیوی کو بھی لے آئے اور اُن کی کوٹھی کے احاطے میں جو کوٹھری ہے اس کو اپنا گھر بنا لے۔

ادھر سے خبر ملی کہ اُس کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اُدھر وہ ورما صاحب سے جلد ہی بیوی بچے کو اپنے ساتھ لانے کا وعدہ کر کے گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔ شہر میں کہیں اگر رہنے کو اچھی جگہ مل جائے تو بڑی خوش قسمتی سمجھی جاتی ہے۔ ایک مہینہ کیسے پلک جھپکتے گزر گیا پتہ ہی نہ چلا۔ وہ جب بھی شہر جانے کا نام لیتا سب مخالفت شروع کر دیتے اور وہ خاموش ہو جاتا۔ اسی کشمکش میں چھ مہینے گزر گئے۔ آخر تھک ہار کر اور سب کی مرضی کے خلاف لڑ جھگڑ کر وہ بیوی اور بچے کو لے کر شہر آ گیا۔ سب نے اُسے بہت سمجھایا لیکن اُس کے کان پر جوں نہ رینگی۔ جب چھ مہینے بعد وہ ورما صاحب کے یہاں پہنچا تو اُس کی تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ مسز ورما نے اُسے دیکھتے ہی کہا:

''تم ایک مہینے کا کہہ کر گئے تھے اور اب آ رہے ہو۔ ہم نے تو پورے دو مہینے تمہارا انتظار کیا۔ تم نہیں آئے تو ہم نے کسی دوسرے کو رکھ لیا''

''لیکن میم صاحب! میں تو آپ کے بھروسے پر ہی اپنی بیوی اور بچے کو ساتھ لایا ہوں۔ اب میں انہیں لے کر کہاں جاؤں؟ وہ پریشان ہو کر بولا۔

''تم نے تو ہمیں پریشانی میں ڈال دیا''۔ ورما صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے ''اب تم ایسا کرو کہ دو چار روز کہیں گزار لو، پھر میں تمہارا کوئی انتظام کر دوں گا''

اُن کی بات ماننے کے علاوہ منگل کے پاس دوسرا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ اس لئے وہ ''اچھا صاحب'' کہہ کر وہاں سے چلا آیا لیکن اتنے بڑے شہر میں بیوی بچے کو لے کر کہاں جائے؟ منگل یہ سوچ کر پریشان ہوا اُٹھا۔

سارا دن دھکے کھانے کے بعد بھی جب سر چھپانے کو کوئی ٹھکانہ نہ ملا تو ہار کر وہیں اپنے پرانے ٹھکانے پر جا پہنچا اور سب سے تھوڑا الگ اُس نے وہاں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُدھر بے چاری رام رتی اتنے بڑے بڑے مکان، عمارتیں اور بڑی بڑی دُکانوں کے ساتھ لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ وہ رات دونوں نے جاگ کر گزاری اور صبح پھر سے جگہ تلاش کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ایک جگہ سے دوسری جگہ دھکے کھاتے اُنہیں چار روز گزر گئے۔ رات بھر منگل جاگتا رہتا۔ ایک منٹ کے لئے بھی اُس کی آنکھ نہ لگتی۔ جوان، خوبصورت بیوی کو لے کر وہ بھیڑیوں کیے شہر میں سڑک پر چین کی نیند کیسے سو سکتا تھا۔ چھوٹا بچہ بھی شہر کی بھیڑ بھاڑ دیکھ کر روتے روتے بے حال ہو گیا تھا۔ منگل نے ایک بار پھر ورما صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''صاحب میرا کچھ کام بنا؟''

''دیکھو منگل، میرا ایک ٹھیکیدار دوست ہے وہ ایک بڑی کوٹھی بنوا رہا ہے میں نے اُس سے بات کی ہے تم کل اُس سے مل لینا رہنے کو جگہ بھی مل جائے گی اور چوکیداری کا کام بھی مل جائے گا۔ بس کام دل لگا کر کرنا صاحب کو کوئی شکایت کا موقعہ نہ ملے۔ اُنہیں خوش رکھنا۔ یہ رہا اُن کا پتہ کل ہی جا کر اُن سے مل لو''

صبح سے شام ہو گئی لیکن ٹھیکیدار کو اُس سے بات کرنے کی فرصت نہ ملی۔ اس نے بھی ٹھان لیا تھا کہ وہ اُسے ملے بغیر نہیں جائے گا اور اگر آج کام نہ بنا تو وہ واپس گاؤں چلا جائے گا لیکن واپس جانے کے لیے بھی تو پیسوں کی ضرورت تھی جو ہر روز کم ہوتے جا رہے تھے۔ جب سے وہ گاؤں سے آیا تھا رات وہ بیوی بچے کی پہرے داری میں گزار دیتا اور صبح اُس میں اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ کہیں کام تلاش کرے رہنے کا ٹھکانہ مل جاتا تو کام بھی کر لیتا۔ کمائی تو ہو نہیں رہی تھی اور جو پیسے بچے تھے وہ روزمرہ کی ضرورتیں پوری کرنے میں خرچ ہو رہے تھے۔

آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں تو وہ اپنا غم بھول گیا۔ ٹھیکیدار نے اسے چوکیداری کا کام سونپ دیا اور رہنے کو چھت بھی دے دی۔ نئی کوٹھی کی چوکیداری کے لئے اُسے آٹھ سو روپے ماہوار دینا طے ہوئے لیکن اُس وقت تو سر چھپانے کا مسئلہ ہی سب سے بڑا تھا۔ اُس نے صبح ہونے کا بھی انتظار نہ کیا اور رات کو ہی وہ اپنے گھر میں بیوی بچے سمیت آ گیا بے شک اُس کا گھر ایک چھوٹے سے کچے کمرے کا تھا مگر کھلی سڑک سے تو کہیں بہتر تھا۔ کم از کم سر پر چھت تو تھی۔ اس رات وہ کئی دنوں بعد چین کی نیند سویا تھا۔

سارا دن ٹھیکیدار اُسے کسی نہ کسی کام میں اُلجھائے رکھتا وہ بھی ہر کام بھاگ بھاگ کر کرتا۔ جگہ ملتے ہی ایک نئی چستی پھرتی اُس کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ سارے کام وہ خود ہی کرتا، رام رتی کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ ٹھیکیدار کے سامنے بغیر گھونگھٹ کے جائے اگر کبھی کسی وجہ سے اُسے ٹھیکیدار سے بات کرنی ہوتی تو وہ تین انچ کا گھونگھٹ نکال کر اُس کے سامنے جاتی۔ صاحب لوگ اور اُن کے بیوی بچے بھی کبھی کوٹھی کو دیکھنے آ جاتے۔ اُن لوگوں کو پانی پلانے رام رتی خود جاتی منگل کبھی اعتراض نہ کرتا۔

جب تین چار مہینے گزر گئے اور منگل کو اطمینان ہو گیا کہ یہ سب بھلے لوگ ہیں تو دھیرے دھیرے رام رتی کے گھونگھٹ کی لمبائی بھی کم ہوتی گئی اور پھر ایک روز یہ رسم بھی ختم ہو گئی۔

گرمیوں کی ایک دوپہر تھی جب چلچلاتی دھوپ میں پرندے تک اپنے گھونسلوں میں آرام کر رہے تھے۔ اچانک صاحب اپنے چند دوستوں کو لے کر کوٹھی دکھانے آ پہنچے۔ مزدوروں کی اُس دن چھٹی تھی اور منگل بھی اپنی کوٹھری میں سُستا رہا تھا۔ گاڑی کی آواز سُن کر وہ بھاگا۔ اُن کے دوستوں میں ایک خوبصورت لڑکی بھی تھی شاید وہ اُن میں سے کسی صاحب کی بیوی ہو گی۔ یہی سوچ کر وہ آگے بڑھا اور گھر کے دروازے کھول دئے۔ صاحب بہت شوق سے اُن کو اپنا گھر دکھا رہے تھے اور ساتھ ہی ہنسی مذاق بھی کر رہے تھے۔ اُن کی باتوں سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ وہ لڑکی مہیش صاحب کی منگیتر ہے۔ شہر کے بھی عجیب و غریب رواج ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے ہی لڑکا لڑکی ایک ساتھ گھومتے پھرتے ہیں، اُٹھتے بیٹھتے ہیں اور یہاں تک کہ بند کمرے میں بھی تنہا بیٹھے رہتے ہیں۔ گاؤں میں تو کبھی ایسا دیکھنے کو نہیں ملتا۔ وہ حیرانی اور خاموشی سے دُنیا کے رنگ دیکھ رہا تھا۔

مہیش بابو اور اُن کی منگیتر دوسرے کمرے میں آرام کرنے لگے۔ نہ جانے کمرہ کیوں بند کر لیا۔ اندر نہ تو کوئی پنکھا لگا تھا اور نہ کوئی سامان پڑا تھا۔ اتنی گرمی میں بھی کھڑکیاں بند تھیں۔ باقی لوگ الگ کمرے میں زمین پر ہی چادر بچھا کر تاش کھیلنے لگے۔ پھر اُس نے پانی منگوا کر شراب کا دور شروع کر دیا۔ وہ بھی لوٹ کر اپنی کھولی میں واپس آ گیا۔

ابھی تقریباً ایک گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ اُسے پھر سے آواز دے کر بُلا لیا گیا۔ کچھ روپے دے کر بازار سے کھانے پینے کا سامان لانے کو بھیج دیا گیا۔

''صاحب! دارُو تو بہت دُور ملتی ہے اور میرے پاس تو سائیکل بھی نہیں''۔

''تو پیدل چلا جا''

''دیر لگ جائے گی صاحب''

''کوئی بات نہیں۔ پرلے کر ہی واپس آنا''

''جی صاحب''

رام رتی کو بتا کر وہ چلچلاتی دھوپ میں پیدل ہی بازار کی جانب روانہ ہوگیا پہلی بار پانچ سو کا نوٹ ہاتھ میں پکڑا تھا۔اس خوشی میں اُسے گرمی بھی محسوس نہیں ہورہی تھی۔راستے بھر وہ سوچتا رہا کہ صاحب کے لیے دارو خریدوں گا،شاید صاحب تھوڑی سی بچی ہوئی دارُو اُسے بھی دے دے وہ ان روپیوں میں سے تھوڑا سا دودھ بھی مُنّے کے لیے خرید لے گا۔صاحب لوگ تو شرابی ہورہے ہیں۔اُن کو کیا پتہ چلے گا۔اور پھر بڑے لوگ کہاں پیسے پیسے کا حساب لیتے ہیں۔مجبوریاں انسان کو بے ایمانی کرنا سکھا دیتی ہیں۔وہی رام رتی جو صاف ستھری زندگی گزارنا چاہتی تھی وہی آج بیٹے کے پیار میں اندھی ہوکر اُسے بے ایمانی کرنے کو کہتی۔آج بھی منگل کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب گاؤں میں فصل خراب ہوگئی اور گھر میں کھانے کے لالے پڑ گئے تو وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ جو مال اِدھر سے اُدھر لے جا کر غیر قانونی طریقے سے پیسے کماتا تھا،ایک دن کام پر چلا گیا۔جب شام کو وہ خوب سارا راشن کا سامان اور پیسے لے کر آیا تو رام رتی کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

''اتنے پیسے کہاں سے ملے؟''

''تمہیں اس سے کیا،تم راشن سنبھالو''

''نہیں،پہلے بتاؤ یہ سب کہاں سے آیا؟''

اُس نے زبردستی منگل کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر اُس سے سب کچھ سچ سچ کہلوایا تھا۔

''میں شیام کے ساتھ گیا تھا،اُس نے کہا تھا کہ اگر میں اسی طرح اُس کے ساتھ کام کرتا رہا تو وہ اور زیادہ پیسے دے گا''

''تم ایک بات کان کھول کر سُن لو جو ہوگیا سو ہوگیا لیکن آئندہ میں اس حرام کے پیسے کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں گی۔مجھے بھوکے رہنا منظور ہے پر اس طرح کا پیسہ نہیں چاہیے''

وہ بھی رام رتی کے غصّے سے ڈر گیا،اُسے بیحد پیار جو کرتا تھا۔اس لئے اُسے دُکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔اُس دن کے بعد اُس نے توبہ کرلی اور ہمیشہ کے لیے شیام کا ساتھ چھوڑ دیا۔

لیکن جب سے مُنّا کچھ کچھ بیمار رہنے لگا تھا اور ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ اُسے اچھی خوراک کی ضرورت ہے وہ کچھ بدل سی گئی تھی۔ہر دم مُنّے کا ہی خیال کرتی۔خود بھوکی رہ کر اُس کے پیٹ کی آگ بجھاتی۔اگر منگل کہتا کہ:

''اس طرح بھوکی رہ کر تو خود بیمار ہوجائے گی''

تو وہ کہتی:

''مجھے کچھ نہیں ہوگا اور اگر ہو بھی جائے تو کیا؟ میرا بس چلے تو میں اپنے چاند کے لئے نہ جانے کیا کر ڈالوں؟''

پھر وہ پیار سے اپنے بیٹے کو سہلانے لگتی اور اُس کی بہتی ہوئی ناک کو اپنے آنچل سے ہی پونچھ دیتی اور نہ جانے کن خیالوں میں کھو جاتی۔منگل کو اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بہت پیار کرتی ہے۔اُس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ پائے گی۔لیکن اُسے یہ پتہ نہیں تھا کہ ممتا میں اندھی ہوکر وہ اُسے ہر دم پیسے کمانے کو کہے گی۔بیشک وہ غلط طریقے سے ہی کیوں نہ کمائے گئے ہوں۔اُسے اس بات کی حیرانی بھی تھی شاید اُس کی ان باتوں کا ہی اثر تھا کہ وہ ان پانچ سو روپیوں میں سے بچے کے دودھ کے لیے اور کچھ پیسے بچانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

انہیں سب باتوں میں الجھا ہوا وہ بازار کا کام بھی کر آیا۔ڈر رہا تھا کہ صاحب لوگ ڈانٹیں گے''ایک گھنٹہ بعد آئے ہو؟'' دروازے پر گاڑی نہیں تھی۔شاید وہ لوگ اُس کا انتظار کر کے چلے گئے تھے۔

''مُنّے کی ماں! کیا سب لوگ چلے گئے؟'' اندر گھُستے ہی اُس نے پوچھا۔

وہ آنکھیں بند کئے بے سُدھ سی پڑی رہی۔

''میں تم سے پوچھ رہا ہوں،کیا سب لوگ چلے گئے؟''

''ہاں چلے گئے''اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔

''اور یہ سامان؟اس کا کیا کرنا ہے؟ کیا واپس آئیں گے؟''

''معلوم نہیں''

''کچھ کہہ کر نہیں گئے؟''

''نہیں''

اُس نے پچاس کا نوٹ اپنے شوہر کی طرف بڑھا دیا۔اُس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔

''یہ دے کر گئے ہیں''

منگل نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے نوٹ کو دیکھا۔پھر اپنی بیوی کی حالت پر غور کیا۔اُس کی آنکھوں میں کئی سوال مچل اُٹھے۔رام رتی اُس کی آنکھوں کی تاب نہ لاسکی اور آنکھیں موند کر لیٹی رہی۔صرف آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر اُس کے گالوں پر گر رہے تھے اور اُس کی سسکیوں کی آواز منگل کے دل کو چھلنی کر رہی تھی۔منگل شراب،کھانا،دودھ اور پانچ سو میں سے بچے ہوئے نوٹ ہاتھ میں پکڑے پتھر بنا کھڑا تھا۔

۔ خواب اور طرح کے ۔

ڈاکٹر شکیل احمد کے افسانوں میں میرے لیے ہمیشہ کشش رہی ہے اور ان کی (Themes) میں بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا کوئی افسانہ چاہے میں نے ان کے منھ سے کسی ادبی نشست میں سُنا ہو یا کہیں پڑھنے میں آئے،برسوں بعد بھی وہ مع واقعات کی ترتیب کے میرے ذہن میں محفوظ رہتا ہے.....ڈاکٹر حسن منظر

رابطہ: A/21،لطیف آباد نمبر 11،حیدرآباد،سندھ۔

''ثناخوانِ تقدیس''

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

''ایک منٹ؛بس ایک منٹ میری جان!'' میک اپ کے امپورٹڈ سامان سے بھرے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اُس کی آنکھوں میں غصّے کی چنگاریاں دیکھ کر میڈم روزی نے نچلے ہونٹ کی لپ سٹک کو ادھورا چھوڑ کر اُس کی گردن میں پیار سے بازو حمائل کرتے ہوئے بچوں کی طرح اُس کے گال چمکار کے اپنے مخصوص انداز میں "My sweet bitch just one minute" کہہ کر پھر سے ادھوری لپ سٹک درست کرنے کی کوشش کی تو اُس کے چہرے کی کرختگی کسی قدر کم ہوگئی تھی۔غصہ کی جگہ طبیعت میں رومان اُمڈنے لگا تھا۔آنکھوں کی چمک شکاری کتّے کی مانند تیز تر ہونے لگی تھی اور اُن میں ایسی بھوک تیرنے لگی تھی جو غذا کے بغیر بھی مٹائی جاسکتی ہے۔ایسا پہلی بار نہ ہوا تھا جب بھی وہ میڈم روزی کی کسی بات پر برانگیخت ہوتی' میڈم روزی اُسے منانے کے لئے یہ ہی حربہ اختیار کرتی جس پر اُس کا غصہ یک لخت غائب ہو جاتا اور طبیعت میں ایک طرح کی بشاشت در آتی۔وہ لبرا ڈاگ تھی نہ پونٹر ڈاگ نہ ڈابر مین ڈاگ تھی نہ اُس کا تعلق السیشن نسل سے تھا اور نہ جرمن شیفرڈ یا ہیلپن ڈاگ سے اُسے کوئی نسبت تھی۔ہوتی بھی کس طرح.....؟ وہ کتا' کتیا یا کوئی بھی جانور سے کسی طرح کی نسبت نہ رکھتی تھی۔وہ تو ایک انسان تھی.....!جیتی جاگتی' ہنستی کھیلتی' زندگی سے اپنے حصے کا بھرپور رس نچوڑنے' کبھی کبھی دوسروں کے حصے کی لذیذیت اُچکنے سے بھی دریغ نہ کرتی۔

زندگی نے اُس کے لئے تجربات وحوادث کے بہت سے دروا کئے' ہر بار وہ اُسی طرح سرخرو اور سرفراز ہو کر نکلی جس طرح فاتح میدانِ جنگ سے برآمد ہوا کرتے ہیں۔بظاہر صنف نازک عمر کی بابت بہت حساس ہوا کرتی ہیں مگر وہ اپنی عمر کے چھتیس ویں سال کو اس طور عیاں کرتی کہ سننے والے کو اُس کا اعزاز محسوس ہوا کرتا۔میڈم روزی کے بقول وہ اُس سے عمر میں چار سال اور تجربات میں چوبیس سال پیچھے تھی۔والدین کی اکلوتی اولاد سوزان کو ابتدا میں وہی ناز ونعم میسر تھا جو امیر اور پوش گھرانوں کا وطیرہ ہوا کرتا ہے۔والدین میں ذہنی ہم آہنگی کے فقدان نے دونوں کو الگ الگ راہ پر ڈال دیا تھا جس کا سوزان کے ننھے ذہن پر بہت منفی اثر ہوا۔پہلے پہل دونوں ایک دوسرے سے چھپ چھپا کر کاروائی ڈالتے' آہستہ آہستہ دل اور دماغ میں کشادگی کے باعث بے باک ہو گئے تھے۔

آدھی رات گئے' ماں کو اکثر نئی گاڑی اور نیا ڈرائیور چھوڑنے آتا جس کے ردِعمل میں باپ اور بھی بے باک ہو گیا تھا کبھی کوئی مہ جبیں جھلمل کرتے لباس اور تیز خشبو لگائے باپ کے ساتھ گھر تک آجاتی تو واپسی پر اُس کی ماں کو فوراً پتا لگ جاتا اور وہ سوزان سے مخاطب ہو کر کہتی!''کیوں آج پھر تیرے باپ کے ساتھ کوئی کتیا آئی تھی.....؟'' سوزان کا ننھا ذہن بہت مشکل میں پڑ جاتا اچھی بھلی عورت کو اُس کی مما کتیا کیوں کہہ رہی ہے.....؟

پانچ سال پَر لگا کر اُڑ گئے۔دونوں میاں بیوی کے درمیان خاموش معاہدے کے وقت سوزان سات برس کی تھی آج جبکہ جوزف جو برسوں سے اُن کا نمک خوار اور وفادار تھا جس کے ذمہ کھانا پکانے کے ساتھ بے بی کی دیکھ بھال بھی شامل تھی چالیس کے پیٹے میں ہونے کے باوجود بے حساب جوتے کھا رہا تھا۔وہ تمام گالیاں زنانہ ومردانہ اُس کے حصے میں آرہی تھیں جو کسی بھی بے غیرت انسان کا مقدر ہوا کرتی ہیں۔سوزان کے باغی ذہن میں ایک طرح کا جوار بھاٹا اُمڈ رہا تھا۔دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے.....!جوزف کے نکالے جانے پر ایک اور معاہدہ میاں بیوی کے درمیان ہوا.....!جب بھی ایک شخص باہر جائے گا دوسرا لازماً گھر پر رہتے ہوئے بے بی کو کمپنی دے گا.....

وقت کی رفتار پھر سبک روی سے اپنی چال چلنے لگی۔آہستہ آہستہ ماں اور باپ کو گذرے سانحہ کی شدت سے نجات ملنے لگی۔اُن کے خیال میں جو کچھ ہوا وہ بے بی کی کم سنی' کم عمری اور کم علمی کے باعث ہوا۔ماشااللہ اب بے بی جوانی میں قدم رکھ رہی ہے فرسٹ ایئر کی طالبہ ہے اچھا برا سمجھ سکتی ہے۔خیال دونوں کا درست اُس وقت ثابت ہوا جب بے بی ڈرائیور رابرٹ کے ساتھ پرائیویٹ کلینک کے چکر لگانے لگی۔بے بی کی سمجھداری نے ماں اور باپ دونوں کو کسی زحمت میں مبتلا کرنا مناسب نہ سمجھا۔رابرٹ کے ساتھ بھی جوزف والا رویہ اپنایا گیا اور اُسے بھی ڈرا دھمکا کر نوکری سے الگ کر دیا گیا۔

دونوں میاں بیوی پھر سر جوڑ کر بیٹھے اور مسئلہ کا حلا تلاشنے لگے۔ایک ہی حل شادی پر دونوں متفق تھے۔بے بی سے بڑی عاجزی اور انکساری سے اُس کی پسند دریافت کی گئی۔نفی میں جواب پا کر آئندہ کے لئے محتاط رہنے کی درخواست اور سرگرمی سے رشتہ تلاش کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی۔عجلت میں' بے بی سے پندرہ بیس برس زائد عمر کے رنڈوے شخص کا رشتہ دستیاب ہوسکا۔ابتدا میں دولہا میاں بڑے کم گو اور سادہ طبیعت کے دکھائی دیتے تھے۔شادی کی پہلی رات ہی اُن کا اصلی رنگ روپ اُس وقت ظاہر ہو گیا جب اُنہوں نے نئی نویلی دلہن سے صاف صاف لفظوں میں اُن کے معاشقوں کی تفصیل جاننا چاہی۔

پہلے پہل سوزان میڈیم کو بہت حجاب آیا۔وہ ہر بات کا جواب نفی میں دیتی رہیں۔بعد میں جب اُن کی ممی نے اُن کو سمجھایا کہ وہ کسی طرح کی کمزوری یا پشیمانی کا قطعی اظہار نہ کرے بلکہ صاف صاف کہہ دے کہ ''شادی

سے پہلے کی زندگی پر شوہر کا کوئی حق نہیں ہوتا'' لہٰذا سوزان میڈیم کے اس جواب کے بعد اُن کے شوہر نامدار کچھ زیادہ ہی منہ پھٹ ہو گئے۔ وقت بے وقت' بات بے بات سوزان میڈیم کا کردار زیر بحث لے آتے اور طرح طرح کے چبھتے سوالات کیا کرتے جن کا سوزان میڈیم کبھی غصہ اور کبھی حقارت سے من مانا جواب دیا کرتیں۔ آٹھ مہینے میں تین دن کم پر جب سوزان میڈیم کو زچگی کا درد اُٹھا تو اُن کے شوہر کو زبانی کُھل کھیلنے کا خوب موقع دستیاب ہوا۔ اللہ کی کرنی پیدائش کے تیسرے روز یرقان کے باعث بچہ چل بسا اور سوزان میڈیم ہر طرح کی آزادی کا پروانہ لے کر ہسپتال سے گھر آ گئیں۔

چند یوم کی تُو تکرار کے بعد میاں بیوی کے درمیان بول چال بند ہو گئی۔ آہستہ آہستہ سوزان میڈم کے والدین کے گھر کا قانون رائج ہو گیا۔ ابتدا میاں صاحب نے کی اور انتہا سوزان میڈم کے ہاتھوں ہوئی۔ پہلے پڑوسن کا کم سِن لڑکا جو جی شکار ہوا بعد میں شوہر کے بھتیجے رابرٹ سے جی بہلایا گیا اُس کے بعد کی قطار زنجیر کی طرح کڑی در کڑی پھلتی پھولتی گئی۔ جس طرح بارش کا پہلا قطرہ زمین کی پیاس بجھاتا ہے اُسی طرح پہلے دنیا میں آنے کے باعث اُس کی خوراک بھی سوزان میڈیم کے شوہر کو بننا پڑا۔ بظاہر الزام اُن کے دل کو گیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کا اصل حق دار کوئی اور ہی ہے۔ ایک زیادتی جاتے جاتے سوزان میڈم کے شوہر نے ضرور کی جسے سوزان میڈیم اُن کا احسان بلکہ اُن کا دیا ہوا اعزاز گردانتی ہیں۔

ایک دن گھر میں داخل ہوتے ہی میاں کا پارہ چڑھ گیا۔ اُن کے منہ سے مارے غصے کے جھاگ اُمڈنے لگی۔ ''لو بھلا بتلاؤ اب محلے والے بھی طعنے دینے لگے ہیں کہ میاں تمہاری بیوی کا چال چلن روز بہ روز خراب ہوتا جا رہا ہے۔ کچھ کرلو گر نہ ایک دن یا تو بیوی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے یا محلّے سے بے عزت کر کے نکالے جاؤ گے۔'' جواب میں سوزان میڈم نے بھی محلّے والوں کا نام لے کر شوہر کو بے نقط سنائیں۔ ''اجی وہ کون ہوتے ہیں مجھے بدمعاش کہنے والے۔ پہلے اپنی ماں بہنوں کو دیکھیں کہ وہ کس کس کے ساتھ کب کب رنگ رلیاں مناتی ہیں۔ اور یہ تم کیا دوسروں کے کہنے پر ہر وقت بری عورت! آوارہ عورت' بدمعاش عورت کی گردان کرتے رہتے ہو۔ برائی وہ ہوتی ہے جو چھپ کر کی جائے' میں جو کچھ کرتی ہوں ڈنکے کی چوٹ پر کرتی ہوں.....!'' ''کیوں نہیں کرو گی.....! کرنا ہی چاہیئے' یہ تو تمہارا خاندانی وطیرہ ہے.....!'' ''میرے خاندان پر انگلی اُٹھانے سے پہلے ذرا ملک کی ہائی فائی آبادیوں کا سروے کرلو جہاں بہت بڑی تعداد میں شادی کے چند سال بعد ہی میاں بیوی ایک دوسرے سے اوب کر آزادہ روی اختیار کر لیتے ہیں.....!'' سوزان میڈیم نے ترکی بہ ترکی گرہ لگائی۔ ''کرتے ہیں تو بھرتے بھی وہی ہیں ایسے لوگوں کے پیٹ کا جہنم کبھی نہیں بھرتا' ہمیشہ بھوکے ہی رہتے ہیں.....!'' ''یہ تمہارا خیال ہے.....! ہر کسی کی طلب اور بھوک کا پیمانہ الگ ہوا کرتا ہے۔ میرا پیٹ ایک روٹی کھا کر بھر جاتا ہے تم تین تین روٹیاں کھا کر بھی سیر نہیں ہوتے۔ میں نے تو کبھی تمہیں تمہارے پیٹ کی بھوک پر لعنت ملامت نہیں کی پھر تمہیں کیا حق ہے کہ تم کسی کی.....!'' جواب میں کہنا بہت کچھ چاہتے سوزان میڈم کے میاں کہہ نہ پاتے منہ ہی منہ میں بُڑبُڑ کر کے لفظ کتیا کا کئی بار وَرد کر کے پیر پٹکتے ہوئے باہر نکل جاتے۔

شوہر سے نجات کے بعد سوزان میڈیم نے پوش علاقہ میں گھر خرید کر فیشن ڈیزائننگ کا کورس کیا اور اپنا بوتیک کھول لیا جس کے لئے اُنہیں ایک مددگار اور معاون کی ضرورت تھی جو اُن کی طرح خوبصورت' سمارٹ' چاق و چوبند' حاضر دماغ' مہذب' ایکٹیو اور بہت حد تک کلچرڈ ہو۔ کافی تلاش بسیار کے بعد اُنہیں سکول کے زمانے کی ایک دوست روزی جوزف جو شادی کے بعد روزی میکس اور چوبیس سال کی عمر میں بیوگی نبٹا کر میڈم روزی کہلانے لگی تھی' مل گئی۔ عہدہ میڈم روزی کا میڈم سوزان کی سیکریٹری شپ کا تھا مگر دونوں کی پرانی دوستی کاروباری مفادات پر ہمیشہ حاوی رہی۔ میڈم سوزان نے بھی روزی میڈم کو دوست ہی تصور کیا۔ دونوں کے مزاج میں فطری طور پر موجود رومانیت اس دوستی کو اور بھی تقویت بخش رہی تھی۔

ابتدا میں میڈم روزی کام سے فارغ ہو کر اپنے گھر جایا کرتی تھی آہستہ آہستہ میڈم سوزان کا گھر اُن کا گھر بھی بن گیا اس میں کام کی زیادتی اور کام کے بعد کی مصروفیات و مشاغل کے علاوہ میڈم سوزان کے اصرار کو زیادہ دخل تھا۔ ایک معاہدہ دونوں کے درمیان پہلے دن طے پا گیا تھا کہ وہ کسی صورت ایک دوسرے کی پسند یا ایک دوسرے کے شکار کو منہ نہ ماریں گی۔ کھیل کے تمام اصولوں اور ضابطوں کی اُسی طرح پابند رہیں گی جس طرح کرکٹ' ہاکی' فٹ بال اور باسکٹ بال کے کھلاڑی ہوا کرتے ہیں۔ فرق یہاں اس قدر تھا کہ دونوں دوست بھی خود تھیں کھلاڑی بھی اور ایمپائر بھی۔ کبھی بھی میڈم سوزان کو میڈم روزی سے شکایت ہوئی نہ میڈم روزی کو اپنی باس کم دوست سے کسی زیادتی کا گلہ ہوا۔

کرنل آٹلر ظاہری طور پر مہذب اور وضع دار انسان تھے۔ دونوں خواتین کی عزت بھی بہت کیا کرتے تھے۔ کسی طور یہ ثابت نہ ہوتا تھا کہ اُن کی نظر التفات کس جانب ہے۔ ایک دن میڈم سوزان نے جان بوجھ کر کرنل آٹلر اور میڈم روزی کو تنہائی کا موقع فراہم کیا۔ دوسرے دن اُس وقت میڈم سوزان کو بڑی حیرت ہوئی جب میڈم روزی نے بتایا کہ سارا وقت کرنل آٹلر میڈم سوزان کی تعریفیں کرتے رہے عین اسی طرح جب میڈم روزی نے کرنل آٹلر اور میڈم سوزان کو یکجائی کا موقع فراہم کیا تو وہ اُن سے میڈم روزی کے بارے مبالغہ سے کام لیتے رہے۔ دونوں سہیلیوں نے یک جان و یک خیال ہو کر اُن سے جان چھڑانا ہی مناسب جانا۔ ڈاکٹر فلیمنگ البتہ دھڑلے کے آدمی تھے۔ برسرِ محفل میڈم سوزان کی تعریفوں کے ریلے میں خود بھی بہتے اور دوستوں کو بھی بہا لے جاتے۔ پہلی بار اُن سے ملاقات اُنہیں کے کلینک میں ہوئی جب سوزان کو

چیسٹ انفیکشن ہو گیا تھا۔ سوزان تیسرے روز ہی قلانچیں بھرنے پر آمادہ تھیں' ڈاکٹر فلیمنگ لوٹن کبوتر بن چکے تھے۔ تیسری تخلیہ ملاقات کے بعد سوزان میڈم نے ڈاکٹر فلیمنگ سے کبھی نہ ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بقول اُن کے وہ عشق بھی اسی طرح فرماتے ہیں جیسے مریض کا درجہ حرارت چیک کر رہے ہوں۔ دوسرے اُن کی عمر جس قدر کم نظر آتی ہے جذبے اُس کے برعکس زوال پذیر ہیں۔

ڈیوڈ کم گو اور زر آور انسان تھا مرتا وہ بھی میڈم سوزان پر ہی تھا پر اپنی بیوی سے ڈرتا تھا کہتا تھا وہ آج جو کچھ بھی ہے اپنی بیوی کے طفیل ہے۔ اُس کے باپ نے جہیز میں ایک فارم اور ایک مکان دیا تھا۔ ڈیوڈ نے بعد میں فارم بیچ کر کاروبار شروع کیا اور شہر کا اہم آدمی بن گیا۔ کچھ عرصہ غائب رہنے کے بعد ڈیوڈ نے میڈم سوزان سے تعلقات کی استواری کے لئے بہت ہاتھ پیر مارے' میڈم روزی کو بھی شیشے میں اُتارنے کی کوشش کی پر کوئی بھی حربہ کارگر ثابت نہ ہوا۔ ایسا ہی رویہ میڈم روزی نے ٹیلر فلم پرڈیوسر کے ساتھ روا رکھا تھا کہ وہ میڈم روزی پر جیب ڈھیلی کرنے کے بجائے زبان سے کام لیتا تھا۔ ہر تیسرا لفظ میڈم کو ہیروئن بنانے پر خرچ کیا کرتا تھا اس کے علاوہ نظر اُس کی میڈم سوزان پر بھی صاف نہ تھی۔ دونوں سہیلیوں نے ایکا کر کے ٹیلر کی ایسی چھٹی کرائی کہ پے در پے بیچارہ تین فلمیں فلاپ کرا بیٹھا۔

آدمی کام کا ہارڈی بھی بہت تھا۔ جب چاہو جہاں چاہو حاضر موجود ہر کام پر آمادہ' مزاج بھی میڈم سوزان سے بہت قریب' اعصاب کا مضبوط' لحیم شحیم' سرخ سفید' جوان رعنا' دل پھینک اُسی غضب کا صاف صاف لفظوں میں حرفِ مدعا بیان کر دیا کرتا۔ خرابی سب سے بڑی یہ کہ ایک وقت میں دونوں کے قرب کا خواہاں۔ آخر میں میڈم روزی کے فراق میں اس قدر مبتلا ہوا کہ شادی کی پیشکش کر بیٹھا۔ سوزان میڈم نے اُس کی سنجیدگی کے پیشِ نظر میڈم روزی کو اجازت بھی دینا چاہی۔ میڈم روزی نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ حلیم اور بریانی میں چلنے والا کفگیر کبھی بھی دال ساگ کے کام کا نہیں ہوتا۔ دال ساگ ہمیشہ ہانڈی میں ہی پکتا ہے اور ہانڈی کو کفگیر سے کیا کام وہ تو ڈوئی ہی سے مگن رہتی ہے۔

دونوں کی چند سالہ رفاقت میں درجنوں مرد آئے اور گئے مگر اُن کی دوستی پہلے روز کی طرح اٹل اور مضبوط رہی۔ وجہ دونوں کی ایمانداری اور پیشہ ورانہ اپروچ تھی۔ بہت سے مرد کئی بار اُن کی زندگی میں ایسے آئے جو باری باری اُنہیں ہمیشہ کے لئے اپنا بنانا اپنے گھر کی زینت دیکھنا چاہتے تھے۔ دونوں ہی کبھی کسی کے جھانسے میں نہ آئیں۔ اُن کا مقصد کھلی ہواؤں' آزاد فضاؤں میں محوِ پرواز رہنا تھا۔ دونوں ہی اپنی اپنی زندگی میں مرد کی غلامی کا طوق پہن چکی تھیں۔ دونوں ہی گئے دنوں کی یادوں سے خوف زدہ تھیں۔ سچی بات یہ کہ دونوں کو روز روز کی یکسانیت سے چڑ تھی۔ وہ غریب کے دسترخوان کی طرح بے بس و مجبور رہنا نہ چاہتی تھیں۔ بھوک ہو نہ ہو کھا کھا کے اوجڑی بھرتے رہو اور جی متلاتے رہو یا پھر ہر روز دال ساگ' جی بھرے نہ بھرے وہی چٹنی روٹی' طبیعت سیر ہو نہ ہو وہی بے مرادی.....! ایک طرح سے دونوں کے درمیان غیر تحریری معاہدہ تھا کہ ایک دن' ایک ہفتہ یا ایک مہینہ سے زیادہ کوئی تعلق نبھانا نہ چاہیئے اُن کے خیال میں یہ بوسیدگی کی علامت' تعفن کی نشانی اور ٹھہراؤ کی جانب اشارہ ہے۔ ایک طرح سے یہ قدرت کی نعمتوں سے منہ موڑنے کے مترادف بھی ہے۔ جب جگہ جگہ' قدم قدم' گلی گلی' شہر شہر اور قریہ قریہ آپ کی من پسند اشیاء دستیاب ہوں پھر ایک جگہ رُک جانا' ٹھہر جانا' سمٹ جانا اُن کے خیال میں کور ذوقی کی دلیل ہے۔

ساحل سمندر' کوہ دمن' باغات' پبلک پارک' تھیٹر' سینما' کلب' کوفی شاپ' ریسٹورنٹ' ہوٹل.....! کوئی بھی جگہ اُن کی دسترس سے باہر نہ تھی۔ موسم' ماحول' مزاج اور منشا کے مطابق ہر شام مخصوص مقامات کا طواف رہا کرتا جب جب جہاں جہاں مقصد برآری ہوتی اُسی جگہ زیادہ گذر رہتا۔ گذشتہ ایک ہفتہ سے میرا خیال ہے چھ دن سے کیونکہ ساتواں اور آخری دن آج شروع ہونا تھا۔ یہ فیصلہ کُن ہونا چاہیئے اُن کے اہداف کے مطابق ایک' دو' تین' پانچ یا سات روز سے زیادہ کسی ایک سمت میں پیش رفت قطعی طور پر نامناسب بلکہ ناجائز ہے۔ بقول اُن کے یہ وقت کا ضیاع اور احساسات جمال کی توہین ہے۔ ایسا شاید کبھی ہوا بھی نہیں کہ مقررہ دنوں میں اُن کا مطلوب ماہی بے آب بن کر اُن کے دام کا اسیر نہ ہوا ہو۔

ساحل سمندر پر گذشتہ چھ روز سے کالے رنگ کی اپ ماڈل باون سوسی سی مرسڈیز میں چھ فٹ سے اوپر قد' تیس برس کے لگ بھگ عمر' چالیس چھاتی' بتیس کمر' سرخ رنگت' ورزشی جسم اور بھوری آنکھوں پر کالا چشمہ اُن کے طواف میں ہے۔ واضح طور پر اُس کا جھکاؤ میڈم سوزان کی جانب دکھائی دے رہا ہے۔ تیسرے روز سے ہیلو ہائے کے بعد روزی میڈم نے خود پر اجنبیت طاری کر لی ہے۔ ساتھ ہی اُنہوں نے میڈم سوزان کو ہر روز دس منٹ تاخیر سے آنے کی تاکید کی ہے تاکہ فریقِ ثانی کے جذبات کی شوریدہ سری خوب بے لگام ہو۔ وہ گذشتہ کئی دنوں سے اُن کی آمد سے پہلے گرے رنگ کے ٹریک سوٹ جس کے درمیان سے عنابی پٹی گذر رہی ہے ورزش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہر روز میڈم سوزان سے ہیلو ہائے کرنے کے بعد اُن کا اور اُن کی دوست کا احوال دریافت کرتا ہے۔ وہ ہر روز اُنہیں کھانے کی دعوت پر اصرار سے بلاتا ہے۔ آج..... مگر..... آج وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا.....! حالانکہ.....! حالانکہ.....! گذشتہ کل اُس سے کافی راہ و رسم بڑھی ہے.....! گذشتہ کل اُس کی دعوت کے جواب میں حوصلہ بخش اُمید دلائی گئی ہے.....! گذشتہ کل ہی ٹیلی فون اور موبائل نمبروں کا تبادلہ ہوا ہے.....! گذشتہ کل ہی ذاتی پسند و ناپسند میں مماثلت پائی گئی ہے.....! گذشتہ کل ہی ایک دوسرے کی مقناطیسی شخصیت کا اقرار کیا گیا ہے.....! گذشتہ کل ہی تعلقات کی استواری پر زور دیتے رہے ہیں.....!

''چہارسُو''

گذشتہ کل ہی آنے والے دنوں میں رنگ بھرا گیا ہے.....! گذشتہ کل ہی دو دلوں کی دھڑکن یک جان ہونے پر آمادہ ہوئی ہے.....! گذشتہ کل.....! گذشتہ کل.....! گذشتہ کل ہی.....ارے رے رے.....! یہ کیا.....! آنکھوں پر یقین نہیں آرہا.....! وہ.....! وہ آرہا ہے.....! اُس کی گاڑی سبک روی سے اسی جانب چلی آرہی ہے.....! قریب.....! اور قریب.....! اور قریب آگئی ہے.....! یہ دل.....! دل اس قدر بے قرار کیوں ہے.....! روزی کی بچی بت بنی پتھر پر کب تلک بیٹھی رہے گی.....! وہ آ کیوں نہیں جاتی.....! کیوں بے قرار دل کو ڈھارس نہیں بندھاتی.....! وہ نزدیک بہت نزدیک آرہا ہے.....اور.....! اور نزدیک آگیا ہے.....! بس میں اب کچھ بھی نہیں ہے.....! یہ.....! یہ آنکھوں کو کیا ہوگیا ہے.....! منظر دھندلا کیوں رہا ہے.....! وہ آ کیوں نہیں جاتا.....! وہ.....! آتے.....! آتے.....! راہ سے بھٹک کیوں گیا ہے.....! وہ.....! وہ نظر کیوں نہیں آرہا.....! وہ نہیں آتا کم از کم روزی ہی آجائے.....! دل بیتاب.....! دلِ بیتاب کو کسی قدر قرار تو آئے.....! میڈم سوزان پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی ہے.....! بظاہر وہ اُن کی طرف.....! ہاں ہاں اُن کی طرف ہی بڑھا آرہا تھا.....! پھر.....! پھر اچانک.....! اُس کا سایہ.....! اُس کا سایہ معدوم ہوگیا.....! یکدم معدوم ہوگیا.....! اُس کی گاڑی بھی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی ہے.....! اُن کی عزیز سہیلی.....! عزیز ترین سہیلی.....! روزی.....! میڈم روزی بھی کہیں کھو گئی ہے.....!

سامنے.....! بالکل سامنے کی طرف' ڈھلوان پر بیٹھا اسّی پچاسی سال کا بوڑھا بلڈاگ کُتے کی زنجیر تھامے سارا منظر دلچسپی سے دیکھ رہا ہے.....! سورج آہستہ آہستہ ڈھلک رہا ہے.....! بے ساختہ طور پر بوڑھے کے ہاتھ سے بلڈاگ کُتے کی زنجیر چھوٹ جاتی ہے.....! سورج نڈھال ہوگیا ہے.....! بلڈاگ کُتا میڈم سوزان کے نزدیک پہنچ کر منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکالنے لگا ہے.....! سورج بالکل معدوم ہوگیا ہے.....! سمندر کی لہریں اندھیرے کی چادر اوڑھ چکی ہیں.....! بلڈاگ میڈم سوزان کے قریب.....! اور قریب.....! اور قریب ہوکر اُن کے پیر چاٹنے لگا ہے.....! میڈم سوزان کی آنکھوں سے نکلتے شعلے' ننھی پھوار میں تبدیل ہورہے ہیں.....! اُن کے چہرے کی رنگت شگفتہ .....! شگفتہ تر ہونے لگی ہے.....! بوڑھا ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجائے جیب سے سگار نکال کر سلگا رہا ہے.....! دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھرنے لگے ہیں . . . .! اوس کے مہین قطرے بشاشت کا احساس اُجاگر کر رہے ہیں۔ آہستہ.....! آہستہ.....! دھوئیں کے طاقت ور مرغولے فضا میں دم توڑ رہے ہیں.....! فضا پُراسرار اور پُرسکون ہوگئی ہے.....! ہر طرف امن وشانتی کی چادر تن چکی ہے.....!!!

بقیہ: نجات

سے پانی بھی بہہ رہا تھا۔ روگا مرض پنپ رہا تھا۔ ڈاکٹر رضا نے Becamol کا انجکشن لگاتے ہوئے کہہ دیا کہ کل ایک اور انجکشن لگوالینا تمہاری ماں بالکل بھلی چنگی ہوجائے گی۔ شگن بائی کے چہرے پر تسلی اور اطمینان نکھر آیا۔

ڈاکٹر، ڈاکٹر رضا اندر آئے کہ موبائل چیخ اٹھا۔ کیلیفورنیا سے اُن کے بیٹے عبّاس کی کال تھی۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھے اور بیگم رضا نے موبائل جھپٹ لیا۔ ممتا دل کا غبار ہلکا کرنے لگی۔ عباس نے ویزا اور ٹکٹ بھیجنے کی بات کہی۔ اگلے اتوار کی فلائٹ سے دونوں کو اس سے جاملنا تھا۔ ڈاکٹر رضا رات کے گیارہ بجے تک ماسٹر کمال الدین سے گپ شپ کرتے رہے۔ زندگی میں پہلی بار آسمان میں ستاروں سے تاکا جھانکی اور بچپن کے چندا ماما سے آنکھیں چار کریں گے۔ عباس کے پاس پہونچنے میں کتنے گھنٹے لگیں گے۔ ناشتہ کھانا بھی جہاز میں ملتا ہے۔ ٹائلٹ بھی وہیں اور نیند بھی وہیں۔

''خدا کی پناہ۔ ٹائلٹ میں سب کچھ کرنا ہوگا''

یار کمال الدین یہ تو کمال ہوگیا'' اچانک ڈاکٹر رضا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ان کے دماغ کو جھٹکا لگا۔ گھر کے ٹائلٹ کی سٹکنی نہیں لگاتے تھے۔ ہوائی جہاز میں بالٹی رکھنے کو کہاں ملے گی۔ وہ بوکھلائے سے اٹھے اور گھر کی

''اہلِ سیاست''

خورشید انور رضوی

(اسلام آباد)

پانی دے دے تھک بیٹھا ہے سوکھے باغ کا مالی
باہر آنے سے ہے گریزاں اندر کی ہریالی

سب کچھ اُس پر چھوڑ رکھا ہے، کون کرے رکھوالی
چوکیدار ہیں چور اُچکے گھر کا اللہ والی

دنیا والو! اک دوجے کو دوشی مت ٹھہراؤ
ایک ہی ہاتھ سے بجتی ہم نے کبھی نہ دیکھی تالی

اپنی قسمت میں ہی شاید لکھّا ہے اندھیارا
تھوڑی دیر کو چمکے سورج پھر اک رات ہو کالی

بے شک اس کی چار ہیں شاخیں پھر بھی شجر ادھورا
برسوں جس پر کیا بسیرا ٹوٹ گئی وہ ڈالی

یہ تو صاحب! ظلم ہے ہم پر کوئی حکم چلائے
ہم یہ دیس بنانے والے ہم اس دیس کے والی

ایسے میں خورشیدؔ تمہی کچھ میٹھے بول سناؤ
اہلِ سیاست کا اب شیوہ گولی ہے یا گالی

عارف شفیق

(کراچی)

منزل ہے جس جگہ پہ وہیں رہگذر بھی ہے
ہے زندگی طویل مگر مختصر بھی ہے

آوارگی کو میری زمانہ گذر گیا
میں بھول ہی گیا کہ کوئی میرا گھر بھی ہے

ماں باپ کی نگاہ میں معتوب بھی وہی
جو اپنے والدین کا لختِ جگر بھی ہے

دشتِ طلب میں شمعِ تمنا ہے اس طرح
دیکھو تو جس بھی ہے ہواؤں کا ڈر بھی ہے

میرے بدن نے فکر کی قیمت چکائی ہے
یہ جسم میرے ذہن کا نیلام گھر بھی ہے

دیکھو تو ہیں رکے ہوئے کاغذ پہ گونگے لفظ
ورنہ یہ میری سوچ کا اندھا سفر بھی ہے

ہیں جس جگہ مزار تمناؤں کے بہت
اُس راستے پہ آؤ تو عارف کا گھر بھی ہے

کوثر صدیقی

(بھوپال، بھارت)

ہر سر برہنہ شخص بھی اک تاجدار ہے
اس انجمن میں جو بھی ہے وہ ذی وقار ہے

کچھ دن کے بعد دھوپ ہی کا ہوگا سامراج
کچھ برگدوں کی موت کا اور انتظار ہے

حاصل کہاں ہوئی ہے غموں سے ابھی نجات
کچھ حادثوں کا اور ابھی انتظار ہے

اپنی خطائیں کوئی بھی کرتا نہیں قبول
ہر شخص اپنے تیر کا خود ہی شکار ہے

مٹی میں دفن ہے جو سُلگتے دلوں کی آگ
لاوا سا پھوٹنے کے لیے بے قرار ہے

ہے صورتِ گلاب شگفتہ مکاں مگر
ایک ایک برگ منتظرِ انتشار ہے

مصنوعی پھول مہکے ہوئے ہیں چمن چمن
کوثرؔ خزاں کے دَور میں فصلِ بہار ہے

○

پروفیسر زہیر کنجاہی
(راولپنڈی)

اندھیرے گھر میں یہی روشنی کا پہلو ہے
ہمارے پاس بُہت سے بُہت اِک آنسو ہے

تمہاری ذات کا احساس دِل میں بس جائے
مشامِ جاں میں جو حور و پری سی خوشبو ہے

اِسے تو اور ٹھکانا کہیں نہیں ملتا
یہ دل ازل سے تمہارے نگر کا سادھو ہے

چلا ہے اسپِ رواں جنگلوں سے دُور کہیں
اور آگے آگے تھکاوٹ سے چُور آہو ہے

کِسی بھنور میں ہے بے تابیوں کا زہر بھرا
کسی کے جام میں آسودگی کا دارو ہے

غزل زہیرؔ کی جدّت سے بھر گئی ہے بُہت
ہر ایک لفظ میں حسنِ گماں کا جادو ہے

○

پرویز مظفر
(یو۔کے)

نام لکھا میرا ہتھیلی پر
اور تہمت رکھی سہیلی پر

چار ہنستے تھے چار روتے تھے
جب لگیں بولیاں حویلی پر

بچّیاں نوچ لے گیں ان کو
چار ہی پھول تھے چنبیلی پر

سینکڑوں لوگ تھے تماشائی
پانچ بدکار اُس اکیلی پر

شعر میں بات کر محبت کی
تھوڑی بالائی ڈال جیلی پر

○

صابرؔ عظیم آبادی
(کراچی)

دل میں جو بات تھی وہ بات نہیں ہو پائی
جانے والے سے ملاقات نہیں ہو پائی

آج بھی رویا نہیں کوئی ہماری خاطر
آج بھی شہر میں برسات نہیں ہو پائی

زندگی اپنی کسی موڑ کسی مرکز پر
واقفِ گردشِ حالات نہیں ہو پائی

بحث و تکرار میں دونوں ہی رہے الجھے ہوئے
راز کی بات کوئی رات نہیں ہو پائی

دیکھ کر رنگ نیا ڈھنگ نیا دنیا کا
ہم سے تقلید روایات نہیں ہو پائی

جانے کیا بیچ میں دیوار انا تھی حائل
تم سے مانوس مری ذات نہیں ہو پائی

کس طرح دیکھتا میں عکسِ رخِ دور طرب
کم کبھی تلخیٔ حالات نہیں ہو پائی

اس کے وعدے پہ یقین تھا نہ مجھے جس کے سبب
پھر سے تجدید ملاقات نہیں ہو پائی

سر پہ چھائی تھی گھٹا جھوم کے صابرؔ لیکن
بارشِ لطف و عنایات نہیں ہو پائی

○

رؤف خیر

(حیدرآباد، دکن)

ہم اگر ردعمل اپنا دکھانے لگ جائیں
ہر گھمنڈی کے یہاں ہوش ٹھکانے لگ جائیں

خاکساروں سے کہو ہوش میں آنے لگ جائیں
اس سے پہلے کہ وہ نظروں سے گرانے لگ جائیں

دیکھنا ہم کہیں پھولے نہ سمانے لگ جائیں
عندیہ جیسے ہی کچھ کچھ ترا پانے لگ جائیں

پھول چہرے یہ سرِ راہ ستارہ آنکھیں
شام ہوتے ہی ترا نام سجھانے لگ جائیں

اپنی اوقات میں رہنا دلِ خوش فہم ذرا
وہ گزارش پہ تری سر نہ کُھجانے لگ جائیں

ہڈیاں باپ کی گودے سے ہوئی ہیں خالی
کم سے کم اب تو یہ بیٹے بھی کمانے لگ جائیں

اک بَل سے کہیں دو بار ڈسا ہے مومن
زخم خوردہ ہیں تو پھر زخم نہ کھانے لگ جائیں

دعویِ خوش سخنی خیرؔ ابھی زیب نہیں
چند غزلوں ہی پہ بغلیں نہ بجانے لگ جائیں

تصور اقبال

(اٹک)

سرِ شاخِ شجر اک سانپ نے سر جو نکالا تھا
پرندوں نے بڑی مشکل سے بچوں کو سنبھالا تھا

جلا کے اپنا تن من ہم نے اس ظلمت کو ٹالا تھا
کہاں ورنہ ہمارے چارسُو اتنا اُجالا تھا

بلکتے چیختے بچوں کو بُھوکا دیکھتی کیسے
فسُردہ ماں نے پتھر دیگچی میں جب اُبالا تھا

دعائے نیم شب میں جو ملا تھا تیری جانب سے
وہی اک روگ ہے جو میری چاہت کا حوالا تھا

سُنا ہے وہ کسی شیطان کے نرغے میں پھر آئے
بڑی مشکل سے ہم نے اُن کو سیدھی رہ پہ ڈالا تھا

ہمیں اس کی تہوں سے بھی خزانہ مل نہیں پایا
سمندر کو وگرنہ ہم نے حد درجہ کھنگالا تھا

بھلے اب مر ہی جائے وہ مریضِ عشق بے چارا
تری بیمار پُرسی نے اُسے کچھ تو سنبھالا تھا

نوید سروش

(میرپور خاص، سندھ)

شگفتگی کے سراب میں تھا
نئی رتوں کے عذاب میں تھا

میں اپنا رستا بدلتا کیسے
وفاؤں کے ارتکاب میں تھا

ہمیشہ رشتہ رہے گا تم سے
نجومیوں کے حساب میں تھا

تم اپنا حصّہ نکال بھی لو
سزاؤں کے انتخاب میں تھا

جو ہے صداقت کتاب میں ہے
یہی ہمارے نصاب میں تھا

اُسی تو لمحے سروشؔ چمکا
جو وقت کے احتساب میں تھا

○

شہاب صفدر

(ڈیرہ اسماعیل خان)

محشر عروجِ گرمیٔ جذبات ہی نہ ہو — تقریب کوئی بہرِ ملاقات نہیں نہ ہو
کچھ سوچ کر کرو مری سوچوں سے اختلاف — انجامِ کار نفی بھی اثبات ہی نہ ہو
کیسے وہ آئے ہاتھ جو ہو دسترس سے دُور — کیسے بنائیں بات جہاں بات ہی نہ ہو
کرتا نہیں جو حسنِ سلوک اب کسی کے ساتھ — وہ کج مزاج کشتۂ حالات ہی نہ ہو
تم نے سمجھ لیا ہے اسے جنسِ رائیگاں — یہ زرد پھول پیار کی سوغات ہی نہ ہو
اک دن کہ جس کی یاد منائے ہر ایک دن — اک رات جس کے بعد کوئی رات ہی نہ ہو
ظالم بطورِ مشغلہ یوں محوِ ظُلم ہے — جیسے کسی عمل کی مکافات ہی نہ ہو
مانا کہ امرِ واقعہ تشویش ناک ہے — لیکن کہیں یہ عکسِ خیالات ہی نہ ہو
اعزاز پائے رند بلوچ اُس میں کیا شہاب — جس منطقے میں عزتِ سادات ہی نہ ہو

شگفتہ نازلی

(لاہور)

دیا اُس کھوج کا جلتا نہیں ہے — سِرا اب سوچ کا ملتا نہیں ہے
بہت سوچا ہے اس موضوع کے بارے — مگر کیا ہے کہ کچھ کھلتا نہیں ہے
عجب یکسانیت کا سا سماں ہے — اُداسی کا پہر ڈھلتا نہیں ہے
یہ کیسی بے کلی پھیلی ہوئی ہے — شگوفہ آس کا کِھلتا نہیں ہے
کسی بھی طرح سے یہ اُڑتا آنچل — بکھرتے رنگ میں گھلتا نہیں ہے
شباہت کیسے ان چہروں میں ڈھونڈیں — کوئی اِک دوجے سے ملتا نہیں ہے
ہرے موسم میں بھی اس شاخ پر اب — کہیں کچھ پھولتا پھلتا نہیں ہے
سفر کا راستہ کیوں کر کٹے گا — کہ جو ہے ہم سفر، چلتا نہیں ہے

ندیم ہاشمی

(کراچی)

میری آنکھوں نے جو منظر دیکھے — ایسا لگتا ہے سمندر دیکھے
ایک صورت ہے جھلملاتی ہوئی — اک ستارہ ہے جو شب بھر دیکھے
آرزو ہے کہ کبھی چاند کوئی — بام سے اپنے اُتر کر دیکھے
شبِ ہجراں میں ڈھل گئے کیسے — خواب جو وصل کے اکثر دیکھے
کتنے خوابوں کو یہ تمنا ہے — آئینے میں وہ سنور کر دیکھے
حُسن کی آگ جہاں روشن ہو — دلِ بیتاب برابر دیکھے
کیا زمانے میں روش اُتری ہے — وہ جو دلبر تھے، ستمگر دیکھے

مشتاق اعظمی (آسنسول، بھارت)

دل میں جو ذرا جھانکیں ٹوٹا ہوا ملتا ہے
اس عہد کا ہر انساں بکھرا ہوا ملتا ہے

بڑھ جاتی ہے جینے کی کچھ اور للک دل میں
جب ماں سے کوئی بچہ ہنستا ہوا ملتا ہے

بےخواب دریچوں پر ہنس دیتے ہیں کچھ لمحے
فٹ پاتھ پہ جب کوئی سویا ہوا ملتا ہے

لو بادہ کشو پی لو، حسرت نہ رہے باقی
پیمانہ سر محفل چھلکا ہوا ملتا ہے

ہر رات مری پلکیں کچھ خواب سجاتی ہیں
ہر صبح مرا تکیہ بھیگا ہوا ملتا ہے

کیا بات ہے دیوانہ ہاتھوں میں لئے پتھر
دوراہے پہ بس مجھ کو تکتا ہوا ملتا ہے

مشتاق نہ جانے کیوں ہلکا سا تبسم بھی
جب ہونٹوں سے ملتا ہے، سہما ہوا ملتا ہے

مظہر بخاری (میاں چنوں)

پلکوں میں چھپا خواب دل آویز نہیں ہے
ورنہ ترا بیدار کم آمیز نہیں ہے

بس یونہی ترا دردِ سر الزام لیا ہے
یہ آنکھ تو منّت کشِ کاریز نہیں ہے

ہنگامۂ خورشید اُٹھا رکھتے ہیں کل پر
خاکسترِ جاں غازۂ تبریز نہیں ہے

اب حبسِ مسلسل کا مداوئ ہے ضروری
زنداں کی یہ مجبور ہوا تیز نہیں ہے

گم کردۂ منزل ہے تو وہ اسپ سیہ بخت
جس کے کفِ پا میں کوئی مہمیز نہیں ہے

میدان نہ چھوڑو کبھی پسپائی کے ڈر سے
دشمن کی سپہ اتنی بلاخیز نہیں ہے

بھیجا ہوا گلدستہ ترا جس پہ سجا دوں
ایسی مرے کمرے میں کوئی میز نہیں ہے

کیا مجھ کو ڈراتا ہے تو سورج کی تپش سے
اس دشت میں مظہر کوئی نوخیز نہیں ہے

وشال کھلّر (لدھیانہ، بھارت)

کتنا مشکل ہے کوئی کام زبانی کرنا
اس نے سیکھا ہے ابھی آگ کو پانی کرنا

لفظ ہوگا نہ کوئی لفظ کا پیکر ہوگا
یہ ہنر اور ہے دریا میں روانی کرنا

رات ڈھلتی ہے تو پھر وقت بدل جاتا ہے
غیرممکن ہے نئی صبح پرانی کرنا

فاصلے راہ کے خاروں سے بھی بڑھ جاتے ہیں
کاش آتا نہ جوانی کو جوانی کرنا

خواب محفل میں تو رکھ لینا اسی کا چرچہ
بزمِ جاناں میں مگر اور کہانی کرنا

کیسا انداز فقیرانہ ہے اے دل تیرا
غم کی صحبت ہی میں، آشام سُہانی کرنا

اس کی آنکھوں میں تو اک خواب کا جنگل ٹھہرا
اس کے موسم میں نہیں نیند کو پانی کرنا

صاف کہہ دیتا ہے ہر بات کو فرداً فرداً
جیسے آتا ہی نہیں رمز بیانی کرنا

ہیں تو اشعار بہت، پڑھتا ہوں چیدہ چیدہ
اچھا لگتا ہے کبھی بات سیانی کرنا

درد بڑھ جائے تو لاتا ہے دوائیں اپنی
یوں تو کچھ عیب نہیں زخم کو ثانی کرنا

عشق میں یہ بھی کیا وہ بھی کیا کھلّر جی
یہ نہ ممکن تھا مگر آگ نہ پانی کرنا

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا، امریکہ)

قسط ۱۱

سلطانہ آپا کی شادی

سلطانہ آپا کی شادی ۱۴ جولائی ۱۹۵۷ کو کراچی میں ہوئی۔ یہ ہمارے گھر کی پہلی شادی تھی اور پھر سلطانہ آپا میرے والدین کی بہت لاڈلی تھیں اس پر طرہ یہ کہ اللہ نے انہیں بہت ہی اچھا سسرال عطا کیا تھا اور انکے دولہا جنہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم کام کیا تھا کسٹم میں بہت اعلی عہدے پر فائز تھے۔اس لئے میرے والدین نے انکی شادی اپنی استطاعت سے بڑھ کر کی۔ یہ شادی کراچی میں ہونی تھی اور ہم میرپور خاص میں تھے اس لئے کراچی میں کسی کو اسکے انتظام کی ذمہ داری اٹھانی تھی۔کراچی میں جن پر بھروسہ تھا ان سب نے نظریں پھیر لیں کہ ہم تو بہت مصروف ہوتے ہیں۔اس پر میری خالہ زاد بہن کشور آپا جو ایک اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں، نے یہ ذمہ داری اٹھائی۔ پھر یہ سوال اٹھا کہ کس کے یہاں سے یہ شادی کی جائے۔اس زمانے میں صفات ماموں کا بنگلہ تھا اور خاندان کی زیادہ تر شادیاں وہیں سے ہوئی تھیں مگر اس دفعہ انہوں نے بھی معذرت چاہ لی۔اس پر میرے سگے ماموں مظہر ماموں جان، جنکا مکان چھوٹا تھا مگر انکا دل بڑا تھا، خوشی سے یہ بوجھ اٹھایا۔شادی سے پہلے کا رتجگہ اس قدر دھوم دھام سے ہوا کہ لوگ آج بھی اسکو یاد کرتے ہیں۔شادی اور ولیمہ بھی یادگار تھے۔شادی کے فوراً بعد سلطانہ آپا اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون کے لئے تیز گام کے ذریعہ کوہ مری گئیں۔ہم ان سے ملنے حیدر آباد گئے۔ وہ ائر کنڈیشن کوچ میں سفر کر رہی تھیں۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ خاندان کا کوئی جوڑا ہنی مون کے لئے کہیں گیا تھا۔ہم لوگ خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے اور اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتے تھے۔

خمیازہ خمیازہ۔۔مشکل حالات

اب میں اپنے کنبے کے اس دور کا تذکرہ شروع کرتا ہوں جو شاید میرے کنبے کی تاریخ کا سب سے مشکل اور صبر آزما دور تھا اور جس نے میری شخصیت پر ایسے اثرات چھوڑے جو آج بھی قائم ہیں۔ یہ سال یعنی ۱۹۵۷ اور ۱۹۵۸ اور اسکے بعد بھی کئی سال ہمارے لئے بہت مشکل تھے اور اس زمانے میں بہت سے لوگوں کی اصلیت کم از کم میرے لئے بے نقاب ہوگئی۔ اگر دنیا کے لئے میرے دل میں کچھ تلخی ہے تو وہ شاید اسی دور کا نتیجہ ہے۔اسی کے ساتھ اگر مجھ میں یہ احساس بیدار ہوا کہ مجھ پر اس دنیا کا، اسکے نادار لوگوں یا ضرورت مندوں کا قرض اور فرض ہے جسکو ادا کرنے کے لئے مجھے ہمیشہ خوش دلی کے ساتھ تیار رہنا چاہئے تو وہ ابھی اسی دور کی وجہ سے ہے۔میں حالانکہ اس زمانے میں دس گیارہ سال کا تھا مگر میں بہت حساس تھا اس لئے مجھے یہ دور کبھی نہیں بھولتا۔در اصل جب تک میں ڈاکٹر بن کر کراچی کے امریکن ہسپتال میں تعینات نہیں ہوگیا اس وقت تک ہمارے مالی حالات بیحد دشوار تھے اور ہم مستقل آزمائشوں سے گذرتے رہے۔

ایک تو سلطانہ آپا کی شادی پر الللے تللے کرنے کی وجہ سے ہم قرض دار ہوگئے تھے دوسرے قسمت ہمارے لئے دوسری آزمائشیں لئے کھڑی تھی۔ابا ریلوے میں گارڈ تھے انکی ملازمت کی وجہ سے یہ ضروری تھا کہ وہ ہر سال آنکھوں کا امتحان دیں۔اس کے لئے وہ کراچی میں ریلوے کے بڑے ہسپتال جاتے تھے۔ یہ امتحان انکی نوکری کے لئے اسقدر ضروری تھا کہ انکی غیر موجودگی میں ہمارے یہاں خاص دعائیں مانگی جاتی تھیں کہ وہ پاس ہوجائیں۔اس دفعہ جب وہ واپس آئے تو بہت چپ چپ تھے۔پھر واپس آکر وہ اپنی نوکری پر بھی نہیں چڑھے، بس نیم کے نیچے بیٹھے آتی جاتی گاڑیوں کو تکا کرتے تھے۔کوئی پوچھے تو بس ٹال دیا کرتے تھے۔آخر جب اماں نے بہت زور دیکر پوچھا تو کہنے لگے کہ میں آنکھوں کے امتحان میں فیل ہوگیا۔انکی آنکھوں میں موتیا اتر رہا تھا۔کہنے لگے اب میں گارڈ نہیں رہونگا اس لئے مجھے واپس نوکری پر نہیں چڑھایا جارہا۔گھر میں تو صف ماتم بچھ گئی۔گارڈ کی تنخواہ بہت اچھی تھی اور اس میں شادی کا قرضہ اتارنا آسان تھا۔سلطان بھائی جان نے اسی ماہ بی اے کا امتحان پاس کیا تھا اور انکی عمر بمشکل اکیس سال تھی وہ ریلوے میں کلرک تھے انکی کل تنخواہ پچاسی روپئے تھی جس میں گھر کے اخراجات بھی نکلنا مشکل تھے۔بقول میری اماں کہ ہمیں دن میں تارے نظر آرہے تھے۔کچھ دنوں کے بعد ریلوے کا آرڈر آیا کہ میرے ابا کو اب پارسل کلرک بنا دیا جائیگا۔اس ملازمت میں کوئی اوور الاؤنس نہ تھا اور ابا کی تنخواہ اب ساڑھے تین سو سے گھٹ کر ایک سو پچیس ہوگئی۔ پھر بھی ہم اس بات سے خوش تھے کہ کم از کم پھر سے مستقل آمدنی کا ذریعہ تو ہوا۔ یہ سوچ کر کہ کراچی میں ہمارے عزیز بہت اچھے اور اعلی عہدوں پر قائم ہیں اور وہ بڑے با اختیار ہیں سلطان بھائی جان کو کراچی بھیجا گیا۔انکے پاس تازہ ترین بی اے کی ڈگری تھی اور ہمیں یقین تھا کہ ہمارے رشتہ دار انکی اس سلسلے میں مدد کرینگے۔ پہلے تو کسی نے انکے رہنے اور ٹھہرنے کی ہامی نہیں بھری۔اس دفعہ پھر میری خالہ زاد بہن کشور آپا کام آئیں جہاں سلطان بھائی جان کے رہنے کا انتظام ہوا۔مگر تین ماہ کراچی میں رہنے کے باوجود کوئی نوکری نہیں ملی اور رشتہ داروں نے انکی سخت حوصلہ شکنی کی۔وہ نیل و مرام واپس میرپور خاص آئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ سال سول سروس کے امتحان کی تیاری کی جائے وہ

بیحد ذہین تھے اور جنرل نالج کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا۔۔انکے پروفیسروں کی نظر میں انکی کامیابی یقینی تھی۔

اس اثنا میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ سلطان بھائی جان کی تنخواہ سے ہر ماہ پچاس روپئے قرضے میں اتارے جائینگے (بہتر ہے کہ میں یہیں لکھ دوں کہ میرے گھرانے کے ہر فرد کو اس بات پر فخر ہے کہ ہم نے ہر شخص کا پائی پائی کا قرض اتارا اور میرے گھرانے کی بے مثال ترقی میں سوائے خدا کے کسی کا ہم پر کوئی احسان نہیں)۔ایک سال کسی نہ کسی طرح کٹا مگر آئندہ سال اس سے بھی مشکل تھا۔

سلطان بھائی جان ایم اے کرنا چاہتے تھے مگر نوکریوں کے ساتھ گاڑی سے روز حیدر آباد جا کر ایم اے کرنا ناممکن تھا۔سندھ یونیورسٹی میں اس وقت پرائیویٹ ایم اے نہیں ہوتا تھا۔ادھر مئی ۱۹۵۸ میں ابّا کا لازمی ریٹائرمنٹ تھا کیونکہ اس زمانے میں ۵۵ سال کی عمر میں لازمی ریٹائر کر دیا جاتا تھا۔سب کو آنے والے وقت کا اندازہ تھا اور اسکے تصور ہی سے دل کانپتا تھا۔ریلوے سے نوٹس آنے لگے تھے کہ ریٹائرمنٹ کے تین ماہ بعد مکان خالی کرنا ہے۔ریٹائرمنٹ کے بعد ابّا کی آمدنی کا کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا جب جوانوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کو ملازمت نہیں مل رہی تھی تو میر پور خاص جیسے چھوٹے شہر میں ابّا کو کوئی ملازمت ملنی ناممکن تھی۔اگر ریلوے کے مکان سے نکال دئے گئے تو کوئی مکان نہیں تھا جہاں ہم پناہ لیتے۔ابّا دن بھر پلنگ پر بیٹھے آہیں بھرتے اور نہایت افسانوی انداز سے کہتے رہتے کہ ایک تاریک رات ہمارے گھر پر اپنا سایہ کرنے والی ہے۔اس دوران پوری پوری کوشش کی گئی اور ریلوے کو ہر قسم کی درخواستیں دی گئیں کہ ہمارے خاص قسم کے حالات کے پیش نظر ابّا کی ملازمت میں تین سال کی توسیع کی جائے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔آخر سلطان بھائی جان نے یہ تاریخی فیصلہ کیا کہ وہ سول سروس کے امتحان کو فراموش کر کے اسی ملازمت کو اختیار کرینگے جو ابّا کی تھی یعنی وہ گارڈ بنیں گے اس طرح انکی آمدنی بھی اچھی ہو جائیگی اور مکان بھی ہمارے پاس ہی رہیگا۔جس ماہ ابّا ریٹائر ہوئے اسی ماہ سلطان بھائی جان کو ریلوے میں گارڈ کی تقرری کا حکم نامہ مل گیا۔یہ سلطان بھائی جان کی زندگی کا اہم موڑ تھا کہ اسکے بعد انکا کیریئر دوبارہ اس راستے پر نہیں چڑھ سکا جس کے وہ صحیح حقدار تھے۔میری امّاں بڑے دکھ سے کہتی تھیں کہ گھر کی خاطر سلطان کا مستقبل برباد ہو گیا۔

تین مشکل ترین ماہ

مئی ۱۹۵۸ میں ابّا ریٹائر ہوئے۔اگرچہ انکو پنشن ملنی تھی مگر ہمارے بدعنوان نظام کی وجہ سے انکی کئی درخواستوں کے باوجود انہیں پنشن کی کوئی ادائیگی نہیں ہوئی۔دراصل درجنوں دفعہ ریلوے کے دفاتر میں دھکے کھانے کے باوجود انہیں کئی سال پنشن کی ایک پائی بھی نہیں ملی۔حقیقت میں انکو پنشن کی ادائیگی میرے امریکا آنے کے بہت سال بعد تک بھی نہیں ہوئی تھی۔اُس وقت ہمیں اِس پیسے کی ضرورت نہیں تھی اور میں ابّا سے کہتا تھا کہ اب اسے بھول جائیں کیوں اپنی جان ہلکان کرتے ہیں مگر میرے ابّا کہتے تھے یہ میرا جائز پیسہ ہے جس پر میرا حق ہے۔آخر کار ۱۹۷۵ یعنی سترہ سال بعد یہ پنشن اپنے کل بقایاجات کے ساتھ انکو ملی جس کے ایک ہی سال بعد انکا انتقال ہو گیا۔۔ہائے ریلوے نے کیسے انہیں اپنے جائز پیسے سے ترسایا۔

اسی ماہ سلطان بھائی جان گارڈ کی ٹریننگ کے لئے لاہور کے والٹن ٹریننگ اسکول چلے گئے۔اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ دونوں تنخواہوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔نہ ابّا کی پنشن تھی نہ ہی سلطان بھائی جان کی کلرکی کی کوئی تنخواہ۔انکو ٹریننگ کے زمانے میں بہت معمولی رقم صرف اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے ملتی تھی۔آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔جس طور کی زندگی ہم گذارتے تھے اس میں کسی قسم کے بنک بیلنس ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔جب تک سلطان بھائی جان واپس آ کر گارڈ کی نوکری پر نہ چڑھ جائیں گھر کے اخراجات کے لئے کوئی آمدنی نہیں تھی۔اس لحاظ سے ہمیں تین ماہ کے اخراجات کی ضرورت تھی۔ایک شام تو بہت ہی اداس اور باعث تشویش تھی اس دن تیز بارش بھی برس رہی تھی۔ہم سب اپنے ٹیرلیس میں بیٹھے تھے اور بارش کی کچھ ہلکی ہلکی پھواریں کبھی کبھی ہم پر بھی پڑ جاتی تھیں، آنے والی کل کی فکر ہر فرد کے ذہن پر سوار تھی، میں نے تڑپ کر امّاں سے پوچھا کل کیا ہوگا، میری والدہ نے اپنی ازلی پرامید فطرت کے سہارے جواب دیا اللہ غیب سے مدد کریگا۔

فرشتہ اور غیبی امداد

یوں تو میری زندگی میں کئی فرشتے آئے ہیں جنکا ذکر میں آنے والے ابواب میں کرونگا اور جن کو یاد کرتا ہوں تو ایک بار پھر انسانوں اور انسانیت پر اعتبار پختہ ہو جاتا ہے مگر پہلے یہ۔

میرے ماموں کی بیٹی بدر جہاں جنہیں ہم بیبا آپا کہتے تھے کی شادی احسان حسین علوی صاحب سے ہوئی تھی۔یہ لکھنؤ کے ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔پہلے ضلعی کمشنر کے عہدے پر فائز تھے اس کے بعد وہاں سے استعفیٰ دے کر اپنی قانون کی پریکٹس کرنے لگے تھے۔انکا دفتر ہمارے گھر کے پیچھے ہی تھا۔وہ بہت ہی مہذب اور با اخلاق انسان تھے۔وہ میری امّاں کے اخلاق، خوش زبانی، شعر و شاعری اور باغ و بہار فطرت کے بہت دلدادہ تھے اور کبھی کبھی ہمارے یہاں نکل آتے تھے۔اس کے علاوہ وہ ہم سب بہن بھائیوں کے تعلیمی معیار سے بھی بہت متاثر تھے اور ہمیشہ ہماری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ایسے موسم میں انکے آنے کی تو کوئی توقع نہ تھی مگر اس موسم میں انکی کار خراب ہو گئی تھی اور وہ کچھ وقت کاٹنے اور گرم گرم چائے کا پیالہ پینے ہمارے گھر نکل آئے تھے۔انہوں نے چائے پی، امّاں کے ہاتھ کا پان کھایا مجھ سے کچھ حالات حاضرہ پر تبادلہ خیالات کیا۔پھر اچانک کچھ تشویش سے میری امّاں سے پوچھنے لگے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، امّاں نے جھجک کی وجہ سے کہا نہیں ایسی

تو کوئی بات نہیں۔وہ کہنے لگے تین مہینے میں تو سلطان آ ہی جائینگے انشاءاللہ یہ وقت بھی گذر جائیگا۔دوسرے دن وہ آئے اور اپنے ساتھ سارے مہینے کا راشن لیکر آئے۔اسکے علاوہ انہوں نے میری والدہ کو تین ماہ کے اخراجات کے پیسے بھی دئے۔انہوں نے اس کو اسقدر راز میں رکھا کہ آج تک یہ کسی کو نہیں معلوم ہوا حتی کہ انہوں نے یہ اپنی بیوی جو ہماری ماموں زاد بہن تھیں انہیں بھی نہیں بتایا۔ سلطان بھائی جان کی ملازمت کے بعد خوش قسمتی سے ابّا کو بھی میر پور خاص کی ایک پرائیویٹ فرم میں کلرکی کی ملازمت مل گئی جس سے حالات تھوڑے بہتر ہو گئے اور امّاں نے انکا قرضہ بلا تاخیر شکریہ کے ساتھ اتارا۔

میرے ذہن میں انکی نیکی نے یہ اثر کیا کہ میں نے پلو میں یہ بات باندھ لی کہ مدد ایسی ہوتی ہے جو دوسرے کی ضرورت کا احساس کر کے کسی کے مانگے بغیر دی جائے اور اس طرح سے دی جائے کہ ایک ہاتھ دے تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ہم تو ویسے بھی انکی بہت عزت کرتے تھے مگر اسکے بعد تو میں انکی اور بھی عزت کرنے لگا۔

بس اس کے بعد سے ہمارے یہاں پھر دو تنخواہیں آنے لگیں اور ہم خوش حالی سے تو نہیں مگر اوسط درجے کے ساتھ رہنے لگے۔

لائبریریاں

اس دور کا میر پور خاص ان شہریوں کے لئے جن کو علم کا شوق تھا وافر مقدار میں ایسے وسیلے مہیا کرتا تھا جن سے انکی پیاس بجھ جائے۔شہر میں میونسپل کتاب گھر اور ریڈنگ روم تھا جہاں شام کے وقت باذوق افراد اخبار و مختلف جرائد پڑھنے جمع ہوتے تھے۔اس کے علاوہ یہاں کی لائبریری سے کتابیں مستعار لی جاسکتی تھیں۔میرے دوست اشفاق اور چندر اس کے باقاعدہ قاری تھے۔اسکے علاوہ ہمارے ریلوے کا کلب جسکو ''ریلوے انسٹیٹیوٹ'' کہتے تھے اپنی مثال آپ تھا۔ یہ سرخ پتھروں سے بنی انگریزی طرز تعمیر کی ایک خوبصورت عمارت تھی۔اس کے چہار طرف انتہائی دلآویز سرسبز لان تھے اور اسکے برآمدوں میں جگہ جگہ خوبصورت گملے رکھے رہتے تھے جن میں پام اور دوسرے خوبصورت پودے لگے تھے۔برآمدے کی مہرابوں پر بوگن ولا کی بیلیں چڑھیں تھیں اور شام کو ماحول میں ایک بھینی بھینی خوشبو پھیل جاتی تھی۔تھوڑے تھوڑے فاصلے پر میزوں پر شطرنج تاش اور دوسرے بورڈ گیمز کھیلنے کا بندوبست ہوتا تھا۔اندر بڑے ہال میں بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس کا انتظام تھا۔اسکے ساتھ اسکا مطالعہ کا کمرہ بہت وسیع اور متاثر کن تھا۔ لمبی لمبی میزوں پر انگریزی اور اردو کے تمام ہی مشہور اخبارات اور رسالے بکھرے ہوتے تھے۔اگرچہ بنیادی طور پر یہ کلب ریلوے ملازمین کے لئے تھا مگر ملازمین کے پاس تو وقت تھا نہیں اس لئے یہ ان ملازمین کے بچوں سے بھرا رہتا تھا۔اس میں بھی یہ خاص بات تھی کہ چونکہ یہ کلب ہمارے محلے سے دور تھا اور کھڈ رولائن کے محلے سے بالکل قریب تھا اس لئے اس میں اس محلے کے بچوں کی بہتات ہوتی تھی۔مگر میں اپنے ادبی ذوق کی وجہ سے باقاعدگی سے تقریباً ہر شام اس کلب میں جاتا تھا۔میں نے لیل و نہار، افکار، جائزہ، جام نو ، نیا دور، ٹائمز، نیشنل جیوگرافک، لائف اور تمام دوسرے معیاری اور مشہور جرائد سے آگاہی اسی کلب کی وجہ سے حاصل کی۔میں زیادہ وقت مطالعہ میں گذارتا تھا۔کبھی کبھی شطرنج اور ٹیبل ٹینس بھی کھیل لیا کرتا تھا مگر اس میں مجھے کوئی خاص مہارت حاصل نہ ہوسکی۔میرے دوست مہتاب سعید خان نے بہت کوشش کی کہ میں ٹیبل ٹینس میں شاٹ مارنا سیکھ جاؤں مگر میں اس میں بھی ناکام رہا۔ہاں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی کلب کی وجہ سے میرے ایک دوسرے دوست مشرف سے میری دوستی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی کیونکہ وہ ہر بار مجھ جیسے اناڑی سے شطرنج میں ہار جایا کرتا تھا اور پھر بار بار یہ کہہ کر کھیلتا تھا کہ اچھا ''اب کے آؤ۔'' وہ پھر ہار جاتا تھا۔اسکو اپنی ہار برداشت نہ تھی اور ہار کر وہ بہت ناخوش ہوتا تھا اور کئی منٹ مجھ سے بات نہیں کرتا تھا۔پھر میں نے اس سے ایک بار کہا اب ہم کبھی شطرنج نہیں کھیلیں گے۔ایک اور چیز جو اس کلب کی لائبریری میں قابل تعریف اور انوکھی تھی وہ یہ تھی کہ یہاں ہر مہینے پانچ کتابیں خریدی جاتی تھیں اور اس کے لئے قارئین سے کہا جاتا تھا کہ اگر وہ کوئی کتاب منگوانا چاہیں تو پرچی لکھ کر ڈبے میں ڈال دیں۔میں نے اس طرح کئی ناول اور کتابوں کی فرمائش کی اور انہیں پڑھ کر اپنے ذوق کی تسکین کی۔اس مرحلے پر خواجہ احمد علی گارڈ کا تذکرہ نہ کرنا انکے ساتھ ناانصافی ہوگی کیوں کہ وہ اس کلب کے سیکرٹری تھے اور یہ سب کچھ انکی سربراہی میں ہو رہا تھا وہ اعلی تعلیم یافتہ تھے اور ذاتی طور پر اس بات میں دلچسپی رکھتے تھے کہ محلے کے بچوں کو معیاری تفریحی اور صاف ستھرا ادب پڑھنے کا موقعہ فراہم کرنا چاہیئے۔بہت دکھ اور تقریباً آنسوؤں میں قلم ڈبو کر لکھ رہا ہوں کہ ۲۰۰۵ء میں میرا دوست مہتاب سعید خان جب تیس سال سعودی عرب میں رہ کر واپس پاکستان گیا تو میر پور خاص کی محبت میں وہ وہاں بھی گیا۔وہ اپنے ساتھ ویڈیو کیمرہ بھی لیکر گیا تھا۔اسکے اپنے الفاظ میں جب وہ واپس کراچی اپنے گھر آیا تو آنسوؤں سے زار و قطار رو رہا تھا۔اسکی بیٹی اور بیوی پریشان ہوگئیں۔ پھر اس نے اس کلب کی فلم دکھائی جو اب کھنڈر بن چکا ہے دروازے کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی ہیں، سبزہ زاروں کا کوئی نشان نہیں، بلڈنگ کو غیر آباد چھوڑ دیا گیا ہے جہاں آوارہ کتے گھوم رہے تھے۔اس نے یہ ویڈیو مجھے بھی بھیجا۔ مجھے بھی یہ دیکھ کر دکھ ہوا اور میرے ذہن میں سوال اٹھا۔۔ہم کہاں سے کہاں آ گئے؟

شہر میں مختلف انجمنوں اور سیاسی جماعتوں کے بھی ریڈنگ رومز تھے ان میں جماعت اسلامی کا ریڈنگ روم سب سے اچھا تھا۔غرض یہ کہ ایک صاف ستھرا اور معیاری علمی ماحول تھا جس سے ہر کوئی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔اس کے علاوہ ایک آنہ لائبریری کی کئی دکانیں تھیں میں نے حکیم احمد شجاع پاشا، دت بھارتی، گلشن نندا اور میرزا ادیب کی کئی کتابیں ایسی ہی ایک آنہ لائبریری سے پڑھیں۔ہم دوستوں کا یہ معمول تھا کہ کسی اچھی کتاب کو پڑھ کر دوسرے دوست کو اسے پڑھنے کی سفارش کرتے تھے اور پھر کسی شام فروٹ فارم کی لمبی سڑک پر

چہل قدمی کرتے اس پر تبصرہ وتنقید کرتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور پریم چند کی کتابوں پر میں نے اشفاق سے اور کرشن چندر کے افسانوں پر چندر نوتانی سے گھنٹوں تبادلہء خیالات کیا ہے۔ سب سے زیادہ جو کتاب ہماری گفتگو کا موضوع بنی وہ ''آگ کا دریا'' تھی کیونکہ وہ اسی زمانے میں اشاعت پذیر ہوئی تھی اور اخبارات میں تنقید واعتراضات کا نشانہ تھی۔ موجودہ دورِ پرآشوب میں، میں خود سے سوال کرتا ہوں کیا میرپور خاص یا پاکستان کے کسی شہر میں اب بھی یہ فضا قائم ہے؟؟ ہزاروں میل دور بیٹھ کر پاکستانی چینل دیکھتے ہوئے تو ایسا نہیں لگتا۔ کاش میں ایسا سوچنے میں غلط ہوں!!

میری منہ بولی بھابی

ہمارے پڑوس میں ایک نوجوان گارڈ غلام السبطین نقوی رہتے تھے۔ یہ نئے نئے لکھنؤ سے پاکستان آئے تھے اکیلے اور تنہا تھے۔ انکے والد لکھنؤ ہائی کورٹ کے وکیل تھے اور انکے کنبے کے کسی فرد کا پاکستان آنے کا پروگرام نہیں تھا یہ جوانی کے جوش اور پاکستان کی محبت میں اکیلے چلے آئے تھے۔ یہ آتے جاتے میری امّاں کو بہت مہذب انداز سے سلام کرتے اور انکی مزاج پرسی کرتے تھے۔ میری امّاں انہیں دعائیں دیکر اصرار سے پان کھلاتیں اور بالکل اپنے بچوں کی طرح ان سے محبت کرتی تھیں۔ دوچار دن سے وہ نظر نہیں آرہے تھے۔ امّاں کو تشویش ہوئی انکے گھر کو کئی کئی دفعہ کھٹکھٹانے کے بعد دروازہ کھلا معلوم ہوا کہ کئی دن سے شدید بخار میں مبتلا ہیں اور بھوک اور پیاس کی وجہ سے نڈھال ہیں میری امّاں انکو ہمارے یہاں لائیں بستر لگایا ڈاکٹر ڈراگو کے یہاں سے دوائیں لائیں اور کئی دن انکی تیمارداری اس طرح کی کہ بازو پر سر رکھ کر دوا پلاتی تھیں۔ جب وہ ٹھیک ہوکر اپنے گھر گئے تو میری امّاں کے گرویدہ ہوگئے۔ میری امّاں نے ان سے کہا کہ بیٹے شادی کرلو کوئی دیکھ ریکھ کرنے والا تو ہوگا یہاں کئی اچھے شیعہ گھرانوں میں میری جان پہچان ہے، کہنے لگے خالہ اس دفعہ لکھنؤ جاؤنگا تو شادی کرکے آؤنگا۔

جب واپس آئے تو انکے ساتھ انکی بیگم تو نہیں تھیں مگر وہ ایک تصویر ضرور لائے تھے جو انہوں نے یہ کہہ کر ہمیں دکھائی کہ یہ تمہاری بھابی ہیں۔ اس زمانے میں فٹ پاتھ پر ایکٹروں وایکٹریسوں کی تصویریں ایک ایک آنے میں ملا کرتی تھیں۔ ہم نے تصویر دیکھی تو وہ کسی خوبصورت ایکٹریس ہی کی لگتی تھی۔ ہمیں یقین نہیں آیا اور کئی دن تک گھر میں یہ چرچہ رہا کہ انکی شادی تو ہوئی نہیں مگر یہ شرمندگی سے بچنے کے لئے فٹ پاتھ سے ایک تصویر خرید لائے ہیں۔ کچھ ہی مہینے بعد وہ پھر ہندوستان گئے۔ اس بار جب وہ واپس آئے تو انکے ساتھ چمکیلے لیڈی ہیملٹن کے سیاہ برقعے میں انکی بیگم بھی ساتھ تھیں جو ہمارے یہاں ہی آکر اتریں اور انہوں نے ہماری امّاں سے انکا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ میری خالہ ہیں جنہوں نے یہاں مجھے میری اپنی ماں سے زیادہ پیار دیا ہے انہیں آداب کرو۔ اب ہم نے دیکھا کہ وہ تو یقیناً کسی ایکٹریس سے کہیں زیادہ خوبصورت تھیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک بہت ہی پیاری، مہذب اور محبت کرنے والی شخصیت تھیں۔ وہ میری بڑی بہن سلطانہ آپا سے کچھ ہی بڑی تھیں اس لئے وہ دونوں قریبی سہیلیاں بن گئیں۔ میں بہت چھوٹا تھا مگر نہ جانے کیوں اس چھوٹی عمر سے بھابی جیسے پیارے اور مقدس رشتہ کا پیاسا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ وہ دن کب آئیگا جب ہمارے گھر میں بھی ایک بھابی کی پائل کی چھم چھم اور چوڑیوں کی جھنکار سنائی دیگی مگر سلطان بھائی جان تو ابھی چھوٹے تھے اور انکی شادی کا دور دور کائی امکان نہیں تھا اس لئے میں تو فوراً ہی ان نئی اور منہ بولی بھابی کا گرویدہ ہوگیا اور دن میں کئی دفعہ بہانیں بہانیں انہیں دیکھنے انکے گھر جاتا تھا۔

میری زندگی میں جن چند لوگوں نے انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے ان میں میری یہ منہ بولی بھابی بہت بلندی پر فائز ہیں۔ اس لمحے سے جب میں ان سے متعارف ہوا اس وقت تک جب کہ میں میڈیکل کالج سے اپنی تعلیم مکمل کر کے میرپور خاص چھوڑ کر کراچی منتقل نہ ہوگیا انہوں نے مجھے جس قدر محبت دی، جتنا میرا اخلاقی ساتھ دیا، جتنا مجھے میرے مشکل اوقات میں سہارا دیا اور جیسے جیسے میرے نخرے اٹھائے اسکا قرض میں کبھی بھی ادا نہیں کرسکتا۔ ان سے ایک ایسا لازوال، پاکیزہ، محبت سے پُر اور اپنائیت کا رشتہ قائم ہوگیا جسکو میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔ وہ میری ماں تھیں، میری بہن تھیں، میری بھابی تھیں میری دوست تھیں اور ہر اچھے اور برے وقت میں میری ساتھی تھیں۔ میں گھنٹوں ان کے ساتھ بیٹھ کر نہ جانے کتنی لمبی لمبی اور کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا تھا۔ میری لا یعنی بکواس کو وہ بہت توجہ اور پیار سے سنتی تھیں اور میرا سہارا بنتی تھیں۔ انہیں بھی میری طرح اردو ادب سے دلچسپی تھی، یہ انکی ضرورت بھی تھی کیونکہ بہت عرصے تک انکی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور انکے شوہر اپنی ریلوے کی ملازمت کی وجہ سے دوروں پر رہتے تھے۔ انکے پاس تنہائی میں وقت گذاری کے لئے اردو کی اچھی کتابیں اور ناول پڑھنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا کیونکہ اس زمانے میں ٹیلی وژن تھا نہیں اور صرف چند ہی گھرانوں میں ریڈیو تھا۔ ہمارے اپنے گھر میں ریڈیو ۱۹۵۷ء میں آیا پھر انکے یہاں بجلی بھی نہیں تھی اس لئے انکے یہاں ریڈیو بھی نہیں تھا۔ اس لئے ریلوے کلب کی لائبریری سے اپنی کتابوں کے ساتھ ساتھ میں انکے لئے بھی کتابیں لاتا تھا انہیں عظیم بیگ چغتائی بہت پسند تھا۔ جب سردیوں کی شاموں میں سورج جلد غروب ہوجاتا اور میرپور خاص میں کہر چھانے لگتا تو وہ انگیٹھی میں کوئلے دہکا دیتیں اور کبھی میں انکو اور کبھی وہ مجھے عظیم بیگ چغتائی کی کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتے تھے جس پر ہم بہت ہنستے تھے۔ ''شریر بیوی'' ''کولتار'' اور ''خانم'' میں نے انہی کے ساتھ پڑھیں۔ وہ ہندوستان میں اپنا بھرا پُرا گھر چھوڑ کر آئی تھیں اور انہیں وہ سب یاد آتے تھے، انہیں ایک چھوٹے بھائی کی ضرورت تھی اور میں نے وہ کمی پوری کردی تھی۔ انکا دوسرا شوق سوئٹر بننا تھا وہ غضب کے سوئٹر بنتی تھیں جب میں چھٹی جماعت میں تھا تو انہوں نے میرے لئے ایک بہت خوبصورت سوئٹر بن کر دیا تھا۔

۱۹۷۰ء میں امریکا آنے کے بعد وقتی طور پر میرا ان سے رابطہ ٹوٹ گیا مگر پھر ۱۹۷۴ء میں جب میں واپس پاکستان گیا تو میں نے انہیں تلاش کیا۔ وہ اور سبطین نقوی صاحب اب کراچی آ کر شاہ فیصل کالونی میں رہ رہے تھے۔ میں کئی دفعہ انکی قدم بوسی کے لئے ان سے ملنے گیا۔ پھر کئی سال ان سے ملاقات نہ ہوسکی مگر جب میں آغا خان ہسپتال میں ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۸۷ء میں کراچی جا کر رہنے لگا تو میں پابندی سے ان سے ملنے شاہ فیصل کالونی جاتا تھا۔ اس وقت میری شادی ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی اہلیہ سے انکی بہت تعریف کی تھی اور شخصیت کے علاوہ انکے حسن کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ جب ہم ان سے ملنے گئے تو واپس آتے ہوئے میری بیگم شائستہ نے کہا آپ کی افسانہ نویسی نے آپکو بات بڑھانے کی عادت ڈال دی ہے۔ یہ تو بالکل ویسی نہیں جیسی آپ نے انکی تصویر کھینچی تھی۔۔۔۔ تھا بھی صحیح، وہ اب پینسٹھ سال کی تھیں، بیماریوں نے انہیں کھنڈر بنا دیا تھا۔ وہ بڑی بڑی انتہائی پرکشش آنکھیں اب چہرے کے ڈھانچے میں خوفناک لگتی تھیں، ہاتھوں پر جھرّیاں تھیں اور وہ تابناک اور بیحد دلآویز چمپئی رنگ جھلس کرتانبے جیسا ہو گیا تھا، یہ سن کر مجھے بیحد افسوس ہوا، اس پر مشتاق احمد یوسفی کی کتاب شاید ''زرگذشت'' کا ایک جملہ یاد آتا ہے کہ جب وہ اپنے ایک دوست خان صاحب سے سالوں بعد ملنے گئے جو جوانی میں مردانہ وجاہت کا شاہکار تھے تو انکی حالت دیکھ کر یوسفی صاحب نے لکھا ہے'' وقت نے کیسی کیسی شاندار عمارتیں ڈھائی ہیں''۔ بہرحال میرے دل میں انکی محبت اور عظمت وہی ہے جو روز اول تھی۔ جب میں ۱۹۹۰ء میں واپس امریکا آیا تو اسکے بعد ان سے رابطہ ایسا ٹوٹا کہ پھر میں کوشش کے باوجود انکو تلاش نہ کر سکا۔ اگر وہ زندہ ہیں تو اللہ انکو صحت اور زندگی عطا کرے اور اگر وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو چکی ہیں تو اللہ تعالی انکا مرتبہ بلند کرے۔

دنیا کی سیاحت کا شوق

یوں تو بقول مرزا غالب

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

مگر یہاں میں اپنی اس خواہش کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو میرے دل میں اس شدت سے سلگ رہی تھی کہ میں اس کے لئے دیوانگی کی حد تک سنجیدہ تھا اور وہ تھی دنیا دیکھنے کی خواہش، دیس دیس گھومنے کی تمنا۔ میں اس میں اس حد تک پاگل تھا کہ میں یہ کہا کرتا تھا کہ اگر اللہ نے مجھے اپنی یہ خواہش پوری کرنے کا موقعہ نہ دیا تو جب قیامت کے دن اٹھایا جاؤنگا تو میرے دل پہ ایک داغ ہوگا جو اس خواہش ناتمام کی وجہ سے ہوگا کہ میں اللہ کی بنائی اس دنیا کا نظارہ خود اپنی آنکھوں سے نہ کر سکا۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ بچپن سے میرے کان اپنی بڑی بہن اور بھائی سے دنیا کے مختلف شہروں، جنگلوں، دریاؤں، سمندروں اور جزیروں کا تذکرہ اتنی دفعہ سن چکے تھے اور وہ ان جگہوں کی ایسی دلفریب منظر کشی کرتے تھے کہ میں انکو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو گیا تھا۔ انکو بھی سیاحت کا شوق تھا مگر اپنی مالی ومعاشی حالت دیکھتے ہوئے انہوں نے شاید ذہنی طور پر یہ قبول کر لیا تھا کہ حقیقی سیاحت انکے لئے ممکن نہیں مگر میں کسی وجہ سے یہ قبول کرنے کو تیار نہیں تھا اور اس چکور کی مانند جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ چاند اسکی دسترس میں نہیں اسکی جانب اس وقت تک پرواز کرتی رہتی ہے جب تک اسکے پر ٹوٹ کر نہ گر جائیں، یہ سوچے بیٹھا تھا کہ میں ضرور دنیا دیکھ کر مروں گا۔ سویڈن کے سیاہ سے ملاقات کے بعد کہ وہ سائیکل پر دنیا دیکھنے نکلا تھا میں بھی اپنی انہی بھابی سے یہی کہا کرتا تھا کہ اگر اور کچھ نہیں تو میں سائیکل پر پوٹلی باندھ کر گھر سے نکل پڑونگا۔ ذہن اتنا معصوم تھا کہ اور کسی مشکل کے بارے میں سوچتا ہی نہیں تھا۔

مگر میرے مالی حالات تو اس قدر خراب تھے کہ دنیا تو دور میں تو اپنا ملک پاکستان ہی نہیں دیکھ پایا تھا۔ ہم جب ساتویں جماعت میں تھے تو ہمارے اسکول نے شمالی علاقوں، جن میں تمام ہل اسٹیشن شامل تھے کا تفریحی اور تعلیمی دورے کا پروگرام بنایا۔ اس میں ہماری کلاس سے انصار موٹو اور اشفاق بیگ بھی شامل ہو گئے مگر اس کے اخراجات ایک سو پچاس روپے تھے۔ میں دل مسوس کر رہ گیا مگر اس میں شامل نہ ہو سکا واپسی پر اشفاق نے مجھے وہاں کی تصویریں دکھائیں۔ خاص طور سے سیدو شریف سوات کی کئی تصویریں تھیں۔ میں یہ دیکھ کر بہت للچایا پر صبر کر لیا۔ مگر اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ ہوا کہ میرا دل تڑپ کر رہ گیا اور اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا۔ ہمارے گھر میں لندن کا بڑے رومانوی انداز سے تذکرہ ہوتا تھا کہ کس طرح دریائے ٹیمز کی لہریں پارلیمنٹ کی دیواروں سے ٹکراتی ہیں اور کیسے سنیچر کی رات پکاڈلی سرکس میں قیامت خیز رونق ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میرے کنبے کے کئی لوگ تعلیم کے لئے انگلینڈ سے پڑھ کر آئے تھے اور انہوں نے وہاں کے خوب خوب نقشے کھینچے تھے۔ اس وجہ سے میں عام طور سے لندن کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ہماری کلاس میں ایک لڑکا تنویر تھا وہ سول سرجن کا بیٹا تھا۔ پڑھائی میں تو بالکل معمولی تھا مگر اسکاؤٹ میں شامل تھا۔ اس نے بتایا کہ اسکاؤٹ کا ایک گروپ لندن جا رہا ہے اور وہ اس میں شامل ہے۔ وہ اس کے لئے منتخب نہیں ہوا تھا بس یہ تو پیسے کا کھیل تھا جن کے ماں باپ اس خرچے کے متحمل ہو سکتے ہیں وہ جا سکتے تھے۔ وہ دو ہفتوں کے لئے غائب ہو گیا اور جب واپس آیا تو اس کے پاس لندن کی تصویروں کے بہت سے کارڈ اور ایک موٹی سی لندن کی با تصویر رنگین کتاب تھی۔ اسنے لندن میں زیر زمین ''ٹیوب'' میں اپنے سفر کی خوب خوب داستانیں سنائیں۔ میں پہلی دفعہ اس بات پر دکھی ہوا کہ میں ایک بیحد غریب گھرانے میں پیدا ہوا ہوں اور اس لئے ایسی بہت سی چیزوں سے محروم ہوں جو دوسرے بچوں کو حاصل ہیں۔ بہرحال اس واقعہ کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ میں نے اس سے لندن کی باتصویر کتاب حاصل کی جس میں شہر کی اہم جگہیں تھیں اور بڑی حد تک وہاں کا نقشہ بھی شامل تھا۔ میں نے کئی ماہ اسے صبح شام پڑھا اس وقت تو اس کا مقصد صرف اپنی پیاس بجھانا تھی مگر میں جب کچھ مہینے بعد کراچی گیا تو نہ جانے مجھے کیا سوجھی کہ میں نے

''چہارسُو''

وہاں بچوں سے کہا میں تو دو ہفتے لندن رہ کر آیا ہوں میں نے کہا کہ لندن کا ٹکٹ میں نے ایک تقریری مقابلے میں جیتا تھا۔ پھر نہ صرف بچوں کے سامنے بلکہ بزرگوں کے سامنے بھی جو خود لندن رہ کر آئے تھے اپنی لفاظی سے اور یہ بیان کر کے کہ جب فلاں جگہ سے مڑ کر فلاں جگہ جائیں تو یہ مشہور چوک یا پل آتا ہے یہ ثابت کر دیا کہ واقعی میں لندن ہو آیا ہوں۔ سب لوگوں کو یقین آ گیا اور میری بڑی پذیرائی ہوئی۔ کئی ماہ بعد میں نے لوگوں کو یہ بتایا کہ میں تو صرف مزاق کر رہا تھا ورنہ کہاں میں، میر پور خاص کا ایک خاک نشین لڑکا اور کہاں لندن۔۔

شاید اللہ کو میری ہر خواہش بدرجہ اتم پوری کرنی تھی۔ ایک وقت وہ آیا کہ میں نے ذاتی طور پر اور بعد میں اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ ایسی ایسی جگہوں کی سیاحت کی اور اتنی دفعہ کی کہ میرے بچے پریشان ہو گئے۔ ان میں دنیا کے سیاحت کے لحاظ سے مشہور مقامات تو ہیں ہی مگر اس کے ساتھ ہی کئی انوکھی (EXOTIC) جگہیں بھی شامل ہیں۔ آج بھی یہ پیاس نہیں بجھی ہے اور جیسے ہی موقعہ ملتا ہے میں کسی نئی جگہ کو دیکھنے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ شاید اللہ تعالی تک میری پکار پہنچ گئی تھی اور اس نے مجھے یہ موقعہ نہیں دیا کہ میں اسے اپنے سینے کا داغ دکھا سکتا۔ نہ صرف یہ بلکہ میری بہن اپنے مرتبے اور سماجی حیثیت کی بنا پر کئی دفعہ یورپ، امریکا، ہندوستان اور سنگاپور کی سیاحت پر نکلیں۔ آج سے چھبیس سال پہلے جب وہ امریکا آئیں تو انہوں نے کہا کہ بچپن سے انکا یہ خواب ہے کہ وہ بحرالکاہل کے پانی میں اپنے پیر ڈبوئیں اور غروب آفتاب کا منظر دیکھیں۔ میں انکو نیو پورٹ بیچ لے گیا، شام کا جھٹپٹا تھا، دونوں وقت مل رہے تھے، سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں سورج کا نارنجی تھال آدھا پانی میں ڈوب چکا تھا جب انہوں نے اپنے سینڈل اتار کر پانی میں قدم رکھے۔ ہر طرف ایک جادوئی ماحول تھا وہ اس قدر متاثر ہوئیں کہ احساس جذبات سے مغلوب ہو کر با آواز سورۃ رحمٰن پڑھ نے لگیں۔ یہ واقعہ میرے ذہن سے نہیں مٹتا۔۔ اللہ انکو جنت نصیب کرے۔ آمین۔ اس سے کچھ سال پہلے میں نے اپنے بڑے بھائی کو پوری دنیا کی سیاحت کروائی تھی۔ اس لحاظ سے میرے ابّا کا گھرانا بڑا خوش نصیب رہا کہ انکے بچوں کی سیاحت کی خواہش پوری ہوئی۔

بقیہ: احساس کی میل

اُس نے اپنے پھٹے ہوئے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ سلمٰی کی طرف بڑھا دیا۔ سلمٰی نے پوچھا۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ بولا۔

''بی بی جی آپ کے گھر سے جو کپڑے پچھلی دفعہ لے کر گیا تھا اُس میں بڑے صاحب کی ایک پینٹ بھی تھی اس کی جیب سے یہ نوٹ نکلے تھے اُس دن پریشانی کی وجہ سے واپس کرنا بھول گیا تھا آپ گن لیجئے پورے تو ہیں نا''۔

سلمٰی نے لفافہ کھولا تو سو سو ڈالر کے کئی نوٹ اُس کے ہاتھوں میں کانپ رہے تھے اُس نے دھوبی کی طرف دیکھا اور بولی۔

''تمہیں پیسوں کی اتنی ضرورت تھی اور تم نے یہ پیسے سنبھال کر رکھے اور مجھے واپس بھی کر دیئے مجھے تو ان کا علم بھی نہ تھا اگر تم یہ خرچ بھی کر لیتے تو مجھے ہرگز پتہ نہ چلتا''۔

دھوبی نے اُسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''بی بی جی! ہم لوگوں کا میل دھوتے ہیں پر اُسے اپنے پاس نہیں رکھتے''۔

☆

بقیہ: قصّہ البم کا

سوار ہے۔ مگر اس البم میں چپکی ہوئی میرے بزرگوں کی تصویریں جن سے منتشر ہوتی ہوئی روشن شعاعیں مجھے اپنے ان ارادوں پر عمل کرنے سے روک رہی ہیں۔ جن کی ایک تاریخ ہے، ایک یادگار ماضی ہے، اسی ماضی کی بات ہے کہ ایک دن ڈوبتے ہوئے سورج نے کہا۔ اس دنیا میں کون ہے جو میرے بعد اس تاریکی سے لڑے اور چاروں طرف روشنی بکھیر دے، بہت دیر تک سناٹا رہا، آخر کار ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ آگے بڑھا اور اس نے سورج سے وعدہ کیا کہ اپنی بساط بھر کوشش کرے گا اور اسی بساط کے نتیجے میں البم کی تمام تصویروں نے یکے بعد دیگرے چراغ میں تیل کے بجائے اپنا اپنا خون دیا۔ اس لیے کہ یہ عجیب ساخت کا چراغ تھا۔ جس میں بجائے تیل کے خون ہی جلا کرتا تھا۔ اسی طرح چراغ بہت دنوں تک روشن رہا۔ اس چراغ کی روشنی سے تاریخ کے کئی ابواب روشن ہو گئے اور ساٹھ سال گذر گئے مگر آج ان تمام تصویروں پر خون کے دھبے، خون کی بے شمار چھینٹیں نوحہ کناں ہیں.....اور میں بڑی شدت سے سوچ رہا ہوں کہ ان پرانی بوسیدہ تصویروں سے نکلتی ہوئی تیز شعاعیں میری آنکھوں کو تو روشنی بخشتی رہی ہیں مگر کیا ان میں اتنی قوت بھی نہیں تھی کہ ان خون کے دھبّے لگانے والوں سے اتنا ہی پوچھ سکتیں کہ میرے خون کی قیمت کیا یہی ہے کہ تم لوگ میری تصویروں کو دغدار کر دو، لیکن.....!!!

☆

جگت استاد

پروفیسر انوار احمد زئی
(کراچی)

اپنے شہر سے، خونی رشتوں سے، اپنوں سے، گھر والوں سے دور دیارِ غیر میں غیروں، بیگانوں کے بیچ ہوٹل کے ایک کمرے میں زندگی گزار دینے والے اور ایک اجنبی شہر کے ہوٹل میں دم دے دینے والے استاد اختر انصاری اکبر آبادی عجب تضادات کا مجموعہ تھے۔ اجتماع ضدین کے حامل اس شخص کی پر اسراریت بھی عجیب تھی اور ظاہری شخصیت سے کچھ سمجھ میں آجانے والی صفات بھی عجیب۔۔۔۔

یہ جگت استاد تھے۔۔۔ استاد ان کے نام کا ایسا حصہ بن گیا تھا جس کے بغیر انہیں پہچاننا بھی مشکل تھا، صرف اختر انصاری کہیں تو ذہن منفرد نقاد پروفیسر اختر انصاری دہلوی کی جانب چلا جاتا تھا اس لئے استاد جب اپنا تعارف کراتے تو اختر انصاری پر زور کم اور اکبر آبادی پر زیادہ ہوتا تھا اور توقع کرتے تھے کہ لوگ استاد کا سابقہ لگا کر انہیں مخاطب کریں تاکہ وہ پروفیسر کے سابقے سے بچ بچا کر اپنا حوالہ خود بن سکیں۔ شاید ان کے نام کی طوالت ہی کے باعث کسی نے پھبتی کسی تھی کہ

کیا چیز ترے نام میں بنیادی ہے
اختر ہے کہ انصاری ہے اکبر ہے کہ آبادی ہے

گندمی رنگ، موٹی اور نمایاں ناک، بڑی بڑی آنکھیں، موٹے سے ہونٹ، گول چہرہ، ریڈیائی آواز، دراز قامت، فربہ جسم اور ڈھیلا ڈھالا لباس، کبھی بشرٹ اور پینٹ میں اور کبھی کبھی شلوار قمیض میں، گولڈ لیف کی سگریٹ ایک ہاتھ میں دوسرے میں کوئی کتاب، رسالہ یا لفافہ۔۔۔ ان سب کو ملائیں تو استاد کی تصویر بنتی ہے۔۔۔!!

گاڑی کھاتے میں، قاضی عبدالقیوم روڈ پر غزنوی ہوٹل کی نچلی منزل پر ایک خوابیدہ سا کمرہ، سیل زدہ تاریک سا، جس کے چاروں طرف بے ترتیب کتابوں سے لدی الماریاں، بیچ میں ایک بیڈ، سامنے دو صوفے، ان کے درمیان چائے کی پیالیوں کے ان مٹ نشانات سے آراستہ ایک میز اور باقی بچی زمین پر بکھرے سگریٹ کے ٹوٹے۔۔۔ یہ استاد کی کائنات تھی۔۔۔ ایک دن میں ایک بار جب ہوٹل کا ملازم کمرہ صاف کر جاتا تو بہت دیر تک آراستہ کمرہ استاد کو اجنبی لگتا، سو وہ جلدی جلدی بہت سی ادھ جلی سگریٹیں پی کر اور ان کے ٹوٹے چاروں طرف پھینک کر کمرے کو اپنا سا بنا لیتے اور ''ہوم لی'' فیل کرنے لگتے۔

ہم کالج میں پڑھتے تھے، میرا پہلا افسانہ ''فراز'' بیسویں صدی دہلی میں چھپ چکا تھا تو ریڈیو پر الیاس عشقی کے کمرے میں استاد سے سلام دعا ہوئی تھی، استاد اس وقت ساٹھ کے پیٹے میں رہے ہوں گے مگر مضمحل چہرے پر عزم کی نشانیاں آسانی سے دیکھی جاسکتی تھیں۔ پہلے تم ہم سمجھے تھے کہ استاد کی بے گھری کا سبب آزادی کے وقت خاندان کا کٹ جانا ہوگا جیسے کہ ہمارے ایک حقیقی استاد پروفیسر شبیر احمد مرحوم کے ساتھ معاملہ رہا تھا، تقسیم کے وقت ان کے بیوی بچے شہید کر دیئے گئے تھے۔ وہ تاریخ کے پروفیسر تھے اور شعبۂ تعلیم سندھ یونیورسٹی میں بیچلر کوارٹر میں رہا کرتے تھے۔ مگر استاد کے ذیل میں معلوم ہوا کہ ان کا گھر کراچی میں ہے جہاں ان کی بیوی بچے رہتے ہیں، مگر استاد وہاں نہیں جاتے بلکہ ان کا تذکرہ بھی سننا پسند نہیں کرتے۔ کسی تقریب، تہوار اور عید بقرعید پر یہ سوچ کر کہ استاد کو شاید گھر یاد آرہا ہو، ہم یا کوئی اور گھر سے کھانا لے آتا کہ استاد کے منہ اور مزاج دونوں کا مزا بدل جائے گا مگر ایسے میں افسوس ضرور ہوتا کہ گھر بار ہوتے ہوئے بھی استاد ان سے الگ رہتے تھے۔ ایک آدھ بار ہم نے شکوہ بھی کیا اور اسے ان کی جانب سے گھر کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہونے کی کمزوری بھی کہا، مگر استاد طرح دے گئے۔ انہیں یہ ذکر نہ صرف یہ کہ مرغوب نہ تھا بلکہ مطلوب بھی نہ تھا۔ ہم انہیں اس حوالے سے سخت دل، کٹھور بلکہ بے رحم اور ظالم ہی سمجھا کئے۔ مگر استاد کے انتقال کے بعد ان کے ایک یار دیرینہ اور جوانی بلکہ بچپن کے ساتھی ندرت میر ٹھی نے خود ہمیں بتایا کہ استاد کے گھر سے دور رہنے کا سبب ان کی جانب سے ظالمانہ طرزِ عمل نہیں ہے بلکہ اس تعلق سے وہ بے حد مظلوم، محروم اور مجبور ہیں اور یہ کہ ندرت مرحوم نے اشارۃً اس راز سے پردہ اٹھایا تھا جو اب بھی راز رہے تو مناسب ہے، لیکن یہ جاننے کے بعد ہمیں اس بات کا ملال ہی رہا کہ یہ بات ان کی زندگی میں کیوں معلوم نہ ہوئی ورنہ ہم وقفے وقفے سے جو جملے کہتے تھے وہ کبھی نہ کہتے۔۔۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ ہمارے ذہن میں استاد کا وقار اور مرتبہ اور بلند ہوگیا۔

استاد کا وطیرہ تھا کہ وہ اپنے کمرے میں آنے والے کو چائے ضرور پلاتے تھے۔ استاد کے اس کمرے کا تذکرہ تو اب ادبی تاریخ کا یوں بھی بے ادب حصہ بن چکا ہے کہ ساقی فاروقی نے اپنی کتاب ''پاپ بیتی'' میں اس کمرے کے ناجائز استعمال کا ذکر اپنی روایتی بے خوفی بلکہ بے حجابی سے کیا ہے اور اس میں ان خاتون کا حوالہ بھی دیدیا ہے جو دیگر حوالوں سے بھی معروف رہی ہیں اور اپنی اس حکایتِ آسودگی کا گواہ بھی بنایا ہے تو حیدر آبادہی کے ایک معروف مترنم شاعر کو جن کی جانب سے تا حال کوئی وضاحت ہمارے نظر سے نہیں گزری جبکہ ان کی شناخت وضاحتوں کے دفاتر سے بھی رہی ہے۔

نئی قدریں۔۔۔ استاد کی پہچان ہے۔ وادیٔ مہران کا واحد ادبی پرچہ جو نہایت پابندی سے برسوں جاری رہا، استاد کا حوالہ بھی ہے اور اثاثہ بھی۔۔۔ عام نمبروں کے علاوہ بہت سے خاص نمبر اس کا تخصص ہیں۔ اس میں

چھپنے والے اشتہارات اس پرچے کو بھی چلاتے تھے اور استاد کو بھی۔ استاد کے تعلقات غیر معمولی افراد اور شخصیات، ادباء اور شعراء، نقادانِ ادب و استادانِ آگہی سے بہت گہرے، قریبی اور غیر معمولی تھے، ان میں غیر ادبی مگر ادب دوست سیاستداں بھی شامل تھے۔ ان کے ذریعے استاد کے پرچے کو اشتہار ملتے تھے اور یوں استاد دنیا بھر سے ملنے کے قابل ہو جاتے تھے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ استاد اس پرچے کے بلا شرکت غیرے ایڈیٹر ہونے کے باوجود اس کی نسبت سے واجبی سا رشتہ رکھتے تھے۔ اس پرچے کا اداریہ ''حرفے چند'' کے زیر عنوان چھپتا تھا، جسے کبھی کبھی استاد خود بھی لکھ لیا کرتے تھے۔ استاد کا معمول یہ تھا کہ ڈاک سے کوئی تحریر موصول ہوئی، افسانہ، ڈراما، مضمون، غزل، نظم یا کوئی تبصرہ تو وہ اسے کھولتے، اچٹتی سی نظر ڈالتے اور کاغذ کا رول بنا کر چاروں طرف الماریوں میں رکھی کتابوں کے بیچ میں ٹھونس دیتے، ان کے اس مسلسل عمل سے کتابوں نے کاغذوں کے ان رولز کو سمانے کے لیے خود ہی سمٹ کر جگہ بنا دی تھی۔ استاد کاتب کا انتظار کرتے، جب چراغ الٰہ آبادی یا ان کے چھوٹے بھائی حافظ صابرین ذوقی آتے تو دونوں بے حد عمدہ خط کے مالک اور ماہر بھی تھے اور شاعر بھی، تو وہ خود ان رولز کو ہاتھ لگائے بغیر اشارہ کرتے ہوئے ان سے کہتے کہ وہ فلاں فلاں رولز نکال لیں اور کتابت کے لئے لے جائیں۔ جب کتابت شدہ مسطر آ جاتے تو پھر ایک نئے رول کی صورت ہوتے۔ استاد انہیں بھی ہاتھ لگائے بغیر کسی اور الماری کی کسی اور جگہ کی طرف رکھ دینے کو کہتے۔ جب یہ کام ہو جاتا تو وہ ہم جیسے ''عقیدت مندوں'' میں سے کسی کا انتظار کرتے۔ جب ہم پہنچتے اور صرف چائے سے ہماری تواضع ہوتی تو ہم سمجھ لیتے کہ آج ''بے گار'' نہیں ہے مگر جب وہ گھنٹی بجا کر چائے کے ساتھ پکوڑے لانے کا آرڈر دیتے تو ہم سمجھ لیتے کہ آج مسودات کی پروف ریڈنگ کرنا ہوگی۔ ہم، قاصد، عزیز، قدیر غوثی، کاظم رضا یا کوئی اور یہ فریضہ انجام دیتا اور اس کے بعد ان کتابت سے آراستہ مسطروں کو پھر رول کا روپ دے کر ان کتابوں کے بیچ ٹھونس دیا جاتا۔ پریس والا آتا اور ان تصحیح شدہ کاغذوں کو لے جا کر سعید آرٹ پریس دے آتا۔۔۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

استاد کے اس ''مدیرانہ اصول'' کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر کریم الدین احمد نے ایک بار ایک مضمون ایسا لکھ ڈالا جس میں خود استاد اختر انصاری اکبر آبادی کی خامیاں اور برائیاں تحریر تھیں، مگر استاد نے ان کے مضمون کے رول کو دیکھنے کی زحمت حسب معمول گوارا نہ فرمائی اور وہ سب مراحل سے گزرتا ہوا رسالہ بن گیا۔۔۔ اور جب چھپ گیا تو ایک مقتدر قاری نے استاد کی توجہ اس کی جانب مبذول کرائی مگر اب تک دیر ہو چکی تھی تاہم استاد نے ڈاکٹر کریم الدین احمد سے زندگی بھر قطع تعلق رکھا، جسے کریم الدین احمد اپنی دُہری فتح قرار دیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو وہ لکھنا چاہتے تھے لکھ بھی گئے اور ثابت بھی کر گئے کہ استاد برائے نام مدیر تھے جیسے کہ ان کے بقول وہ شاعر تھے۔

استاد کی شاعری کے ضمن مین بھی بڑے قصے ہیں۔ کبھی ان کہی کی صورت لوگ استاد کی شاعری کو رنگا رنگ شاعری قرار دیتے تھے۔ اس ضمن میں قدیر غوثی کا جملہ بڑا توانا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ استاد اختر انصاری اکبر آبادی کے رنگ میں تمام اساتذہ شاعری کر گئے ہیں۔ تاہم استاد کی جو شاعری ہے جو ان کے نام سے موسوم، منسوب ہے اور ان ہی کے نام سے اشاعت پذیر ہوئی ہے اسے شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کا جرم یا غلطی تو کی جا سکتی ہے مگر جب تک شبہ یقین میں نہ بدل جائے اور ایسا ممکن بھی نہیں ہے تو ان کی شاعری کو ان ہی کی شاعری سمجھنا انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوگا اور ایسا کرتے ہوئے ماننا پڑے گا کہ استاد کے یہاں جدت کے ساتھ روایت کی پاسداری موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ عموماً طرحی مشاعرے پڑھنے سے اجتناب برتتے تھے۔

استاد کے چھوٹے سے کمرے میں بڑے بڑے لوگ آیا کرتے تھے جن میں مقامی اکابرین کے علاوہ ہر وہ معروف قلمکار جو حیدر آباد یا تر اپر آتا ان سے ضرور ملتا تھا۔ مقامی افراد میں مرزا عابد عباس، ڈاکٹر الیاس عشقی، علی مظہر رضوی، اشتیاق اظہر، حمایت علی شاعر، قابل اجمیری، برگ یوسفی، صابر وسیم، دروا سعدی، نظام فتح پوری، شبیر نجمی، جبریل صدیقی، حضور احمد سلیم، سید قوی احمد بنیش سلیمی سب ہی شامل تھے۔ استاد ماہانہ نشستیں کراتے تھے اور جب کوئی قلمکار بیرون شہر سے حیدر آباد آتا تو اس کے ساتھ شام یا کوئی تقریب ضرور منعقد کرتے۔ البتہ انہیں محسن بھوپالی سے خدا واسطے کا بیر تھا، وہ ان کی شاعری کے قائل نہ تھے بلکہ ان کے مجموعے ''جستہ جستہ'' کے لئے فرماتے تھے کہ یہ ادھر اُدھر سے ہے یعنی جستہ جستہ!!۔۔۔ اس طرح ان کا ذاتی نوعیت کا شدید اختلاف سید کاظم رضا سے ہو گیا تھا جسے موصوف نے مرتے دم تک یاد رکھا اور جسے مستحکم اور مضبوط بنانے میں کاظم رضا نے بھی مقدور بھر کوشش جاری رکھی اور یوں ان کے درمیان کی رنجش دونوں ہی کے ساتھ گئی۔ لوگوں کا گمان ہے کہ اس آگ کو لگانے میں نہ سہی، بھڑکانے اور بھڑکتے رہنے میں تھوڑا بہت حصہ احمد ضیا کا ضرور ہے۔ احمد ضیا کے شعری مجموعے ''ہوا کی تحریر'' کو بھی استاد بس ہوا کی تحریر ہی سمجھتے تھے۔ سو ان دونوں نوجوانوں کے باعث استاد کے خلاف اس وقت کے نئے لکھنے والوں کا ایک دھڑا سا تیار ہو گیا تھا۔ جس نے استاد کو پریشان رکھا اور جنہیں استاد نے اپنے پرچے میں جگہ نہ دے کر سمجھا کہ انہوں نے ان نوجوانوں کا ادبی قتال بلکہ مرگ انبوہ برپا کر دیا ہے۔

اس ضمن میں احمد ضیاء نے ایک بار استاد سے استادانہ انتقام بھی لیا تھا۔ ہوا یوں کہ احمد ضیا مبینہ طور پر اس وقت دروا سعدی کو کلام دکھاتے تھے جس سے وہ بعد میں انکاری رہے اور خود کو محسن بھوپالی سے متعلق ہونے کا تاثر دینے لگے۔ احمد ضیاء کا آبائی شغل اخبار فروشی رہا ہے اس لئے وہ نامہ نگاروں کے قریب تھے۔ ایک دن روزنامہ مشرق کے اس وقت کے نمائندے خبروں کا ڈسپیچ کر رہے تھے جو بذریعہ ٹرین رات گئے روانہ کیا جاتا تھا، احمد ضیا نے اس میں یہ خبر رکھ دی کہ استاد اختر انصاری اکبر آبادی کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے دن اخبار میں جب یہ خبر چھپی تو کہرام مچ گیا۔ احمد ضیا تو غائب ہو گئے تریدوں کا سلسلہ شروع

ہوگیا۔سب سے دلچسپ تردید خود اختر انصاری کے حوالے سے زینتِ اخبار ہوئی جو کچھ اس طرح تھی ''میں ابھی تک زندہ ہوں۔۔۔اختر انصاری اکبر آبادی'' لیکن اس دلچسپ صورتحال کا فائدہ کالم نگاروں نے خوب اٹھایا اور ایسے ایسے کالم لکھے گئے کہ جنہیں پڑھ کر خود اختر انصاری اکبر آبادی تک ہنس دیئے۔کسی نے لکھا کہ استاد جب زندہ تھے تو بھی کیا زندہ تھے اور اب ان کی تردید کے مطابق زندہ ہیں تو بھی کیا زندہ ہوں گے۔ایک خبر تھی کہ ''استاد کو گمان ہے کہ وہ زندہ ہیں''۔ایک اور خبر یوں تھی ''استاد کو بالآخر خبر ہوگئی کہ وہ زندہ ہیں'' ایک اور خبر ''استاد ابھی تک زندہ ہیں'' وغیرہ وغیرہ۔۔۔ریاض فرشوری نے لکھا کہ استاد بڑے کمالات کے شخص تھے۔وہ جب ٹنڈو آدم آئے تو میرے مہمان ہوتے اور میں جب حیدر آباد جاتا تو ان کا میزبان ہوتا۔استاد کی ناک کے حوالے سے بھی اس زمانے میں یہ مصرع چلا تھا کہ ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں۔

سلطان ہوٹل جو اس زمانے میں تمام رات کھلا رہتا تھا بلکہ اس کے دروازے ہی نہیں تھے تمام لکھنے والوں کا ڈرائنگ روم بھی تھا۔استاد رات کا کھانا یہیں کھاتے تھے مگر عموماً یہاں رات بسر کرنے والے ادیب شعراء کے پہنچنے سے پہلے ہی فارغ ہوجاتے تھے۔تاہم اکرام جعفری نے ان کے وقت کا اندازہ لگالیا تھا اور وہ اکثر ان سے بھی پہلے وہاں پہنچ جاتا تھا،اس وقت اس ہوٹل میں بریانی کی ایک پلیٹ صرف دس آنے میں ملتی تھی۔آہستہ آہستہ استاد، اکرام جعفری کے ساتھ کھانے کے اس قدر عادی ہوگئے تھے کہ انہیں اس کے بغیر کھانا اچھا ہی نہیں لگتا تھا اور جس دن اکرام نہ آتے وہ اس کی پلیٹ سامنے رکھ کر اپنی پلیٹ کھاتے اور پھر بھری پلیٹ واپس کرنے کے باوجود اس کا بل ادا کرتے تھے تاکہ کھانا بھی ہضم ہوجائے اور ان کی ٹھرک بھی مٹ جائے۔

استاد کے کارناموں میں ''نئی قدریں'' کی مسلسل اشاعت کے علاوہ غالب کے صد سالہ جشن کا اہتمام بھی اہم رہا ہے۔انہوں نے ذاتی دلچسپی لے کر اس وقت کے اعلیٰ حکام کے تعاون سے یہ جشن اس خوبی سے منایا تھا کہ پورے ملک میں تادیر اس کا چرچا سنائی دیا۔اس صد سالہ جشن کے پروگراموں میں سے ایک کل پاکستان مشاعرہ بھی تھا جس کی صدارت جوش ملیح آبادی نے کی تھی اور مہمان خصوصی اس وقت کے کمشنر حیدر آباد مسرور حسن خاں تھے اور وہ بھی اکبر آبادی تھے جو خود بے حد پڑھے لکھے، ادب نواز اور غالب فہم بیوروکریٹ تھے۔شاید اس وقت سینئر بیوروکریٹس کی پہچان میں ادب دوستی جزو لازم تھی۔مسرور حسن خاں نے اپنے خصوصی خطاب میں جوش کے لیے غالب کے اس شعر کو استعمال کیا تھا۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی ملی ہوئی
اک شمع رہ گئی ''ہے'' سو وہ بھی خموش ہے

استاد کی جانب سے اس جشن کے نثری حصے میں بے شمار دانشور آئے تھے جن میں سید محمد تقی سے لے کر ڈاکٹر اسلم فرخی اور لاہور سے سجاد باقر رضوی شامل تھے اور سجاد باقر رضوی نے اپنے مضمون کی ابتداء اس فقرے سے کی تھی کہ غالب کا انتقال 1869ء میں ہوا تھا لیکن غالب پیدا 1969ء میں ہوئے ہیں۔استاد نے اس جشن کی کاروائی بڑے اہتمام سے چھاپی تھی جس کا سرنامہ ''غالبِ نام آورم'' تھا۔

علاوہ ایک مختصر سی مدت کے جب ان کا ہوٹل از سرِ نو تعمیر ہو رہا تھا استاد نے ساری زندگی ہوٹل ہی میں گزار دی اور ہوٹل میں ہی آخری سانس لیا۔وہ بہاولپور گئے ہوئے تھے کہ وہاں کے حبیب ہوٹل میں سوتے ہوئے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

وضع داری استاد کا خاصہ تھا۔جس سے دشمنی کی جی بھر کر کی۔خود سے صلح کرنے کے وہ روادار نہ تھے اور دشمنی دور کرنے کے لئے کسی کو درمیان میں لانے کے وہ قائل نہ تھے۔اس لئے جس سے ٹھن گئی اس سے زندگی بھر ٹھنی رہی۔جس سے دوستی قائم کرلی اس سے نبھانے کو عبادت سمجھتے رہے۔نئے لکھنے والوں کے لیے ان کے پرچے نے نرسری تیار کرنے کا کام انجام دیا۔ان کی آمدنی کا ذریعہ پرچے کے اشتہار کے علاوہ مشاعروں میں شرکت سے ملنے والا نذرانہ بھی تھا اور ریڈیو کے پروگراموں کے ساتھ ہر ماہ کتابوں پر تبصرے کے عوض ملنے والے چیک تھے۔مگر ان کی شاعری کی طرح کتابوں پر تبصرے کے حوالے سے بھی بہت سی کہہ مکرنیاں ہیں جو اصلاً کہہ کر مکر جانے جیسی ہی ہیں۔

استاد کے مرجانے کا یقین اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے ساتھ ہی ''نئی قدریں'' بھی مرگیا،ایسے جیسے سید محمد خضر مہدی کے انتقال کے ساتھ جمہوری لائبریری کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔ایسے لوگ ادارہ ہوتے ہیں اس کا اندازہ ان کی زندگی میں نہیں ہوتا،جب مرجائیں تو پتہ چلتا ہے کوئی سائبان سا تھا جو گر گیا اور ایسے ہی مرحلے پر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شخص مرتا ہے شخصیت نہیں مرتی!!

۔ سیاسی گنتی ۔

ایک نمبر کی پارٹی دو نمبر کے لوگ
ترنگے کے نیچے بیٹھ کر
چار لوگوں کے سامنے
پنج ورشی یوجنا بناتے ہیں
اور چھ حصوں کو سات لوگوں میں بانٹنے کا پریاس کرتے ہیں
آٹھواں اُٹھ کے کھڑا ہو جاتا ہے
نواں سپورٹ کھینچ لیتا ہے
اور دس جنپت میں سناٹا چھا جاتا ہے

بصد شکریہ: سونی ٹی۔وی (بھارت)

''چشمِ حسرت''

اونگھتی گلیاں، لرزتے سائے

امین راحت چغتائی
(راولپنڈی)

زندگی ہے کہ گناہِ بے کیف
آرزو ہے کہ سلگتا ہوا داغ
چشمِ حسرت ہے کہ رستا ناسور
اور احساس، عذابِ دوزخ،
لب کشاہوں تو زباں کٹ جائے
چیخ سن لیں تو سماعت معدوم
دل جو تڑپے تو سلاسل چھنکیں
سوچ اُکسائے تو گردن زدنی

نغمۂ ساز پہ پتھر برسیں
سایۂ ابر میں تن جل جائے
بوئے خوں، ساغرِ مے سے آئے،
صحنِ گلشن ہے کہ دشتِ غربت،
بام تک کس کی رسائی یارو!
اِک معمہ ہے نشانِ در بھی
راہ میں آگ کا دریائے رواں
اور منزل کا پتہ ہو تو چلیں

صبح سے شام تلک ایک سماں
کہیں اندھیارا نہ اجیارا ہے
اونگھتی گلیاں، لرزتے سائے
پتّہ ہل جائے تو کہرام مچے،
بجلی کڑکے، کہیں بادل گرجے
دیکھتے دیکھتے جل تھل ہو جائے
روح کی پیاس کہ پھر بھی نہ بجھے
قلزم غم میں گھِرا شہر سکوت
اُن سفینوں کی طرف دیکھتا ہے
ناخدا جن کے بہ صد حسنِ سلوک
بیچ منجدھار ڈبو دیتے ہیں

رات خاموش ہے، تارے حیراں
خانۂ شیخ میں ہر شے جائز
دخترِ رز ہو، کوئی دخت گدا،
صبر کی داد نہ فریاد کہیں،
اِسی اندھیارے میں کچھ دیوانے
سر کو کھجلاتے ہوئے سوچتے ہیں
آج کی رات جو سو کر اُٹھیں
نُور ہی نُور ہو پھیلا ہر سو

○

تمہارے نام لکھتا ہوں

عزیز پریہار
(لدھیانہ بھارت)

سنہری دھوپ کا منظر
گئے موسم کی شادابی
شفق کی ریشمی گرہیں
چاند کے پہلو میں لپٹی سبز شاخیں۔۔۔
کسی ٹوٹے ہوئے تارے کی دھندلی سی لکیریں
نقش جن کے ریت پر بہتے رہے برسوں
سفر کی دائمی خوشبو
میں جس کی آرزو لے کر تمہارے پاس آیا تھا
کتابِ دل کی وہ دھڑکن
تمہارے نام لکھتا ہوں

پروں پر تتلیوں کے تیرتی سرگم
جو لفظوں میں کبھی ڈھلنے نہ پائی
وہ مدّھم ساز کی جنبش
اُجالے صبح کے
دستک ہواؤں کی
میں اپنی سوچ کی ٹیڑھی، فصیلیں
جو کبھی آئیں صدا بن کر
خلا بن کر جو لوٹی ہیں
کسی بے نام صحرا میں
تمہارے نام لکھتا ہوں

گزرتی ساعتوں کی تلخیاں رعنائیاں
آوارگی اپنی
طلسمِ آگہی کے خواب پیکر
پھول تتلی رنگ بارش قہقہے
خزانے لفظ و معنی کے
سلیقے گفتگو کے
نرم لہجے کی رواں لہریں
محبت کی، پرانی داستاں
تم نے کہی میں نے سنی
میں نے کہی تم نے سُنی
تمہارے نام لکھتا ہوں

مجھے اب سرخرو کر دو
مرے سب خواب چوری ہو گئے ہیں
خواب کی منزل نیا اک خواب ہے
مرے دامن میں خوابیدہ
نہ جانے کتنے خاکے، کتنے نقشے
آخری سانسوں پہ ہیں
تصویر ان خوابوں کی اب میں سونپ کر تجھکو
نیا اک باب لکھتا ہوں
تمہارے نام لکھتا ہوں

○

ہم کسے آواز دیں

پروفیسر حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

دل زدہ، مغموم، افسردہ، پریشاں فکر ہم
چھوڑ کر اپنا وطن آئے دیار غیر میں
پیٹ کی خاطر
فقط ڈالر کمانے کے لیے
اپنی مٹی سے جدا ہونا گوارا کر لیا
بے نشاں، بے نام، بے دم، خوف میں ڈوبے ہوئے
جیسے قاتل کا ہدف، سایہ تعاقب میں کوئی
سرفگندہ سوچ میں گم
ہر قدم پر جسم لرزاں، روح کے دیوار و در میں درد کی لہریں اٹھیں
زلزلوں کی زد میں ہم، موت کے قدموں کی آہٹ
تیز تیز چلنے میں اپنی سانس بھی پھولی ہوئی
اپنی پرچھائیں سے دل دہلا ہوا
ہم کسے آواز دیں، جائیں کہاں
چھوڑ کر اپنا وطن آئے دیار غیر میں
پیٹ کی خاطر
فقط ڈالر کمانے کے لیے
اپنی مٹی سے جدا ہونا گوارا کر لیا
سرفگندہ سوچ میں گم
بے نشاں، بے نام، بے دم، خوف میں ڈوبے ہوئے
جیسے قاتل کا ہدف، سایہ تعاقب میں کوئی

○

بھینٹ

سلیم آغا قزلباش
(سرگودھا)

نازک مہکتے پھول
قلقاریاں مارتے معصوم بچّے
جوان اور بوڑھے پیڑ
انہیں کیا معلوم
کسی پل
کسی دن
وہ
خندقوں، غاروں، کچھاروں میں چھپے
اپنے سفّاک ہرکاروں کو
چیختے پہیوں، سنسناتی گولیوں
گونجتے دھماکوں
بھڑکتے شعلوں
میں ڈھال کر
ان کی جانب روانہ کر دے!
آج نجانے کس کی باری ہے
آج وہ
نجانے کس کے گرم خون سے
اپنے ماتھے پر سرخ تتفہ لگائے گا
اور خوشی سے ناچتا چلا جائے گا۔

○

تقلیب

آصف رضا
(یو۔ایس۔اے)

وہ خود خالق تھا اپنی ان پرچھائیوں کا
جو اُس کو گھیرے رہتی تھیں
دل اس کا جنوں کا آئینہ
آنکھیں اس کی پیہم جس کو چمکاتی تھیں
دُور سے اپنی جانب آنے والوں کو دھمکاتی تھیں
وہ اپنی انا کا زندانی
انسانوں سے نفرت تھی اُس کی لاثانی

وہ جو تھا خدائی کا طالب
تقلیب میں ہے اُس کا قالب

وہ زاغ کے پیکر میں دیکھو
اک روحِ سیّاہ!
کانوں میں خراشیں ڈالتی ہے آواز اُس کی
لاشوں کی بُو پر مڑتی ہے پرواز اُس کی

○

بدلتی زندگی

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(دہلی، بھارت)

مقام در مقام بدلتی زندگی
کہیں سکوں کہیں پایہ گردش ملی
کیفیتِ جاں میں ہے عجب وارفتگی
مسافری کی سوغات اچھی رہی
طبع میں انکساری بندہ پروری
چلتے پھرتے سایوں میں ڈھونڈی زندگی
ماسوا اللہ نگاہ میں کچھ نہ رہا
اللہ ھو اللہ ھو زبان پڑھنے لگی
''آتما کی پیاس'' سے ہوئی آگہی
کوئی بھی لگتا نہیں اب اجنبی
فریب دو کے میں فریبی کہوں
اپنے اپنے کرموں سے ہیں بندھے سبھی
تری خود نوشت ''ابابیلیں منڈلا رہی ہیں'' پڑھا
ہائے! زخم خوردہ کتنی ہے آتما تری
تشنہ ''مانا'' ہر شے میں اُس کا ظہور
رفتہ رفتہ خودسری بھی مٹنے لگی

○

(مدیر چہارسو گلزار جاوید کا افسانہ)

قطعات

ماہراجمیری

(میر پور خاص، سندھ)

اپنے ہمسائے کی عالی شان بلڈنگ دیکھ کر
میں نے سوچا ہے یہ شاید اس کی محنت کا ثمر
پھر خیال آیا کہ محنت پر جو ہوتا منحصر
سب سے عالی شان ہوتے صرف مزدوروں کے گھر

ادیبوں، شاعروں، دانش وروں اور نکتہ دانوں کا
یقیناً رہ نما و رہ بر و سردار ہے غالب
جِلا بخشی ہے ماہر جس کی تحریروں نے ذہنوں کو
جہانِ شاعری کا وہ حسین شاہکار ہے غالب

خلوص رُخ پہ دلوں میں کدورتیں کیا کیا
فریب دیتی ہیں یاروں کی صورتیں کیا کیا
تضادِ ظاہر و باطن نہ پوچھ ماؔہر
معاشرے پہ ہیں ان کی عنایتیں کیا کیا

خون سے جس نے کیا سیراب پاکستان کو
اُس شہیدِ قوم پر اربابِ ہمت کا سلام
جو شہادت سے مشرف ہوگئے مرتے نہیں
حشر تک زندہ رہے گا قائدِ ملت کا نام

○

دوہے

کاوش پرتا پگڈھی

(دہلی، بھارت)

جدھر نظر دوڑایئے، لگی ہوئی ہے آگ
چھیڑا ہے کس نے یہاں، ایسا دیپک راگ

چاہے کیسے بھی رہے، بھیتر کے طوفان
ہر طوفاں کو پی گیا، دل کا ریگستاں

مٹی کا سنسار ہے، مٹی کے ہم لوگ
مٹی ہونا ہے ہمیں، کیسا کس کا سوگ

سر میں سودے انگنت، دل میں خواہش لاکھ
پل دو پل ہم آگ ہیں، پل دو پل میں راکھ

آخر وہ بھی دے دیا، جو کچھ بھی تھا شیش
پھر بھی اب تک ہوا کہاں، صاحب کا آدیش

اپنی ضد پر آج بھی، اڑے رہیں گے آپ
لو ہم بھی دل تھام کر، جاتے ہیں چپ چاپ

سکھی بتاؤں کس طرح، مدھر ملن کی بات
تجھ کو بھی جلدی ملے، ایسی پیاری رات

سانجھ بھئی بازار میں، رونق بڑھی عجیب
ہر کوٹھے کے سامنے، جمع امیر و غریب

سخنوری کے جسم کا، دوہا بھی اک انگ
تجھ سے پہلے تھا کہاں، کاوش اردو رنگ

○

دوہے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
(بھاگل پور، بہار)

نیکی سے قائم یہاں گلشن ، بوٹے ، بیل
سورج ڈوبا تو کہاں پھر کرنوں کا کھیل

کہہ جا اپنے راز سب ہونٹوں کو مت کھول
دیواروں کے کان ہیں آنکھوں آنکھوں بول

ساگر کو گاگر سمجھ ہو جا ساگر پار
ڈوب گیا وہ جو گیا اپنی ہمت ہار

موسم ہے برسات کا سبز جہاں لہرائے
دیکھو دل کے کھیت میں کب ہریالی آئے

کیا کہتے ہیں سن سہی اللہ اور رسول
مت چل من کی راہ پہ منزل کو مت بھول

ہر مذہب کا قول ہے چیونٹی کو مت مار
کیسے انساں کھینچ لے انساں پہ تلوار

○

تارِ عنکبوت

نیلم احمد بشیر
(لاہور)

میں اک جالے میں رہتی ہوں
حالانکہ مکڑی بھی نہیں ہوں
یہ تالاب بھی کہتا ہے
جس میں میرا عکس بہتا رہتا ہے
میں تو بس اک تتلی ہوں
خوش رنگ اور خوشنما متحرک
اِدھر سے اُدھر اترنے پھرنے، ہنسنے گانے والی
زندگی سے بھرپور
آرزو سے چور
متوالی آزادی کی
دلربا شہزادی سی
تتلی تھی جب جنم لیا
آغاز سفر کیا
پروں کو ہولے ہولے پھڑ پھڑایا، آزمایا
کتنے رنگ جھڑے تھے مجھ سے
آج مگر کیوں جکڑی ہوئی ہوں
چاروں اور اک جالا تنا ہے
سرمئی اور بدرنگ
رستہ روکنے والا
الجھا تانا بانا
میرا گھر ٹھکانہ
اب تالاب بھی مجھ سے کچھ کترانے لگا ہے
اک کنکر جو گرا تو سب کچھ بدل گیا
یہ کس کا ہے عکس لرزتا پانی میں
کہاں سے آئی یہ بدصورت سی مکڑی
جالے کے جو بیچوں بیچ پھنسی بیٹھی

رات

فیصل عظیم
(کینیڈا)

فضا پر مردنی چھائی ہوئی ہے
ستاروں کی ضیا بھی ماند ہے
یا دل کا پردہ آنکھ کو بہکا رہا ہے
منظروں کو جا بجا دھندلا رہا ہے
سوچ پر، چہروں پہ، ناموں پر
وہی منفی علامت ثبت ہے تو کیوں
رگوں میں خون بن کر زہر کیوں گردش میں رہتا ہے
کوئی لہجہ، کوئی شیریں بیاں دل کو نہیں چھوتا
مریضِ دل ہو کیا؟
آزار ہے کوئی کہ جو ہنسنے نہیں دیتا؟
گماں نے جڑ پکڑ لی ہے
کہ اپنے آپ سے بھی بدگمانی ہے!
کسی کی کیا۔۔۔
خود اپنی بات بھی اچھی نہیں لگتی
وہی منفی علامت اپنے چہرے پر بھی چسپاں ہے
وہ کوئی زخم ہے گویا بصارت کا
جہاں دیکھو
وہی منفی علامت ہے
خدایا، کیا قیامت ہے!!

○

''وفاؤں کے گلاب''

عرفان صادق
(لاہور)

تمہاری سوچوں سے پھوٹتے ہیں
بہار موسم کے رنگ سارے
تمہارے لفظوں سے آ رہی ہے
عجیب خوشبو کمال خوشبو
ہوائے تازہ
تمہارے ہونے کی دیکھ! مخبر بنی ہوئی ہے
تمہاری سوچوں میں نئے زمانوں کی روشنی ہے
اُبھرتے سورج کی تابنا کی
طلوع ہوتی ہوئی سحر ہے
اسی سحر کو تمہاری پوروں نے
کِس قرینے سے سارے لفظوں میں بُو دیا ہے
میں جانتا ہوں کہ موجزن ہے تمہارے دل میں
محبتوں کا اِک ایسا ساگر
کہ جس کی حد ہی نہیں کوئی
تمہاری آنکھوں میں روشنی کے جو دائرے ہیں
خلوص کے ہیں
وفاؤں کے سب گلاب موسم
تمہارے ماتھے پہ ضوفشاں ہیں
دُعا ہے رب سے
تمہارے آنگن میں چاہتوں کے
محبتوں کے
رُکے رہیں یہ تمام موسم
رُکے رہیں یہ تمام موسم

○

(ڈاکٹر نثار ترابی کے لیے ایک نظم)

غزلِ نو کا پیکر تراش

پروفیسر قیصر نجفی
(کراچی)

انسان کوئی ماورائی مخلوق نہیں۔ پھر بھی کما حقہٗ سمجھ میں نہیں آتا۔ اللہ کے دیگر اسرار کی طرح انسان بھی ایک سرّ نہاں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خود شناسی خدا شناسی کی شرط اوّل ہے۔ یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ جب تخلیق ہی بعید از فہم ہے تو خالق تک عقل و شعور کی رسائی کیوں کر ممکن ہے۔ البتہ انسان جسے خالق اصغر ہونے کا شرف حاصل ہے، خالق کے اثبات کی ایک نشانی ضرور ہے۔ انسان میں جو متحیر کن ماورائی صفات ہیں۔ ان میں ایک الہام والقا ہے۔ یہ صفت مقام و مرتبہ کی نسبت سے انبیاء کے علاوہ شعراء کو بھی ودیعت ہوئی ہے۔ مگر ان شعراء کو جن کے کلام نے یہ ادراک بخشا کہ ''شاعری جزو است از پیغمبری'' اس قول کی پرتیں الٹنے سے یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ انبیاء پر جو الہام ہوا، وہ اس کی عملی تصویر بن گئے، یعنی انہوں نے جو کہا وہ کر کے دکھایا۔ بعینہٖ اسی طرح وہ شعراء جن کا حرف سخن الہامی ہے، اپنے کہے کی تفسیر ہیں۔ شاید اسی تناظر میں شعر کی تخلیقی صداقت کی جانچ کے لئے یہ کسوٹی وضع کی گئی ہے کہ ''شاعر اور شاعری میں مماثلت ہونی چاہیئے''

فی زمانہ ایسے شعراء جن کی اپنی شاعری سے مماثلت ہے یعنی جن کے شعر میں تخلیقی صداقت ہے، خال خال ہیں بلکہ معدودے چند ہیں اور جنہیں ڈھونڈنے کے لئے دن میں بھی چراغ جلانا پڑتا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ ہے۔ ہمارے نزدیک عصر حاضر کے شعراء میں مرتضیٰ برلاس کے سر پر تخلیقی صداقت کا تاج سجایا جا سکتا ہے کہ ان کے انگ انگ سے ان کا شعر اور شعر کے انگ انگ سے وہ جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے ہماری بات آپ پر واضح نہ ہو سکی ہو۔ دراصل ہم یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اگر آپ محبت کے پیامبر ہونے کے مدعی ہیں تو کیا محبت سے آپ خود بھی شرابور ہیں یا عالمِ بے عمل کی طرح در پردہ خفت و شرمندگی کی سولی پر لٹکے رہتے ہیں۔ برلاس صاحب کا درج ذیل شعر بطور خاص زبان زد عام ہے۔

دوستوں کے حلقے میں ہم وہ کج مقدر ہیں
افسروں میں شاعر ہیں شاعروں میں افسر ہیں

یہ شعر ایک ایسا موقلم ہے، جو پردۂ ذہن پر نہ صرف شاعر کے خارج کا خاکہ کھینچتا ہے، بلکہ اس کے باطن کو بھی مصوّر کرتا ہے۔ تفصیل اس نکتے کی یہ ہے کہ خدا نے برلاس صاحب کو (ظاہر و باطن) ہر پہلو سے شاعر بنایا لیکن ان کا رزق سول بیوروکریسی میں رکھ دیا۔ بیوروکریسی، احساس برتری جس کی گھٹی میں ہے، نشۂ اقتدار جس کے رگ و ریشہ میں خون بن کر دوڑتا ہے اور تحکم، اکڑفوں، رعونت، بے مہری، تنک مزاجی جس کی فطرت ثانی ہے۔ مرتضیٰ برلاس جب بیوروکریسی کے ایوانوں میں داخل ہوئے تو انہیں ایک شاعر بارو کرتے ہوئے alien قرار دیا گیا۔ جبکہ نام نہاد شاعروں کے طبقے میں وہ یوں alien ٹھہرے کہ وہ ایک جینوئن شاعر ہیں۔ اب جبکہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ مرتضیٰ برلاس کا خارج سر بسر ان کے شاعر ہونے کی شہادت دیتا ہے تو آیئے ان کے باطن پر بھی ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

ہم نے اپنی زندگی کی ڈگر پر برلاس صاحب کی اس وقت چاپ سنی، جب ہماری مسیں بھیگ رہی تھیں اور شعر و شعور کی دہلیز پر تازہ تازہ قدم رکھا تھا۔ انہیں جب ہماری شعر گوئی کا پتا چلا تو سراپا شفقت تو تھے ہی، مجسم محبت بن گئے۔ ہم سے شعر سنانے کی فرمائش کر دی۔ ہم نے تعمیل ارشاد کی۔ دوسرے روز جب ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہیں اپنا درج ذیل شعر گنگناتے ہوئے پایا۔

شب غم کی تیرگی میں مرا دل نہ ڈوب جائے
کوئی چاند سے یہ کہہ دے مرے ساتھ ساتھ آئے

ان کا یہ عمل اپنے دامن میں ہمارے لئے کیا کیا حیرتیں لئے ہوئے تھا۔ اس کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہمیں گم صم دیکھ کر بولے ''میاں! حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ شعر اچھا لگا، ہم نے گنگنا دیا۔ کیا ہوا جو ایک نوعمر کا ہے'' ایسے میں دو مقامی شعراء جن میں ایک پیشے کے اعتبار سے پوسٹ مین اور دوسرا پان فروش تھا، انہیں ایک مشاعرے میں شرکت کی دعوت دینے آئے۔ برلاس صاحب نے کھڑے ہو کر ان سے مصافحہ کیا، اپنے پاس بٹھایا، چائے سے تواضع کی اور بہر زاویۂ حسنِ اخلاق ان کے ساتھ برابری کا سلوک کیا۔ ہم ششدر تو پہلے ہی تھے، اب مبہوت ہو گئے۔ ہم پر اسی دن یہ واضح ہو گیا کہ برلاس صاحب کی زندگی کی تہذیب آغوش انسانیت میں ہوئی ہے اور ان کی شاعری میں اخلاص و محبت، صدق و صفا اور عجز و انکسار کا جو درس ہے، وہ بنفسہٖ اس کی عملی تصویر ہیں۔ ہر چند مقتدر ہیں، مگر ایسے مقتدر ہیں جس کی تفہیم حفیظ جالندھری نے کچھ اس طرح کرائی ہے۔

فقر نے بوریا دیا مجھکو
تن کے میں بادشاہ بن بیٹھا

یہ قصہ ان دنوں کا ہے۔ جب برلاس صاحب ڈیرہ اسمٰعیل خان میں مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے اور شہر میں شعر و ادب کا نفس ناطقہ تھے۔ ان کی کاوشوں سے سرکاری سطح پر ڈیرہ کی تاریخ میں پہلی بار کل پاکستان مشاعرے کے انعقاد کا اہتمام کیا گیا۔ برادر کلاں خدا بخش نازش ایڈووکیٹ (شہر کی ایک

معروف علمی، ادبی سیاسی شخصیت) ان کے دست و باز و تھے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں ڈیرہ کی ثقافتی سرگرمیوں کے بھی برلاس صاحب روح رواں تھے۔ ڈیرہ ڈگری کالج کے ایک ڈرامے میں ان کی پس پردہ صدا کاری کے سحر سے ہم تا حال باہر نہیں نکلے ہیں۔ انہوں نے الفاظ کی گھن گرج، زیر و بم اور لہجے کے اتار چڑھاؤ میں زیڈ اے بخاری کی یاد تازہ کر دی۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ انتظامیہ کے حلقے سے لے کر علمی، ادبی اور ثقافتی حلقوں تک لوگ یکساں طور پر انکے رطب اللسان تھے۔ بلکہ شہر بھر میں ان کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ گویا ''وہ آئے، انہوں نے دیکھا اور مسخر کر لیا''

ہمارے خیال میں ارباب نقد و نظر کی جتنی بڑی تعداد نے برلاس صاحب کی فکر و فن کو درخور اعتنا سمجھا اور اس کی مدح و ستائش کی، اس کی مثال شاید ہی معاصر شعراء میں کسی کی کلیات میں دیکھنے کو ملے۔ اس اختصاص کی بنیادی وجہ برلاس صاحب کا منفرد دلب ولہجہ ہے۔ جسے رجحان ساز (Trend Setter) کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنا لب ولہجہ کلیات میں شامل تیشۂ کرب، ارتعاش، اضطرار، گرۂ نیم باز اور تکملہ، تمام شعری مجموعوں میں قائم رکھا ہے، جو یقینی طور پر انہیں ایک الگ شناخت دینے میں کامگار ٹھہرا ہے۔ ہم نے سطور بالا میں برلاس صاحب کے حرف سخن کو الہامی قرار دیا ہے۔ الہامی بایں سبب کہ ان کی شریعت شعر میں پیمبرانہ اسلوب فکر و اظہار کے اصولوں کو مدنظر رکھا گیا ہے، یعنی ان کی تمام تر سوچ، لفظ و بیان اور موضوع و مواد حق و صداقت کے پرچم کشا ہیں۔ ان کا ہر مصرع اور ہر شعر اصلاح و تعمیر کی مقصدیت سے سرشار اور ان کی ساری کی ساری فنی شعریات اور انسانی اقدار کی بحالی و تحفظ کے جذبے سے عبادت ہیں۔ مگر یہ ایک کھلا راز ہے کہ حق و صداقت کی ترویج، اصلاح و تعمیر کی جد و جہد اور اقدار انسانی کا فروغ جرأت و حوصلہ کے وفور کا متقاضی ہے اور یہ وصف برلاس صاحب کے یہاں اپنی انتہاؤں پر ہے۔

''قلمی جہاد'' کی ترکیب تو ہم نے سن رکھی تھی، مگر اسکا علمی نمونہ کم ہی کہیں دیکھنے کو ملا۔ عصر حاضر میں مرتضیٰ برلاس کی شاعری میں قلمی جہاد کا جلوہ اپنے تمام تر معنوی حسن کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ خیر و شر کا جس مہارت فن سے برلاس صاحب نے شعور بخشا ہے وہ بے عدیل ہے۔ دراصل ان کی شعری کاوش منفی قوتوں سے ٹکرانے کی ایک تحریک ہے۔ انہوں نے سرفروشانہ جذبات واحساسات کو شعری جمالیات کا پیرہن پہنا کر غزل کے ایک دل آویز پیکر سے روشناس کرایا ہے۔

اردو شعر و ادب نے (حقیقی معنوں میں) 1936ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد ایک ایسی کروٹ لی، جسے ہم فکری و فنی انقلاب سے موسوم کر سکتے ہیں، مزاحمتی شاعری نے اسی انقلابی تبدیلی کی کوکھ سے جنم لیا۔ ترقی پسند تحریک پر متفرق، فکری، نظری اور اسلوبیاتی الزامات کے باوجود وہ اس لئے قابل اعتنا ٹھہری کہ تاریخ ادب اردو میں پہلی بار اسی تحریک کے پلیٹ فارم سے ''ادب برائے زندگی'' کا نظریہ متعارف ہوا اور ظلم، جبر، استحصال اور ناانصافی کے خلاف عوامی سطح پر آواز بلند ہوئی۔ مزاحمتی شاعری میں کئی سربرآوردہ شعراء کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اس صف میں مرتضیٰ برلاس بھی شامل ہیں۔ برلاس صاحب ایک سکہ بند ترقی پسند نہیں ہیں، اس کے باوجود انہوں نے مزاحمتی شاعری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کا اختصاص یہ ہے کہ سماجی کرب ہو، عصری کرب ہو یا کرب آگہی ہو، انہوں نے کسی نوع کے کرب کے اظہار میں استغاثہ و فغاں یا خود رحمی کے انداز و احساس کو در آنے کی اجازت نہیں دی بلکہ سیاست و ریاست اور اقتدار و امارت کی سفاکی و بربریت کے خلاف اسلوب اظہار کو للکار کے تیوروں سے ہم آہنگ رکھا۔ بالخصوص انہوں نے غزل میں اسلوبیاتی سطح پر حق گوئی و بیباکی کا وہ آفاقی پیرایہ اختیار کیا جسے ضرب المثال کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک تقسیم کے بعد گیسوئے غزل جن شعراء کے منت پذیر شانہ ہے، ان میں ناصر کاظمی، شکیب جلالی، ظفر اقبال اور مشکور یادؔ شامل ہیں۔ اس تناظر میں ہم نے مدیر ''چہارسو'' کے نام مراسلے میں جو اظہار خیال کیا ہے۔ اس کا یہاں حوالہ دینا نامناسب نہ ہوگا۔ (ظفر اقبال کا ذکر سہواً رہ گیا ہے، پھر بھی سہی)

> تقسیم کے بعد (ہمارے نزدیک) تین ایسے غزل گو شعراء افق شعر و سخن پر طلوع ہوئے۔ جنہوں نے اپنے منفرد اسلوب شعر کی روشنی سے ایوان اردو غزل کو منور کر دیا۔ ناصر کاظمی نے میر تقی میر کی غزل میں توسیع کی، لیکن اس انداز سے کہ تغزل تو میرؔ کا رہنے دیا۔ مگر موضوع و مواد میں تنوع لائے وارفتگیات، تراکیب اور مرکبات لفظی کو جدید رنگ و آہنگ بخش دیا۔ شکیب جلالی نے تو اردو غزل کی کایا پلٹ دی۔ جذبہ، خیال ڈکشن غرض ہر زاویۂ فن سے انہوں نے ایک نئی غزل سے متعارف کرایا۔ ان کے آگے بڑے بڑے غزل گو چپ ہو گئے اور انہی کے رنگ میں غزل کہنے پر مجبور ہوئے۔ کیونکہ یہ سکہ رائج الوقت تھا۔ لیکن اس بھیڑ میں مشکور حسین یادؔ سب سے الگ نظر آئے۔ بلکہ انہوں نے شکیبؔ کا فسوں توڑ دیا۔ آج وہی ایک غزل گو ہیں، جو میدان غزل گوئی میں اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ان کی سی تہہ داری و رمزیت خصوصاً تنقیدی ایمائیت معاصر غزل گو شعراء میں کسی کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یادؔ صاحب کی اپنی لغت غزل ہے۔ بالخصوص ردیف کا ان کے یہاں ایسا بے بہا خزانہ ہے، جس کی مثال غزل کی پوری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔۔۔ مشکور حسین یادؔ ایک نہایت زرخیز ذہن کے شاعر ہیں۔ جہاں وہ تازہ بتازہ تراکیب و مرکبات لفظی تخلیق کرتے ہیں، وہاں نو بہ نو موضوعات و مضامین بھی اختراع کرتے

ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ان کی غزل سر بسر فلسفۂ حیات وکائنات سے مملو ہے۔گردوپیش کی اشیاء اور موجودات کے بارے میں ان کا اپنا ایک زاویۂ فکر ونظر ہے۔ان کی غزلوں کا اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کم وبیش ہر غزل میں ان کی فکر کی زیریں لہریں عظمت انسانی کو اپنی جلو میں لئے ہوئی ہیں''

اس موقع پر ہم بلاخوف تردید یہ تسلیم کرتے ہیں کہ برلاس صاحب بھی اردو غزل کے معماروں میں شامل ہیں۔ان کی غزل سر بسر عصری آگہی سے مملو ہے۔ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے براہِ راست اظہار کو فکری نیرنگیوں سے ارژنگ رنگ بنا دیا ہے۔ یہ نیرنگیٔ فکر سماج ومعاشرہ کے محاکے کے نئے نئے زاویوں سے متعارف کراتی ہے، اور ایک ایسے منفرد لہجے کا حظ اٹھانے کا موقع فراہم کرتی ہے جو راست گوئی کی طمانیت سے سرشار ہے۔

برلاس صاحب بنیادی طور پر غزل کے ہی شاعر ہیں۔ان کے فن کا زندہ، بھرپور اور توانا اظہار ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔ان کی شاعری میں زندگی کے جو تلخ وتُرش ذائقے ملتے ہیں، وہ براہِ راست زندگی کے تجربات سے آئے ہیں۔ یہ تجربات ذاتی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ان کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں زندگی کے سب ہی روپ اور رنگ دیکھے جاسکتے ہیں۔ان کے یہاں حالات کی بدلتی ہوئی کروٹوں، اپنے عہد کی کشمکش اور کشمکش سے پیدا ہونے والے المیوں کا احساس بھی ہے۔تہذیبی اقدار کی جلوہ گری بھی اور انسانی جذبات کی نازک تصویریں بھی۔اس آئینہ خانے میں تہذیب انسانی کے گونا گوں نقش ابھرتے ہیں اور فطرت انسانی کے نشیب وفراز عکس ریز ہوتے ہیں۔وہ زندگی کی صداقتوں کو اپنی شاعرانہ بصیرت سے ہم آہنگ کر کے پیش کرتے ہیں۔ ان کے تجربات میں صرف گہرائی ہی نہیں بلکہ طرز اظہار کے اچھوتے پن کا اس حد تک احساس ہوتا ہے کہ ان کی غزل کو اردو غزل کا ایک پیکر نو تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ برلاس صاحب نے غزل کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے نئے زمانے کے ذہنی رویوں کو بھرپور معنویت اور ہنروری کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔

آج کا غزل گو جس عہد میں سانس لے رہا ہے وہ اپنی ساری مادی ترقی کے باوجود عدم اطمینان اور عدم آسودگی کا دور ہے۔سائنس جس نے ابتداء میں انسانی بہبود کی ذمہ داری لی تھی۔اب اپنی منفی قوتوں کے بھیانک روپ کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آگئی ہے۔نظام صنعت کی غیر ہم آہنگیوں، قومی، بین الاقوامی سیاست کی ریشہ دوانیوں اور صدیوں کے جمے جمائے سماجی اور اقتصادی ضابطوں کی شکست نے تہذیبی ڈھانچے کو جو نقصان پہنچایا ہے۔اس نے ہماری زندگی کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔آج ہم جس پر آشوب ماحول سے گزر رہے ہیں، وہاں کوئی چیز بھی ہمارے ذہنی سکون کی بازیافت کا سبب بنتی نظر نہیں آتی۔ حالات کی یہی ساری تلخی، ماحول کا انتشار اور زندگی کے تذبذب اور بے اطمینانی کا کرب بالخصوص ''تکملہ'' برلاس صاحب کے آخری مجموعہ کلام میں جبکہ عمومی طور پر دیگر تمام مجموعوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

''کلیات مرتضیٰ برلاس'' سے ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر چند اشعار پیش ہیں، ملاحظہ ہوں:

ہم ہیں فنکار مقابر کے مؤرخ تو نہیں
ہم کو ہوتا ہے جو محسوس وہ کیونکر نہ کہیں

کیا بھر گئے وہ زخم ہزیمت جو لگے تھے؟
ہنسنے کے جواز اب کے بہت غور طلب ہیں

خود رہبرانِ قوم ہیں آلائشوں میں گم
ہم سے مگر مطالبہ قربانیوں کا ہے

اڑنے کے لئے کر دیا سمتوں کا تعین
زنجیر کٹی ، پھر بھی ہمیں آزاد نہیں کیا؟

ایسی بستی کو زمیں چاٹ لیا کرتی ہے
ظلم بڑھ جائے جہاں حد سے زیادہ برلاس

بے لباس ہو کر بھی پیڑ تو رہے قائم
ہجرتوں کے موسم نے در بدر کئے پتے

میرا دشمن بھی یہ کہتا ہے کہ ہر بات مری
تلخ بیشک ہے مگر بات خدا لگتی ہے

ہمیں بس لوریاں دیجے کہ ہم سونے کے عادی ہیں
کوئی بھی قصۂ غم شامل روداد مت کیجیے

تجھ سے ورائے علم نہیں کچھ، مجھ بے علم، مہم جو کو
کوئی تو ایسا علم بتا جو باب تحیر کھولے کچھ

مجھے کی گئی ہے یہ پیشکش کہ سزا میں ہونگی رعائتیں
جو قصور میں نے کیا نہیں وہ قبول کرلوں دباؤ سے

رگڑی ہیں بہت ایڑیاں اس دشت میں ہم نے
ممکن ہے کسی دن یہاں پانی نکل آئے

میں ارباب سیاست کو وطن دشمن نہیں کہتا
مگر یہ دوست ایسے ہیں کہ جو نادان لگتے ہیں

آج کے دور میں بھی عارض ولب کی باتیں
کیا توقع رکھیں دانائے سخن سے اپنے

جس کی مشیت "کن فیکون" ہے سب کچھ ہی کرسکتا ہے
غیبی پرندے کنکر لے کر نازل بھی ہو سکتے ہیں

یہ آگ کا دریا تو اس راہ میں آنا تھا
اس آگ کے دریا کو پھر پار کیا ہوتا

خالق کا خوف جس کو نہ مخلوق کا خیال
گر یہ نہیں ، تو پھر کہو، فرعونیت ہے کیا

میں نے کہا کہ بن ترے کیسے کٹے گی زندگی
جلتے ہوئے چراغ کو اس نے بجھا دیا کہ یوں

اب بھی جو ہم نہ سنبھلے خدا خیر ہی کرے
ایسا نہ ہو علاج کوئی غیر ہی کرے

بت تو دُنیا نے بہرگام تراشے لیکن
سر جھکانے کے نہ آئے کبھی آداب مجھے

غرض ہم نے صاحبانِ اسلوب غزل گو شعراء کا جو مربع وضع کیا تھا اس نے برلاس صاحب کی شمولیت کے بعد مخمس کی شکل اختیار کر لی ہے۔اس تناظر میں اگر ناصر کاظمی، شکیب جلالی، مشکور حسین یاد، ظفر اقبال اور مرتضٰی برلاس کو جدید اردو غزل کے عناصر خمسہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

☆

''مرنے کی تیاری''

بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو بیسویں صدی بھی کرۂ ارض پر بسنے والے انسانوں کے لیے بے شمار تباہی و بربادی کا باعث بنی تھی مگر اکیسویں صدی کی ابتداء ہی جس ظلم، زیادتی اور ناانصافی سے ہوئی ہے اُس کی بابت قرطاس وقلم اس باعث حیراں اور پریشاں ہیں کہ اس صدی کے آنے والے بقیہ سال اپنے اندر تباہی کے کیا کیا سامان لے کر آتے ہیں! اس صدی کا آغاز علم وادب کے لیے بھی خاصا ناخوشگوار رہا۔اس صدی کے گیارہ سالوں میں جس قدر نامور اور بلند قامت ادیب، شاعر، دانشور اس دنیا سے رخصت ہوئے اُس کے ذکر کے لیے ایک سے زائد کتابیں بھی ناکافی ہیں۔ابھی اُردو پنجابی کے انتہائی سینئر اور ثقہ شاعر سردار کرتار سنگھ دُگل، مظہر امام، محمد منشا یاد، صلاح الدین پرویز اور اکبر حمیدی کے اچانک اور بے وقت چلے جانے سے جو زخم لگے تھے وہ مندمل بھی نہ ہو پائے تھے کہ اردو شاعری کو نئی رفعتوں سے روشناس کرانے والے بھارت کے ''گیان پیٹھ'' ایوارڈ یافتہ دانشور شاعر پروفیسر شہریار تیرہ فروری ۲۰۱۲ء کی رات کو بھارت کے شہر علی گڑھ میں انتقال کر گئے۔شہریار صاحب نے مدیرِ چہارسو کی درخواست پر علالت کے دنوں میں جو کلام ارسال فرمایا وہ چہارسُو کی گذشتہ اشاعت میں شامل ہو چکا ہے۔اس وقت غزل مذکور کا مطلع رہ رہ کر ہمارے دل ودماغ پر دستک دے رہا ہے۔

آسماں کچھ بھی نہیں تیرے کرنے کے لیے
میں نے سب تیاریاں کر لی ہیں مرنے کے لیے

چودہ فروری ۲۰۱۲ء کی شام پانچ بجے نامور شاعر، ادیب، صحافی اور ماہنامہ تخلیق (لاہور) کے مدیر محبّ اظہر جاوید اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔سولہ فروری ۲۰۱۲ء کو صاحبِ اُسلوب شاعر، ادیب، نقّاد اور شعر وحکمت کے مدیر جناب مغنی تبسم خالقِ حقیقی سے جا ملے۔مندرجہ بالا تمام محترمین اردو ادب کے نہایت درخشندہ ستارے اور اعتبار کے حامل قلمکار ہونے کے ساتھ ادارہ چہارسو اور مدیرِ چہارسو کے نہایت قریبی اور حقیقی رفیق وغم گسار تھے۔ادارہ اور تمام اراکین ان عزیزانِ سخن کی بے وقت اور ناگہاں وفات پر اُن کے عزیز واقارب، احباب اور قارئین سے دلی تعزیت کے ساتھ تمام مرحومین کے درجات کی بلندی کے لیے صمیمِ قلب سے دعا گو ہیں۔

☆

پیغامِ صبا

حالؔی اور اُن کے خاندان کی علمی اور ادبی خدمات

مہندر پرتاپ چاند
(انبالہ، بھارت)

پانی پت ہندوستان کا قدیم تاریخی شہر ہے، کہا جاتا ہے کہ مہابھارت میں پانڈوؤں نے دریودھن سے جو پانچ گاؤں مانگے تھے ان میں ایک پانی پت بھی تھا جسے اُس وقت ''پانڈوپرستھ'' (یعنی پانڈوؤں کا شہر) کا نام دیا گیا جو بعد میں پانی پرستھ اور پھر پانی پت بن گیا۔ اسی تاریخی شہر میں تین فیصلہ کن جنگیں بھی لڑی گئیں اور یہی شہر کئی روحانی شخصیتوں کی آماجگاہ بھی رہا ہے۔ تیرھویں صدی کے عظیم صوفی کریم اور معتبر فارسی شاعر حضرت شرف الدین بوعلی شاہ قلندر کا تعلق بھی پانی پت ہی سے تھا اور آج بھی اُنکی درگاہ پر مختلف مذاہب کے لوگ عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔

یہ شہر اس وقت پارچہ بافی کی صنعت کا بہت بڑا مرکز ہے اور یہیں پر ایک تیل صاف کرنے کا کارخانہ اور بجلی اور کھاد بنانے کے پلانٹ بھی ہیں۔

لیکن ان حقائق کے ساتھ ساتھ صوبہ ہریانہ کے اس شہر کو ایک امتیازی حیثیت اس وجہ سے بھی حاصل ہے کہ یہاں پر مولانا حالؔی جیسے بے نظیر ادیب نے جنم لیا۔ حفیظ جالندھری صاحب نے اسی پانی پت سے متعلق اپنی ایک نظم میں فرمایا ہے:

اسی باعث ملا اس سرزمیں کو رتبۂ عالی
کہ اس بستی کی خاکِ پاک سے پیدا ہوا حالؔی

خواجہ الطاف حسین حالؔی (1837ء پانی پت تا 31 دسمبر 1916ء پانی پت)

تاریخ ادب اردو میں پہلے باضابطہ سوانح نگار، پہلے باقاعدہ نقاد اور جدید شاعری، خصوصاً جدید نظم کے معمار تھے۔ وہ محض ایک عہد ساز ادبی شخصیت ہی نہیں تھے بلکہ بطور ایک مثالی انسان، ایک نہایت دردمند دل بھی رکھتے تھے اور حسن کردار کو اہم تر گردانتے تھے۔ حالؔی ایک درویش صفت، پاک سیرت، خوش اخلاق اور خوش اطوار انسان تھے۔ بچوں اور عورتوں کے لیے ان کے دل میں خاص شفقت اور ہمدردی تھی۔ وہ ایک مصلح قوم تھے اور سرسید احمد خان کے ساتھ مل کر اُنہوں نے ملک وقوم کی اصلاحی تحریکوں میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سرسید کی تحریک پر ہی انہوں نے مشہور نظم مدّ وجزر اسلام لکھی جسے ''مسدّس حالی'' کے نام سے دنیا جانتی ہے۔

نظم میں حالؔی نے غزل، نظم، رباعی، قطعہ، نعت، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی۔ سبھی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ سادگی، جوش، اصلیت، حقیقت پسندی، درد و سوز، ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ حالؔی مرزا غالب کے عزیز شاگرد تھے۔

مولانا کی نثری تصانیف میں ''حیاتِ سعدی''، ''یادگارِ غالب''، ''حیات جاوید'' (سرسید احمد خان کی سوانح عمری) اور ''مقدمہ شعروشاعری'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے خطوط کے دو مجموعے ''مکتوباتِ حالی'' اور ان کے مضامین کا مجموعہ ''مضامین حالی'' بھی شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا نے نہ صرف نظم ونثر کے ذریعہ اپنی آواز بلند کی بلکہ کئی عملی کام بھی کیے۔ عورتوں کی تعلیم وتربیت کے لیے اُنھوں نے پانی پت میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنے کنبے اور شہر میں کم عمر لڑکیوں کی شادی کی مذمت ومخالفت کی اور بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کے حق میں بھرپور وکالت کی۔ اُنہوں نے کہانی کے انداز میں عورتوں کے لیے ایک کتاب بھی لکھی تھی ''مجالس النساء''

حالؔی ایک سچے محبّ الوطن بھی تھے۔ وطن کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار وہ اس طرح فرماتے ہیں:

تیری اِک مشتِ خاک کے بدلے
لُوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

حالؔی کے بعد اسی خاندان اور اسی سرزمین سے اور بھی کئی نامور ادیب اور دانش ور پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی اپنی لیاقت اور وسیع النظری کے طفیل اُردو ادب میں گراں قدر اضافے کیے اور علمی وادبی سطح پر عالمی شہرت حاصل کی اس ضمن میں مندرجہ ذیل نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

خواجہ سجّاد حسین:

مولانا حالؔی کے فرزندِ ارجمند جو پنجاب میں انسپکٹر تعلیم تھے۔ انہوں نے 1933ء میں مولانا کی یاد میں ایک تحقیقی رسالہ ''حیاتِ نو'' جاری کیا تھا جس کے ایڈیٹر محمد بدرالسلام فضلی تھے اور شیخ محمد اسمٰعیل اس کے منیجر تھے۔ معروف ادیب اور فلم ساز خواجہ احمد عباس انہیں خواجہ سجّاد حسین صاحب کے نواسے تھے۔

خواجہ غلام الحسنین:

اُنیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں خواجہ غلام عباس کے یہاں پانی پت میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مولانا حالؔی کی ہمشیرہ وجیہہ النساء کے داماد تھے۔ خواجہ غلام الحسنین، خواجہ احمد عباس، خواجہ غلام السیدین اور بیگم صالحہ عابد حسین کے سگے چچا تھے۔

انہوں نے میٹرک تک انگریزی کے ساتھ تعلیم حاصل کی اور فارسی اور عربی کے بھی کئی امتحانات پاس کیے۔ ان کی قابلیت اور ذہانت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے عربی وفارسی کے عالم بھی ان کا لوہا مانتے تھے۔ انگریزی میں بھی یہاں تک قابلیت حاصل کر لی تھی کہ انہوں نے انگریزی مصنف ''ہربرٹ سپنسر'' (Herbert Spencer) کی ایک انگریزی کتاب کا نہایت رواں اور شگفتہ انداز میں اُردو ترجمہ کیا تھا۔ وہ پانی پت کے دو اسکولوں میں مدّرس رہے

اور ہندو، مسلم، سبھی طبقوں میں بے حد ہر دل عزیز تھے۔

انہوں نے کئی ممالک کی سیاست کی تھی اور اپنی حج کی زیارت کا سفر نامۂ حج بھی تحریر کیا تھا۔ اردو میں کئی کتابیں، کتابچے اور پمفلٹ شائع کیے۔ ''خدا کی ہستی'' کے نام سے ایک کتاب بچوں کے لیے بھی لکھی تھی جس کی زبان نہایت سادہ و سلیس ہے۔

1938ء میں رمضان کی 20 تاریخ کو ان پر فالج کا حملہ ہوا اور اگلی صبح وہ لقمۂ داعی اجل ہو گئے۔

خواجہ غلام السیّدین (16 اکتوبر 1904ء پانی پت تا 19 دسمبر 1971ء دہلی):

پانی پت کے محلّہ سادات میں خواجہ غلام الثقلین کے ہاں تولد ہوئے جو مولانا حالؔی کی ہمشیرہ وجیہہ النساء کے نواسے تھے اور خواجہ غلام الحسنین اور خواجہ غلام السبطین کے بھائی تھے۔ مولانا حالؔی سے خواجہ غلام السیّدین کا ایک اور رشتہ بھی تھا کہ ان کی والدہ بیگم مشتاق فاطمہ، خواجہ اخلاق حسین کی بیٹی اور مولانا حالؔی کی پوتی تھی۔ معروف ادیبہ، بیگم صالحہ عابد حسین آپ کی سگی بہن تھیں۔

انہوں نے اپنی تعلیم، پانی پت، علی گڑھ اور انگلستان کی ''لیڈز یونیورسٹی'' سے حاصل کی اور ایم اے اور ایم ایڈ کی اسناد سے سرفراز ہوئے۔ آپ بہ یک وقت ایک ماہرِ تعلیم، شعلہ نوا خطیب اور اعلیٰ پائے کے ادیب تھے۔ اپنی ذہانت اور محنتِ شاقہ سے خاندان حالؔی کی علمی وجاہت اور تعلیمی اقدار کو آگے بڑھانے میں ایک اہم رول ادا کیا اور بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ وہ کئی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر مامور رہے اور آپ کی تعلیمی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت ہند نے آپ کو ''پدم بھوشن'' کے خطاب سے نوازا تھا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی تھی۔

اپنی لاتعداد کتابوں اور مضامین میں اُنھوں نے مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے، ادب و فلسفہ، سماجیات، مذہب و اخلاق، تعلیم و نفسیات اور شخصیات وغیرہ لیکن ادب اور تعلیم ان کے خاص میدان تھے۔ انہوں نے افسانے اور انشائیے بھی لکھے اور سوانحی خاکے بھی، ریڈیائی تقریریں اور کتابوں پر تبصرے، مقدمے اور تنقیدی مضامین بھی۔ آپ کی تصنیفات میں متعدد سیاسی اور علمی شخصیات پر مضامین کا مجموعہ ''آندھی میں چراغ'' اور ایک کتاب ''روحِ تہذیب'' کے علاوہ خود نوشت سوانح عمری بھی تھی جسے ان کی وفات کے بعد ان کی ہمشیرہ بیگم صالحہ عابد حسین نے ترتیب دے کر ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'' کے نام سے شائع کروایا تھا۔ یہ سوانح عمری ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں اور ان کی شخصیت کے گُوناگوں پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے بے حد معاون ہے۔

بیگم صالحہ عابد حسین (18 اگست 1913ء پانی پت تا 9 جنوری 1988ء دلّی):

اصل نام صالحہ بیگم (یا مصداق فاطمہ) تھا۔ آپ خواجہ غلام الثقلین کی دُختر نیک اختر تھیں جو مولانا حالؔی کے بیٹے خواجہ اخلاق حسین کے داماد تھے یعنی صالحہ بیگم کی والدہ بیگم مشتاق فاطمہ خواجہ اخلاق حسین کی بیٹی اور مولانا حالؔی کی پوتی تھیں۔ صالحہ بیگم سے مولانا کا ایک اور رشتہ بھی تھا کہ ان کے والد خواجہ غلام الثقلین مولانا حالؔی کی ہمشیرہ وجیہہ النساء کے نواسے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی بعد میں علی گڑھ مسلم گرلز اسکول میں چند سال گزارے اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ 1932ء میں عظیم دانش ور ماہر تعلیم ڈاکٹر عابد حسین کی شریک حیات بنیں تو بیگم صالحہ عابد حسین بن گئیں۔

ادبی زندگی کا آغاز 1921ء میں ہوا جب ان کا پہلا افسانہ رسالہ ''نور جہاں'' میں شائع ہوا۔ اُس وقت ان کی عمر محض آٹھ سال کی تھی۔ ان کی پچپن (55) مطبوعہ کتابیں ہیں جن میں افسانوی مجموعے بھی ہیں، ناول اور سفر نامے بھی۔ اور ''یادگارِ حالؔی'' اور ''ہمارے انیس'' جیسی سوانح عمریوں کے علاوہ ان کی خود نوشت سوانح عمری بھی ہے۔ حالؔی کی طرح بیگم صالحہ عابد حسین کے کردار اور ان کی گفتار میں ہی گہری مناسبت تھی۔ انہوں نے جو کچھ کہا اُس پر خود بھی عمل پیرا ہوئیں اور جو کچھ کیا اُسی کو اپنی تحریروں میں بیان کیا۔ مولانا کی شخصیت کے تمام اوصاف بیگم صالحہ خاتون کی سرشت میں کُوٹ کُوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ وہی سادگی، وہی شرافت، وہی ہمدردی اور دردمندی، وہی حلم و انکسار اور وہی سوز و گداز نہ صرف ان کے اپنے کردار میں موجود تھے بلکہ ان کی تمام تحریروں میں جا بہ جا نمایاں ہیں۔

ان کی مجموعی علمی، سماجی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں 1983ء میں انہیں مرکزی سرکار کی طرف سے پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ وہ اُردو اکیڈمی ''دہلی'' ہریانہ اُردو اکادمی اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی رُکن بھی تھیں۔ معروف ماہرِ تعلیم خواجہ غلام السیّدین آپ کے سگے بڑے بھائی تھے۔

خواجہ احمد عبّاس (7 جون 1914ء پانی پت تا یکم جون 1987ء):

خواجہ احمد عباس کی ولادت پانی پت ہی میں خواجہ غلام السبطین کے یہاں ہوئی تھی۔ مولانا حالؔی سے ان کے تین رشتے تھے:

۱) حالؔی خواجہ احمد عباس کی دادی اُم الحسن کے ماموں تھے (اُم الحسن، حالی کی ہمشیرہ بیگم وجیہہ النساء کی بیٹی تھی)

۲) خواجہ احمد عبّاس کی والدہ مسرور خاتون (مسرورۃ النساء) خواجہ سجاد حسین کی بیٹی ہونے کے ناتے مولانا حالؔی کی پوتی تھی، اور

۳) خواجہ احمد عبّاس کی خوش دامن صاحبہ بیگم صدیقہ النساء بھی مولانا کے دوسرے بیٹے اخلاق حسین کی بیٹی ہونے کی نسبت سے حالؔی کی پوتی تھی۔

ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ پھر پانی پت کے مسلم اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کے ہائی اسکول سے امتیاز کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسی یونیورسٹی کے انٹر کالج میں داخل ہو گئے جہاں انہیں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے اظہار کا خوب موقع ملا اور بہت جلد وہ ایک ماہر مقرّر بن گئے۔ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں پر اُنہیں یکساں قدرت حاصل تھی۔ بعد میں اُنہوں نے بی۔ اے۔ اور وکالت کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ان کے والد انہیں ایک کامیاب وکیل بنانا چاہتے تھے لیکن انہیں طالب علمی ہی

کے زمانے سے اخبار نویسی کا شوق تھا۔ انہوں نے علی گڑھ سے ''علی گڑھ میل'' نام سے انگریزی میں اخبار جاری کیا جو کافی مدت تک چلتا رہا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ بمبئی چلے گئے اور وہاں سے انگریزی میں شائع ہونے والے اخبار ''بمبئی کرانیکل'' میں ملازم ہوگئے۔ 1947ء میں وہ ہفت روزہ بلٹز (Biltz) سے وابستہ ہوگئے اور زندگی کے آخری دن تک اس ہفت روزہ کا آخری صفحہ لکھتے رہے جس کا قارئین کو بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔

1937ء کے آس پاس اُنھوں نے اپنی پہلی کہانی ''ابابیل'' کے نام سے لکھی جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماہ نامہ ''جامعہ'' میں شائع ہوئی۔ اس کہانی کا ترجمہ اب تک دنیا کی 16 مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ 1975ء میں ''انقلاب'' کے نام سے انہوں نے ایک ناول لکھا جو پہلے روس میں شائع ہوا پھر جرمنی میں اور بالآخر بھارت میں۔ 24/25 سال کی عمر میں انہوں نے سمندری جہاز سے پانچ مہینے تک سترہ ممالک کی سیاحت بھی کی تھی اور واپس آنے پر ''مسافر کی ڈائری'' کے نام سے اپنا سفر نامہ لکھا جسے 1940ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا تھا۔

خواجہ صاحب پچاس سال تک فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے اور اس دوران میں انہوں نے نہ صرف کئی مشہور اور کامیاب فلموں کی کہانیاں لکھیں بلکہ کئی فلمیں خود ڈائریکٹ اور پروڈیوس بھی ہیں۔ 1967ء میں ان کی فلم ''شہر اور سپنا'' کے لیے صدرِ جمہوریۂ ہند کی طرف سے ان کی پذیرائی کی گئی۔ رُوس سرکار نے انہیں ''لینن پیس پرائز (Lenon peace prize) سے بھی نوازا تھا۔ ان کی کہانی فلمی ہو یا کتابی وہ اس میں ہمیشہ تعمیری پہلو لاتے تھے۔ وہ بے خوف اور نڈر صحافی اور ادیب تھے اور ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کا عنصر بھی نمایاں رہتا تھا۔ ملک کے ذرے ذرے سے انہیں پیار تھا اور انسانیت پر مکمل اعتماد۔ ان کی مجموعی ادبی اور صحافتی خدمات کے لیے مرکزی سرکار کی طرف سے انہیں پدم شری کے خطاب سے بھی نوازا گیا تھا۔ خاندان حالی کا یہ درخشاں ستارہ بہ یک وقت ایک کامیاب افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، ناول نگار، کالم نویس، نامہ نگار و ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک معتبر مکالمہ نگار، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بھی تھا۔

ساجدہ زیدی (1926ء تا 9 مارچ 2011ء دہلی)

حالی خاندان کی یہ چشم و چراغ ایک معروف شاعرہ، ڈرامہ و ناول نگار اور یک معتبر محقق تھیں۔ آپ مولانا حالی کی نواسی اور خواجہ غلام السیدین و بیگم صالحہ عابد حسین کی ہمشیرہ، بیگم مختار فاطمہ کی دُختر نیک اختر تھیں اور ممتاز شاعرہ و نثر نگار پروفیسر زاہدہ زیدی کی بڑی بہن تھیں۔ آپ کے شریک حیات پروفیسر قیصر حسن زیدی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لیکچرار اور پھر رجسٹرار بھی رہے تھے۔

آپ نے یونیورسٹی آف لندن کی انسٹی چیوٹ آف ایجوکیشن سے ایم فل کی سند حاصل کی اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر تعینات رہیں جہاں کے شعبۂ تعلیم سے آپ 1986ء میں ریٹائر ہوئیں۔ اس ملازمت سے سُبک دوش ہونے سے قبل آپ ''یونیورسٹی گرانٹس کمیشن'' (UGC) کی رُکن بھی رہی تھیں۔

آپ کے شعری مجموعوں میں ''جوئے نغمہ''، ''آتشِ سیّال''، ''سیلِ وجود''، ''آتشِ زیرپا'' اور ''پردہ ہے ساز کا'' کے نام قابل ذکر ہیں۔ ''سرحد کوئی نہیں'' کے نام سے ایک منظوم ڈرامہ بھی آپ کی تصانیف میں شامل ہے۔ نثر میں بھی دو مجموعہ ہائے مضامین ''تلاش بصیرت'' اور ''گزرگاہِ خیال'' دو ناول ''موج ہوا'' اور ''مٹی کے حرم'' کے علاوہ آپ نے ''نوائے زندگی'' کے نام سے اپنی خودنوشت سوانح عمری بھی تیار کر لی تھی جسے ان کی وفات کے بعد اب آپ کی بیٹی زویا زیدی شائع کروا رہی ہے۔

آپ کی مجموعی ادبی و علمی خدمات کے اعتراف میں آپ کو دلّی اُردو اکادمی، یوپی اُردو اکادمی اور بہار اُردو اکادمی کی طرف سے ایوارڈز و اعزازات سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔

زاہدہ زیدی (4 جنوری 1930ء میرٹھ تا 11 جنوری 2011ء علی گڑھ)

پروفیسر زاہدہ زیدی کی والدہ بیگم مختار فاطمہ زیدی، مولانا حالی کے بیٹے خواجہ اخلاق حسین کی نواسی تھیں۔ اور آپ کے نانا خواجہ غلام الثقلین بھی مولانا کی ہمشیرہ بیگم وجیہہ النساء کے نواسے تھے۔ گویا علم و داب کی دولت آپ کو وراثت میں ملی تھی۔ آپ نے پانچویں جماعت سے آٹھویں کلاس تک کی تعلیم پانی پت ہی میں حاصل کی پھر 1942ء سے 1947ء تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہیں جہاں سے آپ نے بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے (انگریزی ادب) کی اسناد حاصل کیں۔ 1958ء میں آپ نے ''یونیورسٹی آف کیمبرج'' سے بھی انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا اور تعلیم و تدریس کے سلسلے میں تین سال تک دلّی یونیورسٹی کے مرانڈہ ہاؤس میں انگریزی ادب کی لیکچرار رہیں لیکن بعد ازاں زیادہ تر عرصہ علی گڑھ یونیورسٹی ہی میں گذارا جہاں سے آپ انگریزی ادب کی پروفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئیں۔

اُردو میں شعر گوئی کے علاوہ آپ نے کئی ڈرامے اور ناول تحریر کیے۔ آپ نے کئی کتابوں کے انگریزی سے اُردو اور اُردو سے انگریزی میں ترجمے بھی کیے تھے۔ شاعری، تنقید، اور ڈراموں کی پانچ انگریزی کتابوں کے علاوہ اُردو میں آپ کے چار شعری مجموعے، چار، ڈراموں کی کتابیں، چار مغربی ڈراموں کے ترجمے، ایک ناول اور تین تنقیدی مضامین کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مختلف ادبی اور قومی اداروں کی طرف سے آپ کو کئی انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا تھا۔ آپ امریکا، کینیڈا، افریقہ، انگلینڈ، رُوس اور دبئی وغیرہ کئی ممالک کی سیاحت کر چکی تھیں اور ان میں سے زیادہ تر سفر علمی و ادبی نوعیت کے تھے۔

سیّدہ سیّدین حمید (یکم اکتوبر 1942ء کشمیر۔۔۔)

آپ معروف ماہر تعلیم خواجہ غلام السیّدین (مرحوم) کی دُختر نیک اختر ہیں۔ آپ نے دلّی یونیورسٹی سے بی۔ اے، امریکا کی ''ہوائی یونیورسٹی'' سے ایم۔ اے، اور کینیڈا کی ''البرٹا یونیورسٹی'' سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی اسناد حاصل کیں اور 1965ء سے 1967ء تک دلّی کے سری رام کالج میں لیکچرار رہیں۔ اس

باقی صفحہ ۱۲۲ پر ملاحظہ فرمایئے

ورثہ

ہندکو رنگ

''تار تار، ستار ستار بولے
نہ بے تار ستار دی تار بولے
تار تار سائیاں لگا تار بولے''
اوساز بے سوز بی ساز نئیں گا
جزے سُر چ درد نہ پیار بولے

قصّہ خوانی، تحصیل گھنٹہ کہار دی اے
اصل رونق تا چوک یادگار دی اے
گلی گلی، سائیں سرکار دی اے
یاد آئی احمد علی سائیںؒ دی وت
میری ماں بولی متّوں پکار دی اے

ع عشق نال سائیںؒ دے لا بیٹھے
اپڑا آپ بی ہنڑ تا بھلا بیٹھے
اُڈی راہ چ اکھیاں وچھا بیٹھے
ہری پُور اچ سخنوراں دے نال
حضرت سائیںؒ دی محفل چ آ بیٹھے

اے نگری سکون سلطان نی اے
عملداری بی حیدر زمان نی اے
ڈاہڈی چاشنی ہزارہ زبان نی اے
اے شہر قتیل شفائی نا اے
یاد دلے چ اوس ہندکو وان نی اے

یونس صابر (پشاور)

سُکھ دی نیند''

سُکھ دی نیند رسَوں
طوطیاں دے نل
مٹھیّاں مٹھیاں گلاں کر کے
گوڈیاں بھر نے رِڑھدے بالاں دے لئی
گھوڑا بن کے
بڈھڑیاں دی سوٹی پھڑ کے
اک دو جی نل
گل وکڑی پاؤندیاں
کالیاں روحاں والیاں سڑکاں پار لنگھا کے
جیکر خوشیاں لبھن، لے لئیں
ایس تو وکھّ وی
کھُونجیاں دے نل گلیاں۔
ڈریاں سہمیاں
نِکیاں نِکیاں اوہ خوشیاں وی
جنہاں نوں
دُوجے لوکیں
بکار سمجھ کے اکھّوں اوہلے کے جاندے نیں
نال اونہاں دے چوہلاں کر کے
کھِڑکھِڑ ہس کے
سنگ اونہاں دے۔
ماہیے پٹّے گا کے
دُکھّاں دے پنڈے تے
کُتکتاریاں کڈھ کے
بے فکری دے جھولے اندر
سُکھّ دی نیند رسَوں لئیں سجناں
سکھ دی نیند رسَوں

حنیف باوا
(جھنگ)

ایک صدی کا قصہ
شوکت حسین رضوی

دیپک کنول
(ممبئی، بھارت)

جب بھی میں ماضی کے شبستانوں میں سے یادوں کے جگنو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں تو ایک جگنو بار بار میری گرفت سے چھوٹ جاتا ہے۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے برق جیسی چمک پیدا کر کے اُڑ جاتا ہے اور میں بس آنکھیں مل کے رہ جاتا ہوں۔ اعظم گڑھ کا یہ جگنو! جی ہاں میں اُسی جگنو کی بات کر رہا ہوں جسے ہم سب سعید شوکت حسین رضوی کے نام سے جانتے ہیں۔ شوکت حسین رضوی کا جنم سن 1914 میں اعظم گڑھ (یو۔پی) کے ایک معزز سید خاندان میں ہوا۔ چھٹ پنے کے دنوں میں ہی اُس نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کے ساتھ ''مدن تھیٹرس'' کی زیارت کی۔ بعد میں تھیٹر سے ہی اُسنے اپنے فلمی سفر کی شروعات کی۔ 1930 میں جب کہ وہ بالی عمر میں تھا اُسنے کلکتہ کے ایک سینما تھیٹر میں اسسٹنٹ پروجیکشنسٹ (تھیٹر میں فلم چلانے والا) کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ وہ جتنے دن اس تھیٹر میں کام کرتا رہا اُس نے فلم کی کانٹ چھانٹ کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ بہت جلد اُسے ''مدن تھیٹرس'' میں ایڈیٹنگ کے شعبے میں نوکری مل گئی۔ یہ اُسکی خوش قسمتی تھی کہ اُسے اُس وقت کے جانے مانے یہودی ایڈیٹر عذرا میر کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا۔ عذرا میر کے ساتھ رہ کر اُسے کافی استفادہ ہوا۔ اُسنے فلم سازی کی باریکیوں کی بھرپور جانکاری حاصل کی۔۔ ایسے مہارتھیوں کے ساتھ رہنے سے شوکت حسین رضوی کی زندگی یکسر بدل گئی۔ یہ لوگ ڈسپلن کے بڑے پابند تھے۔ ان لوگوں کی صحبت میں رہ کے وہ نہ صرف سینما کے لوازمات کو سمجھ گیا بلکہ اُن پر سچے دل سے عمل بھی کرنے لگا۔

شوکت حسین رضوی بڑا ہی پروجیہہ اور قد آور نوجوان تھا۔ وہ جتنا خوش رو تھا اتنا ہی خوش پوش بھی تھا۔ وہ جب کسی محفل میں شرکت کرتا تھا تو دیکھنے والے اُسے بس دیکھتے رہ جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ عمدہ قسم کی پوشاک پہنا کرتا تھا جسکی وجہ سے وہ لوگوں کی نظر میں رہتا تھا۔ ایک بار مشہور سرمایہ کار اور فلم ساز سیٹھ دلسکھ رائے پنچولی کی نظر اُس پر پڑی۔ اُسنے اُسے اپنی فلم ''خزانچی'' کا ایک گانا ''کیسے یہ نظارے ہیں'' ایڈیٹ کرنے کو کہا۔ اُسنے گانا جب ایڈیٹ کر کے سیٹھ پنچولی کو دکھایا تو پنچولی سیٹھ اُس کے کام سے اتنا خوش ہوا کہ وہ اُسے کلکتہ سے لاہور لے آیا اور اُسے اپنی فلموں کا ایڈیٹر بنا دیا۔ 1939 میں اُسنے فلم ''گل بکاولی'' اور 1941 میں اُسنے فلم ''خزانچی'' کی ایڈیٹنگ کی۔ شوکت حسین رضوی سیٹھ پنچولی کا چہیتا بن چکا تھا۔ وہ اکثر پنچولی کی فلموں کے سیٹ پر آیا جایا کرتا تھا۔ فلم ''گل بکاولی'' میں نور جہاں کام کر رہی تھی۔ شوکت حسین رضوی پہلی ہی نظر میں نور جہاں پر فدا ہو گیا البتہ یہ جان کر اُسے کافی مایوسی ہوئی کہ نور جہاں کے دل کے سنگھاسن پر پہلے سے ہی کوئی اور بیٹھا ہوا تھا۔ کئی فلموں کی ایڈیٹنگ کرنے کے بعد سیٹھ پنچولی اُس پر اتنا مہربان ہوا کہ اُسنے اپنی اگلی فلم ''خاندان'' کے ڈائرکٹر کے طور پر شوکت رضوی کو چنا۔ اس فلم میں ہیروئن کے طور پر نور جہاں کو چنا گیا۔ فلم بندی کے دوران شوکت حسین رضوی نور جہاں کے دل میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ فلم 1942 میں ریلیز ہوئی اور اس فلم نے ہر طرف دھوم مچا دی۔ اس فلم سے دو ستاروں کا جنم ہوا۔ ایک تھا پران جو بعد میں بدنام زماں ویلن کے طور پر مقبول ہوا۔ (پران اس فلم کا ہیرو تھا) اور دوسری تھی نور جہاں جو راتوں رات لاکھوں کروڑوں دلوں پر چھا گئی تھی۔ نور جہان اس سے پہلے نور جہاں کے نام سے کئی فلموں میں چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر کام کر چکی تھی اور ساتھ ہی کئی پنجابی فلموں میں بھی اُس نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے لیکن ہندوستانی زبان میں بننے والی ''خاندان'' پہلی فلم تھی جس میں وہ بطور ہیروئن جلوہ افروز ہو رہی تھی۔ اس فلم میں اُسکے مدمقابل غلام محمد تھا اور اس فلم کی موسیقی ماسٹر غلام حیدر نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم نے اُسے ملک گیر شہرت اور عزت بخشی۔ اُسکی تیکھی اداؤں اور جادوئی آواز کے سحر میں سارا ملک ڈوب گیا تھا۔ خود ملکہ نور جہاں اپنے نئے عاشق کے عشق میں گرفتار ہو چکی تھی۔ وہ اپنے پیار کو دنیا کی نظروں سے چھپا کر رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ اُنکے رومانس کی خبریں ادھر اُدھر پھیل چکی تھیں جنہیں وہ جھٹلاتے رہے وہ ''خاندان'' کی بے پناہ کامیابی کے بعد نور جہاں کو لے کر لاہور سے بمبئی چلا آیا۔ بمبئی آ کر نور جہاں کو بی۔ ایم۔ ویاس کی ہدایت کاری میں بننے والی فلم ''دہائی'' میں کام کرنے کی آفر ملی جو اُسنے فوراً قبول کی۔ اس فلم میں اُسے سائڈ ہیروئن کے طور پر لیا گیا تھا۔ اس فلم کے دیگر اداکاروں میں کمار اور شانتا آپٹے کا نام شامل تھا۔ اسی بیچ شوکت حسین رضوی کو فلم ''نوکر'' کی ہدایت دینے کا موقع مل گیا۔ اس فلم کی کہانی اور منظر نامہ سعادت حسن منٹو نے لکھا تھا۔ اس فلم میں بھی نور جہاں کا رول سائڈ ہیروئن کا تھا۔ منظر نامے میں شوکت حسین رضوی کے رد و بدل کی وجہ سے فلم بری طرح فلاپ ہو گئی۔

اس فلم کے فلاپ ہونے سے نور جہاں کے کیریئر پر کوئی اثر نہ پڑا۔ نور جہاں چاہے ہیروئین تھی یا سائڈ ہیروئن اس کا ایسا غلغلہ تھا کہ وہ ہیروئن سے بھی زیادہ معاوضہ وصول کرتی تھی۔ اسی سال یعنی 1943 میں نور جہاں پر قسمت کی دیوی مہربان ہو گئی جب ضیا سرحدی نے اُسے اپنی فلم ''نادان'' کے لئے سائن کیا۔ اس فلم میں وہ ہیروئن کے ساتھ گلوکارہ بھی تھی۔۔ پہلے وہ جن

خبروں کو جھٹلاتے رہے، اب وہ اعتراف کرنے لگے۔ اسی سال یعنی سن 1944 میں شوکت حسین رضوی نے نور جہاں سے شادی کر ڈالی۔

یہ شادی دونوں کے لئے بڑی مبارک ثابت ہوئی۔ نور جہاں کا ڈنکا ہر اُور بجنے لگا تھا۔ اُسنے سن 1944 میں دو فلمیں کیں۔ ''دوست'' اور ''لال حویلی''۔ فلم ''دوست'' کے ڈائرکٹر شوکت حسین رضوی تھے جس میں اُس نے ہدایت کاری کے علاوہ نور جہاں کے بھائی کا ایک چھوٹا سا رول بھی ادا کیا تھا۔ 1945 میں نور جہاں نے چھ فلموں میں کام کیا۔ ان میں شوکت حسین کی فلم ''زینت'' بھی شامل تھی۔ اس فلم میں نور جہاں کی بے مثال اداکاری کی وجہ سے فلمی تنقید نگاروں نے اسے اُس سال کی اول درجے کی فلم قرار دیا۔ پہلی بار اس فلم میں قوالی کا استعمال کیا گیا۔ ''آہیں نہ بھریں، شکوے نہ کئے، کچھ بھی نہ نظر سے کام لیا۔'' جیسی قوالی نے دھوم مچادی تھی۔ اس فلم کے گانے سر چڑھ کے بول رہے تھے۔ نور جہاں لاکھوں جوان دلوں کی دھڑکن بن کے رہ گئی تھی۔ اُسی سال اُس نے ماسٹر وناٹک کی زیر ہدایت بننے والی فلم ''بڑی ماں'' میں ایک کلیدی رول ادا کیا۔ اس فلم کی خاص بات یہ تھی کی اس میں مشہور کتھک ڈانسر ستارہ دیوی کے علاوہ لتا منگیشکر نے چائلڈ ایکٹرس کے طور پر کام کیا تھا۔ اس فلم کے گانوں نے بھی خوب دھوم مچائی۔ ''دیا جلا کے آپ بجھائے'' جیسا صدا بہار گانا اسی فلم کا ہے جو نور جہاں کے یادگار اور بے مثال گانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شوکت حسین رضوی نے بمبئی منتقل ہونے کے فوراً بعد ''شوکت آرٹ پروڈکشن'' کے نام سے ذاتی فلم کمپنی شروع کی تھی۔ اسی بینر کے تحت اُنہوں نے فلم ''جگنو'' شروع کی۔ اس فلم میں ایک شرمیلے اداکار دلیپ کمار کو ہیرو کے طور پر لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ گو کہ دلیپ کمار کی فلم ''ملن'' خوب چلی تھی مگر دلیپ کمار کو وہ مقام نہ ملا تھا جس کے وہ حقدار تھے۔ یہ فلم 1947 میں بن کر ریلیز ہوگئی۔ نور جہاں کے لئے یہ ایک یادگار سال تھا۔ ''جگنو'' اُس سال کی سب سے بڑی ہٹ فلم ثابت ہوئی

دلیپ کمار فلمی اُفق پر ایک درخشاں ستارہ بن کر چمک اُٹھا تھا۔ یہ نور جہاں اور دلیپ کمار کی پہلی اور آخری فلم تھی۔ اس فلم میں نور جہاں نے محمد رفیع کے ساتھ پہلا اور آخری دوگانا ''یہاں بدلہ وفا کا'' گایا تھا۔ اس دوگانے کے بعد ان دونوں نے پھر کبھی ایک ساتھ نہیں گایا۔ اس فلم کے موسیقار فیروز نظامی تھے جو بعد میں کئی پنجابی فلموں کی موسیقی دینے کے بعد گم نامی کی دھول میں کہیں کھو کر رہ گئے۔ دلیپ کمار کے ساتھ بھی فلم ''جگنو'' کے بعد دونوں نے دوبارہ ساتھ میں کام نہیں کیا۔ اس دوران نور جہاں کے تین بچے ہوئے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی، جن کے نام اکبر حسین رضوی، اصغر حسین رضوی اور ظل ہما تھا۔ ظل ہما سب سے چھوٹی تھی۔

اسی بیچ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ پنجاب کی دھرتی انسانی لہو سے لال ہوگئی۔ ہزاروں لاکھوں لوگ اُجڑ گئے۔ اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ ایسی آپا دھاپی مچی، ایسا قہر برپا ہوا کہ خدا کی پناہ۔ پاکستان وجود میں آچکا تھا۔ شوکت حسین رضوی اپنا سب کچھ یہیں پر چھوڑ کر اپنی بیگم اور تین بچوں کیساتھ بمبئی کو خیر باد کہہ کے لاہور چلا گیا۔ وہ اپنے ساتھ فقط وہ فلم کیمرہ لے کر گیا جس سے فلم ''جگنو'' کی عکس بندی ہوئی تھی۔ بعد میں یہ کیمرہ اُسکے بیٹے نے لبرٹی مارکیٹ کے ایک ریستوران مالک کو دان کر دیا جس نے اس کیمرہ کو اپنے ''سولو'' ہوٹل کی لابی میں آنے جانے والے سیاحوں کے دیدار کے لئے سجا کے رکھ دیا۔ ہر روز لوگ اس کیمرہ کا دیدار کرنے چلے آتے تھے۔

لاہور میں بس جانے کے بعد شوکت حسین رضوی اور نور جہاں نے فلموں سے تین سال کا سنیاس لے لیا۔ پاکستان میں بسنے کے بعد اُسکی سب سے بڑی آرزو یہ رہی کہ وہ ایک اسٹوڈیو کا مالک بنے۔ مالک نے اُسکی سن لی۔ شوکت حسین رضوی نے بہت ساری جائیداد خرید لی جس میں آتش زدہ ''شوری اسٹوڈیو'' بھی شامل تھا جو کہ ایک کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ملتان روڈ لاہور میں واقع اس اسٹوڈیو کی جگہ شوکت حسین رضوی نے ''شاہ نور اسٹوڈیو'' کھڑا کر دیا اور اس اسٹوڈیو کو جدید ترین ساز و سامان سے آراستہ کیا۔ یہ پاکستان کا سب سے بڑا اسٹوڈیو تھا۔

1951 میں اُس نے اپنی پہلی پنجابی فلم ''چن وے'' بنانے کا اعلان کیا۔ اس فلم میں وہ فلم ساز اور معاون ہدایت کار کے طور پر پیش ہوئے۔ پس پردہ ہدایت کاری کا سارا کام وہی کرتے رہے۔ زبان کی سمجھ نہ ہونے کے باعث اُنہیں کسی باہر کے ڈائرکٹر کی خدمات لینی پڑیں۔ اس فلم کے کریڈٹس میں اُن کا نام ڈائرکٹر کے طور پر نہیں تھا۔ یہ فلم بے حد کامیاب رہی۔ اس فلم کا گانا ''وے منڈیا سیال کوٹیا'' پاکستان کی گلی گلی میں مشہور ہو گیا تھا۔

''شاہ نور'' اسٹوڈیو مالک کی غفلت کی وجہ سے اپنا نور کھوتا جا رہا تھا۔ شوکت حسین رضوی اور نور جہاں کے ازدواجی رشتوں میں دراڑ پڑ گئی تھی۔ اس کی وجہ اکثر لوگ اُس وقت کے مشہور کرکٹر نذر محمد سے نور جہاں کا عشق بتلاتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے جس کے راوی عزیز دوست اور مدیر چہارسُو گلزار جاوید ہیں۔ بقول گلزار جاوید دو دہائی قبل جب انہوں نے ''روپ رمنے'' کے تحت چہارسو کے لیے اپنے دور کے خوبرو کرکٹر مقصود احمد المعروف مَیری میکس سے انٹرویو کے دوران نور جہاں اور نذر محمد کے معاشقے کی تفصیل جاننا چاہی تو مقصود احمد نے بتلایا کہ نور جہاں کا نذر محمد سے نہیں بلکہ اُن سے Affair تھا۔ نذر محمد اُن کا پیغام لے کر نور جہاں کے گھر گئے تو نور جہاں کے شوہر شوکت حسین رضوی کی آمد سے گھبرا کر کھڑکی سے چھلانگ لگا بیٹھے جس کے باعث اُن کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی اور یار لوگوں نے نور جہاں سے اُن کے عشق کے چرچے عام کر دیے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب نور جہاں شہرت کی معراج پر تھی۔ اُسے ایک کامیاب اداکارہ اور گلوکارہ کے ساتھ ساتھ ایک بیوی اور ماں کا رول بھی ادا کرنا

پڑ رہا تھا جو ممکن نہ تھا۔ شوکت حسین کے ساتھ آئے دن کسی نہ کسی بات کو لے کے تو بہ تکرار چلتی ہی رہتی تھی۔ شوکت اسی ذہنی تناؤ کی وجہ سے کسی بھی چیز پر دھیان نہیں دے پا رہا تھا۔ اُسنے اپنی اگلی فلم کے لئے پاکستان کے جانے مانے ڈرامہ نگار امتیاز علی تاج کو ہدایت کاری کی ذمہ داری سونپی اور تاج کی ہدایت میں فلم ''گلنار'' بنی جو خوب چلی پر فلم ساز کو کوئی خوشی نہ دے سکی۔ فلم کی کامیابی کے ساتھ ہی شوکت کی زندگی میں ایک طوفان آ گیا۔ نور جہاں اُسکی زندگی سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ رشتوں میں نہ وہ نفاست رہی تھی نہ وہ گرماہٹ۔ اس لئے وہ شوکت رضوی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الگ ہو گئی۔ نور جہاں نے اپنی بیٹی کو اپنے تفویض میں لینے کے لئے ''شاہ نور اسٹوڈیو'' کے اپنے سارے شیئر ایس ایچ رضوی کو بیچ ڈالے۔ اس قدم سے شوکت حسین رضوی کی ساکھ کو کافی نقصان پہونچا اور اُسکی زندگی تلپٹ ہو کے رہ گئی۔ ملکہ ترنم نور جہاں کی شہرت کا نور اس قدر پھیل چکا تھا کی شوکت حسین رضوی کی ذات اس چکا چوند میں کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ چیز بھی اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ جب وہ پوری طرح سے ٹوٹ چکا تھا ایسے میں نور جہاں کا شوکت حسین رضوی سے الگ ہونا، رضوی کے لئے سم قاتل ثابت ہوا۔

نور جہاں سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد شوکت حسین رضوی نے ایک اُبھرتی اور باصلاحیت اداکارہ یاسمین سے دوسری شادی کی جو کہ پہلے سے شادی شدہ تھی۔ اُسکے پہلے شوہر کا نام جعفر شاہ بخاری تھا۔ وہ اپنے پہلے شوہر سے خوش نہیں تھی اسلئے اُس سے طلاق لے کے یاسمین نے شوکت حسین رضوی سے دوسری شادی کر ڈالی۔ یاسمین سے دو بیٹے ہوئے جن کے نام شہنشاہ حسین رضوی اور علی مجتبیٰ رضوی ہے۔ اُن کی یہ شادی بیحد کامیاب رہی۔ اس دوران اُس نے تین اُردو فلمیں بنائیں۔ ''جانِ بہار''، ''عاشق'' اور ''دلہن رانی''۔ فلم ''جان بہار'' کے لئے وہ ایک گانا ملکہ ترنم سے گنوانا چاہتا تھا۔ یہ بات جب نور جہاں کو معلوم پڑی تو اُس نے ایک پیشہ ور فن کارہ کی مثال پیش کر کے پرانی تلخیوں کو بالائے طاق رکھ کر فلم کے لئے گانا گانے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس فیصلے سے شوکت حسین کا دل باغ باغ ہوا اُٹھا۔ فلم کا گانا ریکارڈ ہوا اور بعد میں یہ گانا فلم کی ہیروئن مسرت نذیر پر فلمایا گیا۔ یہ گانا ''کیسا نصیب لائی تھی'' پورے پاکستان میں دھوم مچا گیا۔

پاکستان میں رہ کے شوکت حسین رضوی کو وہ کامیابی پھر کبھی نصیب نہ ہو سکی جو اُسے ہندوستان میں رہ کے ''زینت'' اور ''جگنو'' بنا کے ملی تھی۔ ہندوستان کی فلمی صنعت میں ایک انقلاب آ گیا تھا۔ یہاں کی فلمی صنعت ارتقائی بلندیوں کو چھو رہی تھی جب کہ پاکستان کی فلم انڈسٹری کافی پیچھے تھی۔ اس میں قصور فلم انڈسٹری کا نہیں بلکہ معاشی دقتوں کا تھا جن پر قابو پانا کسی فرد واحد کے بس کی بات نہ تھی۔ ہندوستانی فلمی صنعت جس طرح پھل پھول رہی تھی اُسکے پیچھے پھیلی ہوئی، وسیع مارکیٹ تھی جب کہ پاکستان میں بننے والی بیشتر فلمیں اُس پائے کی نہیں تھیں اور ساتھ ہی محدود ناظرین اور مناسب پبلیسٹی نہ پانے کی وجہ سے یہاں کی فلمیں ناکامی سے ہمکنار ہونے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں فلم سے متعلق سارے ٹیکنیشن اور اداکار ہندوستان کے حصے میں آ گئے تھے جب کہ پاکستان میں گنتی کے ٹیکنیشن اور اداکار رہ گئے تھے۔ فلموں میں سرمایہ لگانے والے دھنا سیٹھ بھی ہندوستان میں ہی رہ گئے تھے۔ ان ساری مشکلوں کے باوجود پاکستانی فلمی صنعت نے اپنا وجود برقرار رکھا اور وقتاً فوقتاً اچھی فلمیں پیش ہوتی رہیں۔

شوکت حسین رضوی کی آخری فلم ''دلہن رانی'' تھی جو چل نہیں پائی۔ اس فلم کی ناکامی کے بعد شوکت حسین رضوی کا دل ٹوٹ کے رہ گیا۔ اُسنے فلموں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنیاس لے لیا۔ اُسنے ''شاہ نور اسٹوڈیو'' کی دیکھ ریکھ کا ذمہ اپنے چار بیٹوں کو سونپ دیا۔ وہ بھی اسٹوڈیو کے لئے کچھ بہتر نہ کر سکے۔ اس اسٹوڈیو کا تیس فیصد حصہ زیر استعمال ہے باقی کا حصہ ویران پڑا رہا۔ شوکت حسین رضوی 1999 میں پچاسی سال پورے کرنے کے بعد اس جہاں فانی سے کوچ کر گیا۔ رضوی کے بارے میں سعادت حسین منٹو نے اپنی ایک کتاب میں رضوی کا ذکر یوں کیا تھا۔ ''میں 1940 میں شوکت حسین رضوی سے ملا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا، خوب رو نوجوان تھا۔ اُس کے گال کشمیری سیب جیسے تھے۔ وہ جان گلبرٹ کی طرح چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھتا تھا۔ اُسکے بال کرلی تھے۔ وہ صاف ستھرے کپڑے پہنتا تھا۔ اُسکے کپڑے ہمیشہ استری کئے ہوتے تھے۔ کیا مجال کہ اُسکے کپڑوں میں ایک بھی سلوٹ کہیں دکھائی دے۔ وہ چلتا بھی تھا تو شہانہ انداز سے۔ اُسے سگریٹ پینے کا بڑا شوق تھا۔ وہ craven A سگریٹ پیتا تھا۔ وسکی میں اُسے ناسک میں بننے والی ''ڈیر برانڈ وسکی'' پسند تھی۔ وہ فٹ بال کا بڑا شوقین تھا۔ 1930 میں جب وہ کلکتہ میں تھا تو میں اُسکے ساتھ فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔''

شوکت حسین رضوی آج ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ موت کے بے رحم فرشتے نے اس ذہین فن کار کو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔ ویسے سب کو جانا ہے۔ موت پہ کس کی رستگاری ہے۔ آج اُنکی تو کل ہماری باری ہے۔

''عوام کا خون''

دولت مندوں اور سرمایہ داروں کی خیرات اور چندہ سے چلنے والی سوسائٹیاں ہمیشہ ان کی طاقت اور ان کے نظام کو قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ وہ جذبات کو ٹھنڈا کرتی رہتی ہیں تا کہ سرمایہ دار عوام کا خون چوستے رہیں۔

(برنارڈ شا)

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید

(راولپنڈی)

عزیز گرامی قدر، خوش رہیے!

میں آپ کو خط لکھ چکا تھا کہ ''چہارسو'' پھر پڑھنے بیٹھ گیا تو مجھے ''چہارسو'' کے بارے میں اپنی پہلی رائے پر پھر ڈٹنا پڑ رہا ہے کہ ''چہارسو'' ایسا پرچہ ہے جس کو کم از کم پاکستان کی ہر لائبریری میں ہونا چاہیے کیونکہ وہ ہر بار ایک تو کسی نہ کسی ادبی شخصیت اور دانشور پر قرطاسِ اعزاز پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تازہ جلد ۲۱ شمارہ جنوری فروری ۲۰۱۲ء میں قرطاسِ اعزاز کے علاوہ دو مضمون مزید کمال کے شامل ہیں اور ان دو مضمونوں میں بھی جو مضمون معروف ہندوستانی اداکار دلیپ کمار عُرف یوسف یا یوسف عرف دلیپ کمار کی سالگرہ پر اپنے ''تخلیقی وجدان'' کے سہارے آپ نے سپردِ قلم کیا ہے اُسکی تو تعریف ہی نہیں ہوسکتی۔ ہندو پاک کا کون آدمی ہے جو بالی وڈ کے اداکاروں اور اداکاراؤں سے ملنا نہیں چاہتا اُن کے بارے میں مزید کچھ جاننا نہیں چاہتا آپ نے عام آدمی کیا اتنی اہم ضرورت کو اس خوبی سے پورا کیا ہے کہ وہی بات اُس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ واضح رہے میں نے جو عام آدمی کی بات کی ہے اُس میں ہر عالم و دانشور اور چھوٹا بڑا آدمی شامل ہے۔ اداکاری ایک ایسا عمل ہے جو ایک شخص کو ہزار بلکہ بے شمار انداز میں پبلک کے سامنے دکھاتا ہے جس کے باعث وہ اداکار شخص ایک طرح ہر عام آدمی کا محبوب بن جاتا ہے۔

چنانچہ آپ نے اپنے لاجواب مضمون میں بالی وڈ کا ایسا کونسا معروف اداکار ہے جس کو ایسے بے ساختہ انداز میں پیش نہیں کیا کہ یوں لگتا ہے جیسے ہم آپ کا مضمون نہیں پڑھ رہے ہیں اُس اداکار سے بے تکلفی کے ساتھ ملاقات کر رہے ہیں۔ آپ ممبئی گئے ہیں آپ نے فلم بھی بنائی آپ مختلف اداکاروں اور اداکاراؤں سے ملے بھی لیکن شاید آپ یہ سُن کر حیران ہوں فلم بنانے کے علاوہ باقی سارے کام میں نے بھی کئے ہیں۔ دسمبر ۱۹۴۳ء میں میری شادی بمبئی میں ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں اُس وقت کے بڑے بڑے اداکاروں اور اداکاراؤں سے میں بھی ملا۔ اُس زمانے کے مشہور نغمہ نگار شاعر آرزو لکھنوی سے بھی سہراب موی ٹون میں ملاقات فرمائی وہیں تان سین والی معروف گلوکارہ و اداکارہ خورشید کے ساتھ چائے بھی پی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میں نے آپ کی طرح لکھا کچھ نہیں۔ آپ نے تو پھر وہی بات کہ اس مضمون میں کمال سے بھی کچھ زیادہ ہی کام کر ڈالا۔ میں آپ کا مضمون پڑھ رہا تھا لیکن یہ مضمون کیا پڑھ رہا تھا یوں لگ رہا تھا دلیپ کمار ہی سے بار بار نہیں مل رہا ہوں ایتابھ بچن، اُنکی بیوی جیا بہادری کبھی خود دلیپ کمار کی بیوی سائرہ بانو آگے بڑھ کر مہمانوں کا استقبال کر رہی ہیں۔ آپ کی مکالمہ نگاری کا کمال دیکھئے ابھی ایک نوجوان یا جوان سلمان سے مل رہا ہے کہ ایک لمحے میں شاہ رُخ آجاتے ہیں پھر گوندا اور عامر خان بھی آن دھمکتے ہیں۔ اس کے بعد دھرمیندر، شترو گھن سنہا، راجیش کھنہ، جیتندر وغیرہ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے دور کی اداکارائیں بھی تشریف فرما ہیں۔ کیا وحیدہ رحمٰن، کیا ہیما مالنی، کیا ریکھا، کیا کترینہ کیف اور پھر کپور فیملی کی بھی چھوٹی بڑی شخصیات حاضر و ناظر ہو کر اپنے جلوے دکھا رہی ہیں۔ غرض بالی وُڈ کی کونسی بڑی شخصیت اس تقریب میں شامل نہیں۔ سب سے لطف کی بات یہ ہے کہ آپ نے یہ تحریر نہیں لکھی بلکہ قارئین کو ان معروف شخصیات سے بالمشافہ ملا دیا ہے۔ دوسرا مضمون کیدار ناتھ شرما پر جناب دیپک کنول نے بہت عمدہ تحریر کیا ہے۔ اُس کی بے ساختگی دیدنی و شنیدنی ہے۔ کرشن کمار طور سے فون پر ہماری بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ وہ بڑے شاعر اور بڑے انسان ہیں۔ بھائی وہ لاہور آنے کے لیے بڑے بے تاب ہیں جلد کوئی سبیل نکالیئے۔

مشکور حسین یاد (لاہور)

محترم بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

اس بار ''چہارسو'' پڑھنے میں زیادہ لُطف آیا کچھ تو مندرجہ تخلیقات کے سبب اور کچھ ''اے محبت! زندہ باد'' کے ڈرامائی تاثر کے سبب! اس شاہ کار میں جسے آپ نے مشہور شخصیت دلیپ کمار سے اظہارِ عقیدت کے پس منظر میں اپنے وجدان سے ضابطہ تحریر میں لایا ہے آپ کے اندر موجود حسِ مزاح نے شہہ پارہ بنا دیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اپنے تخلیقی ذہن سے جو کام لیا ہے وہ بہت کامیاب ہے۔ مبارکباد!

دیپک کنول جی نے بھی کیدار شرما کے متعلق جو کچھ قلم بند کیا ہے وہ تاریخ سے نکل کر اب ''چہارسو'' کے ذریعے اُس کے قاری کے شعور تک پہنچ گیا۔ اس شمارے کا بہترین افسانہ ''سایوں بھرا دالان'' رہا جس میں یاسین احمد ایک نئے روپ میں دکھائی دیئے۔ صرف جنس کو مرکزی خیال رکھ کر یہ افسانے کو اس طرح لکھتے ہیں کہ جنس کی لذت ان کے بیان میں جا چھپتی ہے اور یہی ایک فن کار کا کمال ہوتا ہے۔ مجھے بہر حال اُن کی افسانہ نگاری کا یہ روپ ہمیشہ پسند آیا ہے۔ دوسرا خوبصورت افسانہ خورشید احمد صدیقی کا ''سعی لا حاصل'' رہا جسے منصف نے بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اب اُس بات کا ذکر جسے سب سے پہلے مجھے لکھنا چاہیے تھا یعنی قرطاس اعزاز کی بھاری بھر کم شخصیت محترم کرشن کمار طور مجھے ایک عرصے سے اُن کی شاعری کا رنگ پسند آتا رہا ہے پھر اِدھر چند سالوں سے طور صاحب بڑی محبت سے اپنا ''سرسبز'' مجھے پابندی سے نہ صرف

ارسال کررہے ہیں بلکہ ''سرسبز'' کا ہرشمارہ کم ازکم میری دوغزلوں کی نمائندگی کرتا ہے۔اُن کی اُردو سے محبت کی یہ عمدہ مثال ہے جس میں دنیا بھر کے شعراء کی نظمیں اورغزلیں موجودرہتی ہیں اُن کے بارے میں ''براہِ راست'' کے ذریعے بہت کچھ معلوم ہوالیکن عشرت رومانی نے ''سینہ ہوا روشن'' میں جس طرح ''عالم عین'' کی شاعری کا جائزہ لیا ہے وہ اُنکی کسی اور جہت کو روشن کررہا ہے اور بہت خوب کررہا ہے۔نجیب عمر کا افسانہ ''سیاہ گلاب'' مختصرلیکن بڑا متاثر کن افسانہ تھا جس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔

غالب عرفان (کراچی)

محترم گلزار صاحب

چہارسو کا تازہ ترین شمارہ جو کرشن کمار طور کے قرطاس اعزاز پر مشتمل ہے نظرنواز ہوا۔اسی کے ساتھ چہارسو کی نئی ویب سائٹ کی نوید بھی ملی۔میں آپ کو اتنے کامیاب شمارے کے اجراء پر مبارکباد دیتا ہوں۔ویب سائٹ تو بہت ہی اچھی اور معلوماتی ہے۔مجھے اس بات پر فخر ہے کہ اب اردو جرائد بھی نئے دور کا ساتھ دے رہے ہیں اور آپ اس کے ہراول دستے میں شامل ہیں۔طور صاحب ایک صاحب اسلوب اور مشہور شاعر ہیں میں انکے ادبی کارناموں پر کسی قسم کی رائے کے اظہار کا اہل نہیں۔اس شمارے میں آپنے مجھے انکی شاعری کے ہمہ پہلوؤں سے آگاہی بخشی۔آپکا تحریر کردہ ''براہ راست'' حسب سابق معنی خیز سوالات پر مشتمل تھا۔یہ صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔

یوں تو سب ہی افسانے قابل ذکر ہیں مگر سب سے پہلے آغا گل کے ''چیدغ'' کا تذکرہ ضروری ہے۔میں انکی تخلیقات دیگر جرائد میں بھی پڑھتا ہوں۔یہ افسانہ قاری کے لئے ایک لمحہ فکریہ فراہم کرتا ہے۔ثمینہ فرخ کا ''چھوٹی چچی'' سے عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم کی یاد جاگ اٹھتی ہے۔بند دروازوں کے پیچھے نیم تاریک کمروں میں کھیلے جانے والے کھیل اور دنیا کی نظروں میں پاک دامن اور جنتی کہلانے کے ڈرامے کو انہوں نے نہایت چابک دستی سے قلم بند کیا ہے۔تشنہ بریلوی کا ''لاش کے آنسو'' بھی اچھا لگا۔

میں ہندوستان کی فلمی صنعت کے متعلق دیپک کنول کے مضامین بہت شوق سے پڑھ رہا ہوں۔موجودہ شمارے میں کیدار شرما کے بارے میں انکا مضمون بہت اچھا تھا کیدار شرما ہندوستان کے عظیم ہدایت کاروں میں شامل تھے۔انکا اور راج کپور کا کافی ساتھ رہا۔پنجاب نے متحدہ ہندوستان کی فلمی صنعت کو ان گنت فنکاروں سے مالا مال کیا جن میں عبدالرشید کاردار، بی آر چوپڑہ، نور جہاں، دیوآنند، شمشاد بیگم، محمد رفیع، کے ایل سہگل اور نوشاد کے استاد ماسٹر غلام حیدر شامل ہیں۔

دلیپ کمار جیسی عظیم شخصیت پر جو جیتے جی ہی زندہ جاوید ہوچکی ہے آپکا تمثیلچہ ''اے محبت زندہ باد'' بہت دل کو بھایا۔آپ نے مختلف اداکاروں کی کردارنگاری بڑے متاثر کن انداز میں کی ہے۔

نندکشور وکرم نے مجاز اور نریش کمار شاد کی مے نوشی پر جو تذکرہ لکھا ہے اس میں ذاتی تجربے اور احساس کی خوشبو ہے۔اس تذکرے میں ساغر صدیقی کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جسکی مے نوشی، مدہوشی اور بدحالی اب ضرب المثال بن چکی ہے۔اسی مضمون پر یہاں جگر کا ایک شعر بے محل نہ ہوگا مگر انہوں نے بنت عنب کو خود پر اسقدر حاوی نہیں ہونے دیا کہ وہ برباد ہوجاتے۔

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

ابھی حصہ نظم وشاعری کو تفصیل سے پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا اس لئے اس پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔

میں یوگندر پال تشنہ صاحب سے بہت متاثر ہوں وہ پچھلے دنوں کیلی فورنیا میں تھے مگر جب تک مجھے معلوم ہوا وہ واپس ہندوستان جاچکے تھے ورنہ انکے سلام کو ضرور حاضر ہوتا۔وہ ایک نہایت وسیع القلب، کثیرالمشرب اور فراخ ذہن انسان ہیں۔ایسے لوگ کم کم ہوتے ہیں۔انہیں اس خاکسار کی خود نوشت اچھی لگ رہی ہے میں اسکے لئے انکا ممنون ہوں۔میری سرگزشت کی اولیں قسط کے بعد شگفتہ نازلی، مہندر پرتاب چند، یوگندر پال اور دیگر قلمکاروں نے اسکو سراہا تھا۔امید کرتا ہوں کہ انکی دلچسپی اب بھی برقرار ہوگی۔

نوید سروش صاحب کا دل سے شکرگذار ہوں کہ وہ متواتر مجھے اس سلسلے میں میرے پرانے شہر سے باخبر رکھے ہوئے ہیں اور ہر شمارے میں میری تحریر کی تعریف اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

فیروز عالم (کیلفورنیا)

عزیز گرامی قدر گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

قرطاسِ اعزاز۔کرشن کمار طورؔ کے نام! حق بہ حقدار رسید کے مترادف ہے! مجھے بھی ان سے غائبانہ شرف نیاز مندی حاصل ہے ''غرفۂ غیب'' بھیج کر انہوں نے مجھے اپنا بنایا۔کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے! کرشن کمار طورؔ کے بارے میں سب سے اہم رائے گوپی چند نارنگ کی ہے کہ ''ویسے بھی آپ پہاڑ کی بلندی ہی پر نہیں رہتے غزل میں بھی ایک بلندی پر ملتے ہیں، شاعری میں شہرت کا کوئی آسان راستہ نہیں، یہ سفر بھی بہت دشوار وادیوں اور گھاٹیوں سے گزرتا ہے، خدائے بخشندہ کی بخشش اپنی جگہ پر، اس راہ میں کڑی ریاضت اور عبادت کے بغیر ممکن نہیں، آپ نے بھی اپنی منزل اپنے خون جگر سے پائی ہے''

''براہِ راست'' میں جو سوالات کرشن کمار طور کے سامنے رکھے گئے وہ جتنے اہم ہیں ان کے جوابات بھی ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے قاری کی معلومات میں ہمہ پہلو اضافے کا سبب بنے ہیں اور وہ آپ کی طرف سے اٹھائے ہوئے ہر سوال کی گہرائی میں اتر کر دانائی پر مبنی جواب ڈھونڈ کر لاتے ہیں مثلاً آپ کا چبھتا ہوا سوال یہ تھا کہ ''یہ تاثر کہاں تک درست ہے کہ آپ کے ہاں خیال کی شدت شعر کو سست رو بنا دیتی ہے'' اس کا جواب معنی خیز ہے کہ یہ الزام

اگر آپ اسے ایک نوع کا الزام کہیں حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ اگر خیال کی شدت ہی نہیں ہوگی تو شعر میں وقار کہاں سے آئے گا، اس میں جدت کہاں سے پیدا ہوگی، خیال کی شدت شعر کی نمایاں خوبی ہے، سطحی اور سامنے کے اشعار میں یہ شدت کہاں وارد ہوتی ہے۔

کرشن کمار طور کی غزل میں بظاہر سادگی پائی جاتی ہے لیکن ان کے شعر میں سادگی کے پسِ پردہ جہانِ معانی جلوہ آرا ہے، انہوں نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا ''چشمۂ چشم'' میں انہوں نے اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ رجوع کرنے والوں کو بخشش عطا کرتا ہے، اگر یہ کہا جائے ان کا دماغ بھگتی تحریک کے زیر اثر اور دل مسلم اقدار کی طرف مائل ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ''قرطاسِ اعزاز'' میں پروفیسر قیصر نجفی نے ''چشمۂ چشم'' پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور یہ رائے پیش کی کہ یہ عشق نبی ہی ہے جس نے کرشن کمار طورؔ کو ثنا خوانِ محبوبِ کبریا کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، عشق غیر اختیار و غیر مشروط ہوتا ہے اور ہر قبیل کی تحریر و پابندی سے مبرا ہوتا ہے، اسی بات کو کنور مہندر سنگھ بیدی نے اپنے شہرہ آفاق شعر میں کس حُسن سے بیان کیا ہے ملاحظہ کیجیے۔

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

کرشن کمار طور نے بیدی جی کے لہجے میں عشق نبیؐ کا اظہار کیا ہے

کچھ مسلمانوں پر نہیں موقوف
میم حا میم دال سب کے لیے

بہر حال آپ کی کشادہ نظری اور سرگرم عمل رہنے کے نتیجے میں ہم نے اپنے عہد کے نامور مگر قناعت پسند اور گوشہ نشیں شاعر سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

حسن عسکری کاظمی (لاہور)

گلزار بھائی، محبتیں۔

چہارسُو ایک بار پھر ہاتھ میں ہے۔ سرِ ورق پر کچھ کہنا مشکل ہے کہ ابھی صرف الیکٹرانک کاپی ملی ہے، جس میں رنگ دھوکہ دے جاتے ہیں۔ رسالہ ہمیشہ کی طرح متنوع اور خوبصورت تحریروں سے مزین ہے۔ ایک اہم کمی جو ضرور محسوس ہوئی وہ اچھے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کی ہے۔ رسالے کی حالیہ اور سابقہ کاپیاں انٹرنیٹ پر مہیا کر کے آپ نے ایک بہت اہم قدم اٹھایا ہے۔ یہ ایک اہم ضرورت تھی اس سے لوگوں کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور یہ زبان کی ترویج و ترقی کی طرف ایک اہم قدم ہے۔

کرشن کمار طور صاحب سے اس تفصیلی تعارف کا شکریہ۔ ایک بلند قامت اور اہم شاعر کی سوچ اور ادراک سے آگاہی ہوئی۔ یہ ایک بہت اچھا سلسلہ ہے جو صرف آپ کے ہاں ہی اس باقاعدگی اور خوبصورتی سے جاری ہے۔ طور صاحب نے غزل میں ابہام کی بابت کس قدر سچ کہا ہے کہ 'یہ ابہام ہی تو ہے جو سامع کو بھی تخلیق میں شریک کر لیتی ہے'، سامع یا قاری آگہی کا دام شنیدن بچھا کر نئے نئے امکانات پاتا ہے۔ ان کی یہ بات البتہ بحث طلب ہے کہ 'فارسی کا استعمال شعر کو حسن سے دوچار کر دیتا ہے'۔

'چیدرخ'، آغا گل کا ایک خوبصورت، موضوعاتی افسانہ ہے، انتہا پسندی کا جو عفریت ہمارے ملک کو نگل رہا ہے اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر اور بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ یسین احمد کا افسانہ 'سایوں والا دالان' ایک خوبصورت ابتدا کے بعد ٹپو برقرار نہ رکھ سکا۔ افسانے کا اختتام نسبتاً مایوس کن تھا۔ ثمینہ روحی کا افسانہ 'چھوٹی چچی' ہماری معاشرتی گھٹن اور اس میں بلوغت پانے والے رشتوں اور الجھاؤوں کی کہانی ہے۔ ثمینہ کی کردار نگاری خوبصورت ہے کہ افسانے کے دونوں اہم کرداروں کی ایک چلتی پھرتی شکل ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ یہ ہو بہو وہی شکل ہے جو ثمینہ کے کرداروں سے میل کھاتی ہے۔ طاہر نقوی ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے لمبی لمبی کہانیوں کو بہت مختصر افسانوں میں ڈھالنے کا فن سیکھ لیا ہے۔ ایڈگر ایلن پو اچھی کہانی اسی کو بتاتے ہیں جس میں ایک حرف بھی اضافی نہ ہو۔ ان کا افسانہ 'وہ' اس معیار کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ان کو ایک اور خوبصورت تحریر پر مبارکباد۔

میری غزل کی اشاعت میں کتابت کی ایک غلطی کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا۔ غزل کا آخری شعر کچھ یوں چھپا ہے:

پھول شاخوں سے نوچ نوچ کے ہم
دام کرتے رہے دن بھر

صحیح دوسرا مصرعہ یوں ہے کہ:

دام کرتے رہے کھرے دن بھر

پچھلے ماہ میرا افسانہ 'بے لگام' شائع ہوا تھا۔ اس پر عبداللہ جاوید، شہناز خانم عابدی، قیصر نجفی اور نوید سروش کے حوصلہ افزا تبصرے کا بہت شکریہ۔ نجیب عمر صاحب سے التجا ہے کہ افسانے کو دوبارہ پڑھیں یہ ایک گھوڑے کے انتقام کی کہانی نہیں ہے، کہانی کیا ہے اس کو قیصر نجفی نے اپنے خط میں چند سطروں میں خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

سید سعید نقوی (نیویارک)

محترمی گلزار جاوید صاحب، آداب و تسلیمات۔

زیرِ نظر اشاعت میں قرطاسِ اعزاز محترم کرشن کمار طورؔ صاحب کے لیے وقف ہے۔ چند دیگر رسائل میں بھی ادیبوں اور شاعروں کے ''گوشے'' شائع ہوتے ہیں۔ یہ ادیب اور شاعر اگر ''گوشہ گمنامی'' ہی میں رہیں تو بہتر ہوگا۔ مگر ''چہارسو'' کے صاحبانِ اعزاز سب کے سب مانے ہوئے اور جانے ہوئے قلم کار ہیں، باہنر اور معتبر 50 صفحات طورؔ صاحب کے لیے ہیں اور 70 عام شمارے کے طور پر۔ لہٰذا تنوع قائم رہا۔ کرشن کمار طور صاحب قادر الکلام شاعر ہیں، جہت ساز ادائیں رکھتے ہیں، مجذوبِ غزل ہیں، کیوں نہ ہو جب مدھوبن میں رادھیکا ناچے گی تو گردھر (کرشن مہاراج) کی مورلیا تو باجے گی اور غزل کا

فوّارہ پھوٹے گا۔لاہور سے نکلا ہوا ہر باشندہ لاہور کو اپنے سینے میں لئے پھرتا ہے۔طوؔر صاحب نے ہجرت میں بھی قافیہ برقرار رکھا،یعنی۔

جنابِ طوؔر نے ہم قافیہ ہجرت کو کر ڈالا
وہ ''انبالہ'' سے ''پٹیالہ'' گئے ہیں پھر ''دھرم شالا''

کئی مضامین،دل کے تاروں کو چھیڑا اور یادوں کا جگایا ہے۔

You have knocked open the flood gater of memories.

مجاؔز کے بارے میں وکرم صاحب کا مضمون خوب ہے۔نریش کمار شاؔد ایک بے چین روح تھا اور مفت کی شراب پر جیتا تھا۔جب ہم نے رامپور سے ''آنچل'' نکالا تو موصوف سے رابطہ رہا۔اُن کا ایک ''کارنامہ'' قابلِ ذکر ہے۔وہ ترقی پسند شعراء کو تغزل اور ترنّم سے دور رکھنے کے مشن میں لگے اور کم از کم سرشار صدیقی،شاہد عشقی اور مسعود اشعؔر کی حد تک کامیاب رہے۔

مجاؔز دلّی میں ہارڈنگ لائبریری میں اچھا خاصہ ملازم تھا لیکن پھر جوشؔ صاحب کے زیرِ اثر آ گیا انہوں نے اُس کے خوب مزے کرائے کشمیر کی سیریں کرائیں۔مگر وہ کام بھی کرایا جو اختر الایمان اور جاں نثار اختر نہ کر سکے۔ ''اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں'' کہتا ہوا رخصت ہو گیا وہ معصوم شاعر۔عصمت چغتائی علی گڑھ میں شیخ عبداللہ (پاپا) اور اعلیٰ بی ویمنز کالج میں مجاز کی بہن صفیہ (زوجہ جاں نثار اختر) کے ساتھ تھیں۔عصمت نے مجاز میں کچھ دل چسپی لی لیکن سیدھا سادھا کمزور اسرار الحق اُس تندرست و توانا چنگیز زادی کو کیا خوش کرتا۔لہٰذا اُردو کی اُس کی ٹیڑھی لکیر نے کچھ عرصہ بریلی کے ایک گرلز اسکول میں ہیڈ مسٹریس رہنے کے بعد شاہد لطیف کے ساتھ بمبئی کے فلمزار ہی کو اپنے لیے مناسب جانا اور بہت کامیاب رہی۔

گلزار صاحب آپ علم اور فلم کو بھی یکجا کرتے ہیں۔میں خود ایک فلمی صحافی رہ چکا ہوں (''نگار'' ویکلی کراچی اور WEEKLY SCREEN BOMBAY اور STRINGER) لہٰذا ایسے مضامین بہت شوق سے پڑھتا ہوں کیدار شرما پہ دیپک کنول کا مضمون پسند آیا۔جہاں تک آپ کے ''تخلیقی وجدان'' یعنی FICTION FEATURE کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ امریکہ میں میرا کئی بار POLYGRAPH TEST (جھوٹ پکڑ ٹسٹ) ہو چکا ہے۔اب ایک اور ٹسٹ کی ضرورت ہے کیونکہ رسالے کے مُدیر کی ستائش میں کچھ کہنے والا ہوں۔ آپ کی یہ FANTASY حقیقت کے بیحد قریب ہے اور دلیپ اعظم کو صحیح معنوں میں خراج پیش کر رہی ہے۔دیویکا رانی،ملکہ حسن و جمال،کا یہ کمال ہے کہ اُنہوں نے گھر گھریالے بالوں والے 22 سالہ نوجوان کو فلم ''جوار بھاٹا'' میں متعارف کرایا اور تاریخ رقم کی۔آپ نے بوجھل نثر کے بجائے شوخ و شنگ اندازِ تحریر اختیار کیا ہے جو نہایت مناسب ہے۔شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔

چلتے چلتے میں آپ کو ایک ''ولایتی قطعہ'' سنانا چاہوں گا:

زُلفوں میں گرفتار ہوں IN CHAIN نہیں ہوں
یہ دردِ محبت ہے میں IN PAIN نہیں ہوں
شاعر ہوں یقیناً مجھے پاگل تو نہ سمجھو
تم جیسا ہی انسان ہوں INSANE نہیں ہوں

تشنہ بریلوی (کراچی)

بھائی گلزار صاحب،السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ ہمارے بزرگ اور محترم کرشن کمار طوؔر صاحب کے شخصیت اور فن سے منسوب ہے۔یہ دیکھ کر دل کو انتہائی مسرت ہوئی۔طوؔر صاحب کو میں چچا کہتا ہوں۔اُن سے متعلق زیادہ تر مضامین ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے۔واقعی آج کل ہندوستان میں اچھی غزل کہنے والوں میں ایک نام طوؔر صاحب کا بھی ہے۔اُن کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اُردو ادب کی خدمت نہایت خاموشی سے کرتے چلے آ رہے ہیں اور یہ سلسلہ پچاس سالوں پر محیط ہے۔طوؔر صاحب کا انتخاب کلام پڑھ کر بھی لطف آ گیا۔یعنی یہ پوری اشاعت انتہائی لاجواب ہے جس کے لیے آپ اور طوؔر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

پرویز مظفر (یو۔کے)

پیارے عزیز گلزار جاوید عرف چہارسو،السلام علیکم۔

چشمِ بددور ''چہارسو'' محبتوں اور لطافتوں سے سجا سجایا پہنچا۔بوجوہ ''رسیدگی'' میں تاخیر ہو گئی۔تاوقتیکہ میں رسالے ایک ایک نوشت نہ پڑھ لوں خط نہیں لکھتا۔کرشن کمار طوؔر صاحب سے متعلق مضامین آرا اور خیالات نہایت دل آویز ہیں میں تو موصوف کا از حد دلدادہ ہوں چہارسو کے نمبر نے طوؔر صاحب کی طرف دل اور منوّر ہو گیا ہے۔میں ان کی دو کتابیں پڑھ چکا ہوں ایک حمد،نعت، سلام سے درخشاں ایک غزلوں سے مزین۔میں نے ان کی حمد،نعت اور ان کے سلام پر ایک مضمون بھی لکھا ہے جو اس نمبر تک نہ پہنچ سکا تھا۔اس ضمن میں کراچی جمال نقوی صاحب کو (طور صاحب کے رسالے سرسبز کے پاکستان میں نمائندے) خط لکھا تھا،جواب نہیں آیا۔

''سرسبز'' میں میرا کلام شائع ہوتا رہتا ہے کرشن کمار طوؔر صاحب جیسے اچھے شاعر ہیں ایسے اچھے انسان بھی ہیں۔بھولے بسروں کو بھی عزت سے اٹھاتے بٹھاتے ہیں۔چہارسو میں کرشن کمار طور کو جلوہ آرا دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ عبداللہ جاوید صاحب نے اس ناچیز کو ''زمرۂ خوباں'' میں لیا ہے۔ان کو دیکھا نہیں پڑھا بہت ہے۔انہوں نے فنون کے حوالے سے مجھے مذکور کیا ہے۔ان کی مہربانی ہے یہ میرے لیے بیش قیمت حوالہ ہے۔احمد ندیم قاسمی مرحوم نے مجھے ''فنون'' میں اہم مقام دے رکھا تھا۔اس احقر کو فنون میں بڑے پیار سے عزت مند کیا تھا۔عبداللہ جاوید صاحب نے میرا ایک شعر بھی درج کیا ہے۔

پہلے مصرع میں حرف ''نہ'' کی جگہ بدل گئی ہے۔میں ان کا شکر گزار

ہوں۔انہوں نے اپنی کتابیں مجھے بھیجی تھیں۔ میں نے انہیں شکر گزاری کا عریضہ بھیجا تھا۔عبداللہ جاوید صاحب اوران کی نصف بہتر کی ادبی عظمتوں کا میں بہت قائل ہوں''گلزار جاوید محبت زندہ باد'' خوب درخوب ہیں۔ میں دلیپ کمار کا مداح ہوں میں نے ان کی بہت فلمیں دیکھی ہیں۔ میں نے اداکاری میں ہمیشہ انہیں سب سے بہتر سمجھا۔''محبت زندہ باد'' بڑی دل نشیں روداد ہے میں نے اسے بار بار پڑھا ہے۔دلیپ کمار کی زندگی کی دعا کی ہے۔ میں نے چند برس پہلے''فنون'' کے ایک خط میں''انسان دوستی'' کے باب میں دلیپ کمار کو مذکور کیا تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ اقبال کے بعد انسان دوستی کا جوہر ان لوگوں کے فن وادب میں ملتا ہے احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، دلیپ کمار، نصرت فتح علی خاں اور لتا منگیشکر

جانے والے سے ملاقات نہ ہونے پائی
پھر تیری کہانی یاد آئی

اس ضمن میں اور بھی نام لیئے جاسکتے ہیں۔

دیپک کنول اپنے مضمون میں کسی نہ کسی بہانے دلیپ کمار کی تخفیف کر دیتے ہیں فلم''جوگن'' میں دلیپ کمار کی اداکاری عروج پر ہے۔ایک''بے بس'' عاشق کے رول میں انہوں نے کمال کی اداکاری کی ہے۔دیپک کنول نے پہلے''دل دیا درد لیا'' کے خصوص میں بھی دلیپ کمار کا ذکر''بھلے'' انداز میں نہیں کیا آپ نے دیکھا سالگرہ کے دن فلم انڈسٹری کے تمام سرکردہ لوگ دلیپ کمار پر صدقے قربان ہوئے جاتے تھے۔آغا گل کا افسانہ''چیدغ'' ایک دکھی دل کا سانحہ ہے۔ یہ وہ پکار ہے جس میں کئی زخموں، آنسوؤں اور نوحوں کا درد امڈ آیا ہے۔اس شعر کے ساتھ الوداع!!

تھا میرا ہاتھ میرے اپنے قتل میں شامل
یہ خشک پتا تھا اک دن ہرا تو کرنا تھا

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

عزیزم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا ہر سو چرچا ہے۔ میں پرچے کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کرتا مگر نوید سروش سے''چہارسو'' لیکر پڑھتا ہوں اور جب نہیں پڑھتا تو محی نوید سروش سے تقریباً تمام مشمولات کی تفصیل مل جاتی ہے۔کچھ ذاتی مصروفیات اور ناسازئ طبیعت کی سبب زیادہ مطالعہ نہیں کر پاتا۔مگر میں ڈاکٹر فیروز عالم کی ''داستان حیات'' بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا رہا ہوں۔موجودہ قسط انہوں نے لڑکپن اور جوانی کا ملا جلا وہ دور یاد دِلا دیا جب ہم آزاد فضاؤں میں پرواز کرتے رہتے تھے۔اسکول اور کھیل کُود کے میدان میں زندگی کا مرکز ومحور تھے۔ڈاکٹر فیروز عالم نے جس ان دیکھی بلا کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ بالکل درست ہے اور حقیقت ہے کہ ایک نامعلوم بلا نے پورشہر کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا تھا۔راتوں کی نیند اور دن کا چین تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔وہ بلا کیا تھی۔تھی بھی یا نہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ یہ تجسس ہی رہا۔لوگ ہاتھوں میں ڈنڈے اور ہاکیاں اُٹھائے پھر رہے تھے کہ بلا کو ختم کر کے شہریوں کو اِس خوف وعدم اعتماد سے نجات دلائیں۔گلزار صاحب آپ جس محبت سے اس رسالے کو مرتب کر رہے ہیں یہ جذبہ بہت کم ہی نظر آتا ہے آپ کی یہ خدمات اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔اللہ آپ کو تاحیات خوش وخرم رکھے۔آمین۔

ماہر اجمیری (میرپورخاص)

مدیرِ محترم، تسلیم وآداب۔

''سالِ نو'' کے آغاز میں ادبی جرائد کی شروعات''چہارسو'' سے ہونا نیک فال ہے۔ ہمیشہ کی طرح تابندہ ورخشندہ روایات سے جڑا ہوا''قرطاسِ اعزاز'' بصورت براہِ راست ، انتخابات ، معاصرانہ تاثرات، اقتباسات و مُراسلات بنام کرشن کمار طورؔ صاحب، ان کے تخلیقی وفنی سفر کی مختلف جہات کا بڑی کامیابی سے احاطہ کیے ہوئے ہے، صاحب قرطاسِ اعزاز کی قدردانی، سخن فہمی، خود شناسی، عصری پذیرائی اور معنوی اکائی سے ۔قارئین کو متعارف ومستفید کرانے کے لیے ادارۂ''چہارسو'' بہت مبارک باد کا استحقاق لئے ہوئے ہے! جناب عبداللہ جاوید اور شہناز خانم عابدی صاحبہ کے کلام''دخترِ آب'' اور''نیا گرا'' کا تحیر آمیز خوشگوار تاثر ابھی تک ذہن کے ہمرکاب ہے کسی وجہ سے فیڈ بیک اگلے شمارے میں شامل نہیں ہو پائی تھی جو مشترکہ قرطاس اعزاز ہونے کی وجہ سے روایت کے ساتھ جدّت آمیز بھی تھا۔مختلف ومتنوع حالات وواقعات سے مرتب ومزین داستانِ حیات سے متعلق ثمینہ روحی صاحبہ کے مشورے پر اُمید ہے کہ ڈاکٹر فیروز عالم صاحب مخلصانہ توجہ دیں گے۔

مجاذؔ صاحب جن زندگی کے نشیب وفراز سے دوچار رہے اُن کے ردعمل میں اُردو ادب بہت اچھے تخلیق کار سے محروم ہو گیا جس کا ازالہ ناممکن ہوا کرتا ہے۔ ورشہ بھی بہت اچھا لگا۔۔۔''اے محبت زندہ باد'' میں بالی وُڈ کے کرداروں کے فطری لب ولہجے نے نثر پارے کو بے حد فعال ومتحرک (لائیولی) سا بنا دیا اور تخلیقی وجدان نے اُس جہتِ کمال کو چھوا ہے کہ قاری لامحالہ خود کو دلیپ صاحب کی تقریبِ سالگرہ میں مدعو سمجھتا ہی نہیں، پاتا بھی ہے۔ یہ صنف کئی اصناف کے امتزاج سے ایسی اچھوتی صورت پذیر ہوئی ہے کہ کسی نام سے بھی پکار لیں اپنی جانب متوجہ کر لے گی اور یقیناً دلیپ صاحب بھی اسے پڑھ کر دیگر قارئین کے طرح محظوظ ومسرور ہوتے ہوئے آپ کو داد دیئے بنا نہ رہ پائیں گے۔۔۔!''رس رابطے'' میں قیصر نجفی صاحب نے شمارے کا بھرپور تجزیہ (تحسین وتنقید) پیش کیا اور پروفیسر یادؔ صاحب کی غزل کا جائزہ بھی ہمہ پہلو رہا۔ نقوشِ دائمی خوبصورت اشعار سے مرصّع خراجِ تحسین ہے۔ اور آخر میں طور صاحب کے ایک منفرد اُچھوتے شعر کے ساتھ اجازت۔

اُتر رہا ہوں دلوں پر میں اِک وحی کی طرح
ہے میری دُور ، بہت دُور تک صدا روشن!

شگفتہ نازلی (لاہور)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

تازہ چہارسو موصول ہوا۔ کیا عرض کروں کہ اس میں کیا نہیں ہوتا۔ ہر عنوان کے تحت تمام مضامین ذہن وروح کو تازہ کر دیتے ہیں۔ طنز وتنقید بھی اعلیٰ درجے کی ہوا کرتی ہے۔ فلم کے تعلق سے دیپک کنول نے ایسا میلہ لگا رکھا ہے کہ پڑھنے والوں کی دل کی دھڑکنیں گرما جاتی ہیں۔ اس بار آپ نے محترمہ سائرہ بانو کے شوہرِ نامدار یوسف خاں اور دلیپ کمار کی سالگرہ کی کہانی کو جس طور پیش کیا ہے خوب صد خوب ہے۔ میں نے بھی شاید دلیپ کمار کی کوئی فلم ایسی ہو جو نہ دیکھی ہو۔ اس تصوراتی منظر نامے میں آپ نے تمام اداکاروں اور اداکاراؤں سے اس قدر برجستہ اور برمحل مکالمات بُلوائے کہ اُن پر حقیقت کا گمان گزرتا ہے۔

رب نواز مائل (کوئٹہ)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

آپ کی عنایت سے ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ میرے سامنے ہے۔ پاکستان کے مختلف جرائد میں کرشن کمار طور کی نگارشات دیکھتا رہا۔ لیکن آپ نے قرطاسِ اعزاز کے ذریعہ انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے کئی ''کمار'' گنوائے لیکن اس کمار کی بات کچھ اور ہے۔ ان کی بے ساختہ غزل ''بہت کہا تھا'' نے ایک کیفیت برپا کی اور نعت کے اس شعر نے تو ہمیں گنگ کر دیا۔

کچھ مسلمانوں پر نہیں موقوف
میم حا میم دال سب کے لیے

کرشن کمار طور اپنی زندگی میں بھی ہم قافیہ وہم ردیف رہے ہیں۔ جبھی تو پہلے انبالہ پھر پٹیالہ اور پھر دھرم شالہ۔ آغا گل کا افسانہ ''چیدغ'' بلوچستان کا کرب والم سمیٹے ہوئے ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ''سایوں بھرا دالان'' یسٰین احمد کا مکافاتِ عمل کو بیان کرتا ایک خوبصورت افسانہ۔ ''سعی لاحاصل'' میں خورشید احمد نے ثابت کیا کہ محبت بکاؤ نہیں ہوتی۔ طاہر نقوی ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں ان کا افسانہ ''وہ'' سیاست کی نیرنگی کا المیہ جہاں کچھ بھی پینٹ کیا جا سکتا ہے۔ کئی زبانوں کے ماہر جانب تشنہ بریلوی جو ایک سینئر اور منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ ''صحنِ نازک کے استحصال کا نوحہ'' خوب پیش کیا ہے۔ پیرزادہ قاسم کا ایک مصرعہ ''جو سوچتا ہی نہیں، خواب دیکھتا ہی نہیں'' خورشید حیات کے افسانے ''خبر ہونے تک'' میں ایسے ہی اپاہجوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ نند کشور وکرم نے مجاز کو یاد کر کے ہمیں رُلا ہی دیا۔ یہ اُم الخبائث کیسے کیسے آفتاب نگل چکی ہے۔

اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اس شمارے میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی تحریر ''اے محبت زندہ باد'' جہاں آپ نے برصغیر کے نامور اداکار ''دلیپ کمار'' کو کیا خواب خراجِ عقیدت پیش کیا ہے کہ طبیعت واہ واہ کر گئی۔ ان کے چاہنے والے دنیا میں کروڑوں ہیں۔ جو ان سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ ایک عظیم اداکار، نفیس انسان۔ شخصیت وکردار میں بے مثل۔ لیکن جو چیز مجھے ان کی عظمت کا قائل کرتی ہے وہ اردو سے ان کی محبت ہے۔ بے لوث محبت ایسے ہی لوگوں کی بدولت اردو آج تک ممبئی کی فلم نگر پر راج کر رہی ہے۔

نجیب عمر (کراچی)

محترم گلزار جاوید صاحب، بہت سلام۔

چہارسو کا کرشن کمار طور نمبر ملا' کچھ پڑھ لیا' کچھ پڑھ رہا ہوں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے طور صاحب سے ملاقات کرادی۔ ان کا کلام پڑھنے کا موقع بھی دیا اور خیالات جاننے کا بھی۔ طور صاحب کی شاعری میں اگرچہ روایتی لفظیات بھی خوب نظر آتی ہیں مگر ساتھ ہی کچھ مختلف انداز سے کہنے اور محاوروں کو مختلف طرح برتنے کی کوشش بھی واضح نظر آتی ہے۔ افسانوں میں کہانیاں تو بہت سی تھیں مگر جتنے پڑھ سکا ان میں یٰسین احمد کا افسانہ پڑھ کر مزہ آیا جس میں اختتام سے ذرا پہلے انجام سمجھ میں آ گیا تھا۔ مہندر پرتاب چاند اور عزیز نبیل کے بعض شعر پڑھ کر مزہ آیا۔ ایک اور مزے کی بات چہارسو میں یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے کچھ دوستوں سے غائبانہ ملاقات ہو جاتی ہے جیسے ہمارے ندیم ہاشمی صاحب جن سے بہت عرصے سے ملاقات نہیں ہو سکی بلکہ کراچی گیا تھا تو بھی مل نہیں سکا تھا' لہٰذا آپ کا ایک اور شکریہ۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

جناب گلزار جاوید صاحب، آداب۔

اس بار ''قرطاسِ اعزاز'' میں صاحبِ اعزاز جناب کرشن کمار طور صاحب کا نام پڑھ کر روحانی مسرت حاصل ہوئی، اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں جب ہم نے اپنی دو غزلیں اُن کے رسالے ''سرسبز'' کے لیے روانہ کی تو کچھ عرصے بعد اُن کا ایک شفقت بھرا خط موصول ہوا جس میں نہ صرف ہماری حوصلہ افزائی کی گئی تھی بلکہ ہماری غزلوں پر بڑی محبت سے ہمیں اصلاح بھی دی، اُن کا وہ خط آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ پھر تو اُن کے ساتھ ایک ایسا رشتہ قائم ہوا کہ آج تک اُن کی شفقت اور محبت میں اضافہ ہی ہوا افسوس ہے تو بس اس بات کا کہ آج تک اُن سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں ہو پائی، ہم نے کئی بار انڈیا جانے کی اور اُنہیں کئی بار کراچی کے عالمی مشاعروں میں بلوانے کی کوششیں بھی کیں مگر۔۔۔ اور جب سے اُن کی بینائی کا مسئلہ ہوا ہے اکثر ہم دونوں ہی فون پر بات کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے ہیں وہ کہتے ہیں ''بیٹا جب تک آنکھوں کا ساتھ ہے ایک بار مل جاؤ تا کہ تمھیں دیکھ لوں'' اور میں ۔۔۔ میں تو ان سرحدوں کی زد میں آنے والی اِک بے بس عوام۔۔۔

بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں جا پہنچی مگر کبھی کبھی انسان اپنے دلی جذبات واحساسات چھپا نہیں پاتا بہرحال اُن کے بارے میں جو لکھوں اور جتنا لکھوں کم ہی ہے خوشی کی بات یہ ہے کہ پاکستان سے اُن کے لیے ایک

خوبصورت کام کیا گیا جس کا سہرا 'چہارسُو' کے سر جاتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے اس نمبر کو بہت محنت، محبت اور خوبصورتی سے سنوارا ہے چاہے وہ انتخاب اُن کے کلام کا ہو یا اُن پر لکھے گئے مضامین کا۔شمس الرحمان فاروقی صاحب کا مضمون ''زمیں و آسماں کیا کیا'' کرشن صاحب کی اُن شعری پرتوں کو کھلتا ہے جواب تک ہماری نظروں سے پوشیدہ تھیں جب کہ ''وہ کیسے رشتے تھے'' اسلم حنیف صاحب، کرشن صاحب کی فکر اور اُن کی عروضی دسترس پر بات کرتے ملے، ''سینہ ہوا روشن'' عشرت رومانی صاحب نے کرشن صاحب کی شاعری میں جمالیاتی اور نفسیاتی پہلوؤں پر گفتگو کی، ''دل کے چمکتے آئینے'' ظہیر غازی پوری صاحب نے تو اپنے مضمون کے آخری جملے میں جیسے دریا کو کوزے میں بند کر دیا وہ کہتے ہیں ''ناصر کاظمی اور جانؔی کے بعد لب ولہجہ کے اعتبار سے بجا طور پر بہت سارے شعراء نے اپنی انفرادی شناخت قائم کی تھی مگر موضوعات کی فراوانی اور معنیاتی تجربوں کے لحاظ سے کرشن کمار طورؔ نے غزل کو جو ندرت اور توانائی عطا کی ہے وہ نسبتاً زیادہ اہم اور بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے۔میرے خیال میں وہ عہدِ حاضر کے ایک ممتاز و معتبر غزل نگار ہیں۔'' ان کے علاوہ ڈاکٹر رونق شہری، حامدی کاشمیری اور پروفیسر قیصر نجفی کے مضامین بھی کرشن صاحب کی شاعری پر تفصیلی گفتگو کرتے نظر آئے۔

جناب آغا گل صاحب ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں اور اُن کا افسانہ ''چیدغ'' اس بات کا ثبوت ہے جہاں وہ بلوچستان کی موجودہ صورتِ حال پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالتا ہوا ہماری آنکھوں کو نم کرتا چلا گیا۔اُن کے علاوہ یسین احمد اور ثمینہ روحی کے افسانوں نے متاثر کیا۔غزلوں کا انتخاب اچھا لگا نظموں میں عبدالرحمٰن عبد صاحب کی ''دنیا دیکھی ہے'' اور جہانگیر اشرف صاحب کی ''ہم ہی دہشتگرد ہیں'' بے حد پسند آئیں۔

رومانہ رومی (کراچی)

برادرِ محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ جنوری فروری ۲۰۱۲ء موصول ہوا۔اس کرم فرمائی کا بے حد شکر گزار ہوں۔آپنے گذشتہ شمارہ وقار بن الٰہی کے اعزاز میں شائع فرما کر بہت بڑا کام کیا۔وقار بن الٰہی بہت بڑا افسانہ نگار اور عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔اُن کی آپ بیتی ''ماں میں تھک گیا ہوں'' ایک بے نظیر سوانح حیات ہے۔اس مرتبہ آپ نے کرشن کمار طور پر قرطاسِ اعزاز شائع کر کے اُن کی شخصیت اور فن کے متعدد گوشے ہمارے سامنے لائے ہیں۔کرشن کمار طور بہت عظیم شاعر ہیں اُن کے کلام میں تخلیقی حسن اور ابدی سچائیاں ہوتی ہیں۔

مہندر پرتاپ چاند نے میرا ذکر بڑی محبت سے اپنے خط میں کیا ہے۔یہ مٹی کی خوشبو بہت اہم چیز ہے۔انبالے کا نام سنتے ہی دل میں ایک لہر سی اُٹھتی ہے جو بیان سے باہر ہے۔آپ کی وساطت سے میں انہیں اپنا مختصر سا تعارف کرا دوں تو کیا حرج ہے۔میں انبالہ شہر میں ۳۰ جون ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوا۔میرا باپ انبالے کا نامی گرامی پہلوان تھا۔وہ رستم انبالہ تھے۔علی جان پہلوان کے نام سے شہرت پائی۔تقسیم ہند کے بعد میں نے ۱۹۴۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا پہلا امتحان پاس کیا۔پھر روزی کمانے میں جُٹ گیا۔ایف۔اے، بی۔اے، ایم۔اے (اردو) اور ایم۔اے (انگلش) کے امتحانات پاس کئے۔بھکر ضلع میانوالی میں ایک انٹر میڈیٹ کالج میں انگریزی کا لیکچرار تعینات ہوا۔پھر وہاں سے گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں آ گیا اور یہاں سے ۳۰ جون ۱۹۹۰ء کو ریٹائر ہوا۔انگریزی ادب پڑھتے پڑھاتے انگلش مضامین سے رغبت ہوگئی۔جے روم کے جے روم (Jerome K Jerome) کا ایک مضمون بعنوان Weather (موسم) سے بے حد متاثر ہوا۔تو پہلا مضمون ''برساتی'' کے عنوان سے لکھا جو ہفت روزہ لیل ونہار (ترقی پسند رسالہ) میں شائع ہوا۔ڈاکٹر وزیر آغا سے تعلق خاطر کے بعد انشائیہ نگاری کو صنفِ اظہار کے طور پر اپنایا۔اب تک میرے مندرجہ ذیل ورکس (Works) اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔۱۔شاخِ زیتون (انشائیے) ۲۔رات کے مہمان (انشائیے) ۳۔وقت اے وقت ۴۔انشائیہ اور انفرادی سوچ (تنقید) ۵۔انشائی تنقید (تنقید کا تخلیقی تصور) ۶۔راہ نوردِ شوق (ملک مقبول احمد کی آپ بیتی پر مبنی سوانح حیات۔ایک نیا تجربہ) ۷۔منشا یاد کے منتخب افسانے (انگریزی میں ترجمہ کئے ہوئے کا مؤلف) ۸۔ڈاکٹر وزیر آغا کی منتخب نظمیں (انگریزی میں ترجمہ کئے ہوئے کا مؤلف) ۹۔افسانے کے سات رنگ (تنقید) ۱۰۔نکاتِ جمیل (تنقیدی مضامین)۔

دعا ہے کہ مہندر پرتاپ چاند سدا چاند کی طرح روشن رہیں۔میں آج کل صحت مند نہیں ہوں بس گذشتہ پانچ چھ سال سے بیماریوں کی زد میں آیا ہوا ہوں۔ادب میں زیادہ فعال نہیں ہوں۔اللہ تعالیٰ گلزار بھائی کو عمر خضر عطا کرے اور ان کے رزق میں برکت ہو کہ وہ اس کساد بازاری میں پرچہ نکال رہے ہیں۔اللہ انہیں اپنی سلامتی اور پناہ میں رکھے۔اہلِ انبالہ کی مٹی کو پیار و دعا۔

جمیل آذر (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

اپنی علمی و ادبی آب و تاب کے ساتھ ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ ملا پہلے خطوط پڑھے۔ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کی داستانِ حیات ''ہوا کے دوش پر'' بہت لطف دے رہی ہے۔میر پور خاص سے کراچی تک (جو احباب کراچی جا بسے ہیں اور جن سے میں واقف ہوں) دھوم ہے۔موجودہ قسط میں بھی انہوں نے اساتذہ و ماہرفن کو یاد کیا ہے۔فش پونڈ کی پکنک اور سو روپے کے وظیفے (انعام) سے کیمرا خریدنے کا واقعہ حسین یادیں ہیں ایسی مہکتی مسکراتی یادیں اس فانی زندگی میں تو فراموش نہیں کی جا سکتی۔ویسے تو چہارسو کا ہر شمارہ خصوصی ہوتا ہے مگر اس شمارے نے رنگ ہی کچھ اور جمایا ہے۔قرطاسِ اعزاز کرشن کمار طور صاحب کا خصوصی گوشہ بہت اہم اور بھرپور ہے اُن پر لکھے گئے تقریباً تمام مضامین سے طور صاحب کے فن کی باریکیاں اور مختلف جہتیں کھل کر سامنے آئی۔گوشے میں کئی

غزلیں مطالعے میں آئی جنھوں نے تاثر ہی کچھ اور دیا۔ ڈاکٹر سعید نقوی، محمد انعام الحق، ڈاکٹر رینو بہل، اقبال بھٹی اور عطیہ سکندر علی نے انتخاب بھی کمال کا کیا ہے انتخاب اتنا متنوع ہے کہ آپ کو داد نہ دیں تو پھر کیا کریں۔

میں کیسے بند قبا کھولوں اس کے وحشت میں
کہ دل کی آگ یہاں کم وہاں زیادہ ہے

یہ شعر پتا نہیں کس کیفیت میں کہا ہے۔ بہرحال یک جا کلام پڑھنے سے اُن کی شاعری کے مختلف پہلو منکشف ہوئے۔ مضامین میں شمس الرحمان فاروقی صاحب کے مضمون ''زمین و آسماں'' میں ''کمار'' ادبی قبیلے کا خوب تعارف کرتے ہوئے کرشن کمار طور پر بہترین مضمون لکھا ہے۔ عشرت رومانی صاحب نے ''سینہ ہوا روشن'' میں طور صاحب کے فن سے اُن کے فلسفۂ زندگی کو کشید کیا ہے۔ ظہیر غازی پوری صاحب نے طور صاحب کی غزل کو اپنے اندر سمو کر بہت دیر سوچنے کے بعد ایک گہرے مشاہدے کے ساتھ فکری مضمون لکھا ہے۔ ہر سطر قابلِ توجہ ہے۔ دیگر مضامین بھی لاجواب ہیں۔ میرے خیال میں طور صاحب پر اس سے اچھا گوشہ تیار کرنا ذرا نہیں اب بہت مشکل کام ہے۔ براہِ راست میں مدیر صاحب کے سوالات اور طور صاحب کے جوابات نے ایک دلچسپ بحث کی صورت اختیار کی ہے بلکہ مدیر صاحب نے سوالات اور پھر اُن ترتیب میں ایسا سلیقہ برتا ہے کہ ایک موازنے کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ طور صاحب کی اس بات سے متفق ہونے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ ''غزل میں نئے مضامین کی تلاش رہنی چاہیے''۔

خورشید حیات کے علامتی افسانے 'خبر ہونے تک' میں ہر ایسے سماج کی کہانی ہے جہاں انسانیت کا قتل اور حقوق کی پائمالی ہو رہی ہے۔ ''سیاہ گلاب'' ایک پُر اثر تحریر ہے نجیب عمر نے اچھے اور معنی خیز ٹچ دیے ہیں۔ ثمینہ روحی کا افسانہ ''چھوٹی چچی'' سوانحی نوعیت کی کہانی ہے جس میں واقعات کو سلیقے سے پیش کیا ہے۔ شاہد جمیل کا افسانہ بھی متاثر کرتا ہے۔ امین راحت چغتائی صاحب کی غزل جوان بھی ہے اور خوب صورت بھی۔ جس میں جدید لب و لہجے میں روایت کی خوشبو بسی ہے۔ مشکور حسین یاد صاحب کی انفرادیت سے کون انکار کر سکتا ہے مشکل بحر اور قافیوں، ردیف میں کمال کرتے ہیں۔ آصف ثاقب کی غزل دھیمے لہجے میں عصری تقاضوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ ولی عالم شاہین، سید سعید نقوی، رب نواز مائل، صابر عظیم آبادی، عزیز نبیل، ندیم ہاشمی، زاہدہ عابد حنا کی غزلیں اپنے ہونے کا اشارہ ہیں۔ نظموں کا انتخاب آپ کے ذوق اور مطالعے کا آئینہ دار ہے۔ محمود شام صاحب نظم کیا لکھتے ہیں منظر کشی کرتے ہیں موضوع کو جس انوکھے پن سے نظم کے قالب میں ڈھالتے ہیں وہ اُنھی کا حصّہ ہے۔ ''کنسلٹنگ کلینک آغا خاں یونیورسٹی'' نظم بار بار پڑھے جانے کے قابل ہے۔ عبدالرحمٰن عبد، یوگیندر بہل تشنہ، شگفتہ نازلی کی نظمیں فکر کے نئے زاویے کی طرف موجزن ہیں پروین شیر کے گوشے (چہارسو میں ترتیب دیا گیا) کے بعد اُن کی تحریر بڑی توجہ سے پڑھتا ہوں۔ نظم ''اک اور پت جھڑ!'' (۲۰۱۱ء کے نام) میں گزرتے وقت کو گرفت میں لینے اور پس منظر میں اچھے دنوں کی آس کی لو روشن ہے۔

''اے محبت زندہ باد'' گلزار جاوید صاحب آپ نے جو رپورتاژ نما تحریر قارئین کے ذوق کی نذر کی ہے اُس نے ہمیں ایک الگ اور پُر کشش دنیا میں پہنچا دیا آنکھوں دیکھا حال ایسے مزے لے لے کر بیان کیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو بھی اُس محفل کے کسی کونے میں محسوس کر رہے تھے۔ ابھی اپنے من پسند حسین چہروں کے ہم منتظر تھے کہ آپ نے پردہ گرا دیا۔ بہت خوب۔ خیال آفاقی کی حمد میں مناجات کی کیفیت کے شعروں نے حمد و مناجات سے عقیدت و اطاعت اور شفیق احمد فاروقی صاحب کی نعت نے محبت ہی محبت کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ محترمہ شبنم شکیل کا سلام بحضور امامِ عالی مقام روایتی سلام سے ہٹ کر ہے۔ سلام کے شعروں میں جذبے کی شدت بھی ہے اور عشق کی صداقت بھی۔ اطاعت بھی ہے اور قربانی بھی۔

نوید سروش (میر پور خاص، سندھ)

بقیہ: حالی کا خاندان

وقت آپ مرکزی سرکار کے منصوبہ بندی کمیشن کی ایک اہم اور فعال رُکن ہیں۔

اُردو اور انگریزی میں کئی کتابیں تصنیف کر چکی ہیں جن میں ''رباعیات سرمدؔ''، ''امام الہند ابو الکلام آزاد'' اور مولانا حالیؔ کی مسدّس ''مدّ و جزر اسلام'' کا انگریزی میں منظوم ترجمہ (Eland Tiden Islam) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ نے ایک انگریزی کتاب ''A Dream turns Seventy Five'' بھی مشہور انگریزی مصنف اور صحافی سردار خوشونت سنگھ کے ساتھ مل کر لکھی تھی۔ آپ دلّی اُردو اکادمی ''ہریانہ اردو اکادمی'' اور ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کی بھی رُکن رہ چکی ہیں۔ ملک کی کئی اور اہم اور مقتدر جماعتوں کی رکنیت آج بھی آپ کو حاصل ہے۔ اپنے مرحوم خاوند ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ حمید کی نسبت سے اپنے سابقہ نام کے ساتھ حمیدؔ بھی لکھتی ہیں۔

مولانا حالیؔ اور ان کے خاندان کے ان معروف عالموں، ادیبوں اور دانش وروں نے دنیائے علم و ادب میں اور قوم اور معاشرہ کی اصلاح و بہبود کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے یقیناً انہیں ہندوستان کی تاریخ میں اور دنیائے ادب میں نسل در نسل یاد کیا جائے گا۔ مولانا نے خود ہی فرمایا تھا:

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

..... حصارِ نظر .....

نجیب عمر کے افسانے پڑھیے اور دیکھئے کہ ان کا اپنا اسلوب، لفظوں کے انتخاب میں کہاں کہاں انہیں کیسے کیسے گل کھلانے پر مجبور کر رہا ہے۔ صرف دو سال کی مدت میں ایک پودے سے تناور درخت بن جانے تک ان کی اپنی محنت اور مطالعے کو تو دخل ہے ہی لیکن اپنے آس پاس بکھرے ہوئے موضوعات میں سے کسی خصوصی موضوع کو چھانٹ لینے میں ان کا اپنا مشاہدہ کارفرما ہے۔ پھر یہ جو چیز اپنی یادداشت سے کھینچ لاتے ہیں۔ وہ ان کی خوش ذوقی کی علامت بن کر افسانے میں ابھر آتی ہے۔

..... غالب عرفان

دوسو چالیس صفحات اور تینتالیس افسانوں پر مشتمل یہ کتاب دوسو چالیس روپے کے عوض الحمد پبلی کیشنز، کراچی پر دستیاب ہے۔

..... کل ہمارا ہے.....

وجاہت علی عباسی کا اسلوب تحریر روز بہ روز نکھر رہا ہے۔ اس میں روانی کے ساتھ ساتھ تجزیے اور شگفتگی کا رُخ بھی نمایاں ہو رہا ہے۔ وجاہت کی اپنی صلاحیتوں اور کاوشوں کی داد یقیناً ان کا اپنا طرّہ امتیاز ہے لیکن اس ماحول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس میں وجاہت عباسی نے پرورش پائی۔ ان کے والد مشہور سفر نامہ نگار قمر علی عباسی ہیں جن کا نام اب گنیز بک میں آ جانا چاہیے۔ وجاہت کی والدہ انتہائی محترم آرٹسٹ اور ایک علمی و ادبی گھرانے کی چشم و چراغ نیلوفر عباسی ہیں۔ اس پیرائیہ بیان میں میرا مقصود ہرگز یہ نہیں کہ اس بنا پر وجاہت علی عباسی کو ''رعایتی نمبر'' دیے جائیں۔ وہ اپنی صلاحیتوں سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ انہیں کسی ''پرچی'' اور ''بیساکھی'' کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اُن کے کالم دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ وجاہت علی عباسی اپنی تحریروں کی روشنی سے ہمارے معاشرے کے قلب و ذہن کو منوّر کرتے رہیں۔

..... پروفیسر سحر انصاری

دوسو چالیس صفحات کی یہ کتاب مبلغ دوصد پچاس روپے کے عوض ویلکم بک پورٹ، کراچی پر بآسانی دستیاب ہے۔

..... حرف وصدا .....

نصرت زیدی زندگی میں بھی وسیع المشرب ہیں اور شاعری میں بھی کشادہ دلی کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ عہدِ حاضر کے اُن لائقِ تعظیم شعراء میں ہیں کہ جو عصری حسّیت کے ساتھ کلاسیکی اسالیبِ سخن پر بھی کامل دسترس رکھتے ہیں اور اس معتبر روایت کو ثروت مند بنا کر اپنے تخلیقی جوہر کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اچھی اور بڑی شاعری کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ وہ پڑھنے والے کو شعوری یا غیر شعوری طور پر تبدیل ضروری کرتی ہے نصرت زیدی کی شاعری کا مطالعہ کریں گے تو آپ بھی اس بات سے اتفاق کریں گے۔

..... افتخار عارف

حرف وصدا ایک سو چوراسی صفحات مجلد، دوسو ستر روپے کے عوض الحمد پبلی کیشنز، لاہور سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

Other Books by Sifwat Ali
Tiambic
Islam is the Future
PCI volume 1
President Obama
PCI volume 2
Fikr-e-Farda
(Urdu)
Masnavi-e-Waqt
(Urdu)
Masnavi-e-Rasul
(Urdu)
Sawad-e-Noor
(Urdu)
Masnavi-e-Waqt
(Hindi)
Masnavi-e-Rasul
(Hindi)
PRESIDENT OBAMA
SIFWAT ALI